خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ڈائجسٹ
خواتین ڈائجسٹ
ستمبر 2012
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 800 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ------ 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ------ 6000 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیرہ

کہی سُنی

خواتین ڈائجسٹ کا ستمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

موسم نے ایک بار پھر کروٹ لی ہے۔ فطرت بڑی فیاضی سے دل کشی اور رعنائی کے خزانے لٹا رہی ہے۔ لیکن کوئی بھی رُت ہو، اس شہر نا پرساں کے حالات اور موسم نہیں بدلتے۔ رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ ہو یا شب قدر کی مقدس ساعتیں یا عید الفطر کا تہوار، اس شہر کی فضائیں گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونجتی رہیں۔ رزق کی تلاش میں سرگرداں بے گناہ معصوم لوگ نشانہ بنتے رہے۔

بے پناہ وسعت کا حامل یہ شہر جس نے ہر آنے والے کو اپنے دامن میں سمیٹا۔ ہر زبان، ہر قومیت کے لوگوں کو خوش آمدید کہا۔ آج لہولہان ہے۔ یہاں روشنیاں ہیں۔ چہل پہل ہے لوگوں کا ہجوم ہے لیکن یہاں کے باسی ہر لمحہ کسی انہونی کے خوف سے سہمے رہتے ہیں۔ ان کے ذہنوں پر نامعلوم خوف کے سائے ہیں۔ ان کے دل وحشتوں کے اسیر ہیں۔

المیہ یہ ہے کہ احساس زیاں بھی جاتا رہا۔ آزاد میڈیا پر چرب زبانی کا غلبہ ہے۔ گھنٹوں سنتے رہیے، معنی و مفہوم ندارد۔ جن سے رہبری کی توقع تھی وہ نامعلوم مصلحتوں کے اسیر ہیں۔ اور چارہ گروں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال میں یہی کہہ سکتے ہیں۔

آئیے دعا کریں، یہ وقت دعا ہے۔

انعامی سلسلہ،

آپ کا باورچی خانہ قارئین کا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اس سلسلے کو مزید دلچسپ اور خوبصورت بنایا جائے۔ آپ اس سلسلے میں سوالات کے جوابات دیں۔ اور قارئین کو اپنی آزمودہ کھانوں کی تراکیب بتائیں۔ بہترین جوابات پر کتابوں کا تحفہ دیا جائے گا۔

اس شمارے میں،

- نگہت سیما کا مکمل ناول ۔ زمین کے آنسو،
- صائمہ اکرم چودھری کا مکمل ناول ۔ سونے دیا کنگنا،
- شاہین ملک، سائرہ چوہدری اور حمیرا علی کے ناولٹ،
- صباحت یاسمین، اُمِ مریم، سعدیہ غزل، راحت وفا، شازیہ جمال نیر اور ایلیا یقین کے افسانے،
- نگہت عبداللہ اور عنیزہ سید کے ناول،
- ٹی وی فنکارہ حبا علی سے ملاقات،
- ماڈل اور اداکارہ مادیہ زاہد سے باتیں،
- کرن کرن روشنی ۔
- ہمارے نام ۔ آپ کے خطوط اور ان کے جوابات،
- میری خاموشی کو بیاں ملے ۔ قارئین سے سروے،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے،
- اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ اسے ہم آپ کی آراء اور مشوروں کی روشنی میں ترتیب دیتے ہیں۔ اسے خوب سے خوب تر بنانے میں آپ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

قرض ادا کرنے کی نیت

حضرت عمران بن حذیفہ رحمتہ اللہ ام المومنین حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ وہ قرض لیا کرتی تھیں۔ ان کے گھر کے کسی فرد نے اس کو نامناسب سمجھتے ہوئے عرض کیا: آپ ایسا نہ کیا کریں۔

انہوں نے فرمایا: کیوں نہ لوں؟ میں نے اپنے نبی اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمان سنا ہے "جو مسلمان قرض لیتا ہے اور اللہ کو اس کے بارے میں یہ علم ہوتا ہے کہ وہ اسے ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا قرض دنیا ہی میں اتار دیتا ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ ضرورت کے وقت قرض لینا جائز ہے، تاہم اجتناب بہتر ہے۔

2۔ قرض لیتے وقت یہ نیت ہونی چاہیے کہ اسے جلد از جلد ادا کیا جائے گا۔

3۔ ایسی نیت رکھنے والوں کی اللہ تعالیٰ مدد فرماتا ہے اور وہ آسانی کے ساتھ قرض ادا کر دیتے ہیں بشرطیکہ وہ ادائی کے لیے مخلصانہ کوشش کریں اور اس میں کوتاہی نہ کریں۔

4۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں حسن نیت کی بہت اہمیت ہے۔

5۔ اگر کوئی شخص قرض ادا کرنے سے پہلے فوت ہو گیا تو وارثوں کا فرض ہے کہ قرض ادا کریں۔ اگر ادائی نہ کی گئی تو قیامت والے دن نیکیوں کی صورت میں ادائی کرنی پڑے گی۔

حضرت عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ قرض لینے والے کے ساتھ ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ قرض ادا کر دے، جبکہ (قرض) اس کام کے لیے نہ ہو جو اللہ کو ناپسند ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ ادائیگی کی نیت رکھتے ہوئے قرض لینا جائز ہے۔
2۔ نیت نیک ہو تو اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل ہوتی ہے۔
3۔ قرض اچھے کام کے لیے لینا چاہیے۔ شادی اور غمی کی فضول غیر اسلامی رسموں یا بسنت اور سالگرہ جیسی کافرانہ تقریبات میں بغیر قرض لیے خرچ کرنا بھی گناہ ہے۔ ان کے لیے قرض لینا تو مزید گناہ ہو گا' ایسی رسموں سے مکمل پرہیز کرنا چاہیے۔
4۔ سود پر قرض لینا کسی حال میں جائز نہیں۔

جو شخص قرض لے اور اس کی نیت قرض واپس کرنے کی نہ ہو!

حضرت صہیب الخیر (صہیب رومی) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جو شخص قرض لیتا ہے اور اس کا پختہ ارادہ ہوتا ہے کہ اسے واپس نہیں کرے گا' وہ اللہ کو چور بن کر ملے گا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ جو شخص قرض لیتا ہے اور ادائی میں ٹال مٹول کرتا ہے اور اس کا مقصد ہوتا ہے کہ واپس نہ کرے گا' ایسا شخص قانونی طور پر چور قرار نہیں دیا جا سکتا' اس لیے اسے قیامت میں سزا ملے گی۔
2۔ اللہ تعالیٰ دلوں کے حالات جانتا ہے' اس لیے مسلمان کو چاہیے کہ کسی کو دھوکا نہ دے۔ انسان کو دھوکا دینا ممکن ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔

بدنیتی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جو شخص لوگوں کا مال اسے ضائع کرنے کے ارادے سے لیتا ہے' اللہ اسے تباہ کر دے گا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ ضائع کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ اسے واپس نہیں کرنا چاہتا' مالک کے لحاظ سے یہ مال تباہ ہو گیا کیونکہ اسے واپس نہیں ملے گا۔
2۔ حرام طریقے سے حاصل کیے ہوئے مال میں برکت نہیں ہوتی۔
3۔ ایسے جرم کی سزا دنیا میں بھی مل سکتی ہے کہ اس شخص پر ایسے حالات آ جائیں کہ وہ مفلس ہو جائے اور آخرت میں بھی سزا مل سکتی ہے کہ اس کے اعمال ضائع ہو جائیں یا قرض خواہ کو دے دیے جائیں اور وہ خود جہنم میں چلا جائے۔ یہ بہت بڑی تباہی ہے۔

قرض ادا نہ کرنے پر وعید

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس شخص کی جان اس حال میں اس کے جسم سے نکلی کہ وہ تین چیزوں سے پاک تھا' وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔
تکبر سے۔
مال غنیمت کی خیانت سے۔
اور قرض سے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ حدیث میں مذکور تینوں گناہ بہت بڑے گناہ ہیں۔
2۔ کبیرہ گناہوں کا مرتکب' اگر اللہ نے پہلے پہل معاف نہ کیے' جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا حتیٰ کہ جہنم میں اپنے گناہوں کی سزا بھگت لے۔ یہ سزا سیکڑوں سال طویل بھی ہو سکتی ہے جب کہ جہنم کی ایک سیکنڈ کی سزا بھی ناقابل برداشت ہے۔
3۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبر کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے۔ "تکبر' حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔"
4۔ مال غنیمت مسلمانوں کا مشترکہ حق ہوتا ہے۔ جب تقسیم کر کے ہر مجاہد کو اس کا حصہ دے دیا جائے تو وہ ان کی جائز ملکیت بن جاتا ہے۔ تقسیم سے پہلے

معمولی سی چیز لینا بھی حرام ہے' اسی طرح قوم کی اجتماعی ملکیت میں ناجائز تصرف کرنا یا اسے نقصان پہنچانا بھی کبیرہ گناہ ہے۔ جیسے قومی خزانے کے مال کو اپنی ضروریات پر خرچ کر لینا۔ مسجد' مدرسہ یا کسی دینی یا دنیاوی تنظیم کا فنڈ ان ہی مصارف پر خرچ ہونا چاہیے جن کے لیے وہ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی عہدے دار ان کے علاوہ کسی اور مصرف میں خرچ کرتا ہے تو یہ خیانت ہے۔
5۔ قرض جان بوجھ کر ادا نہ کرنا بھی انتہائی بڑا گناہ ہے لہٰذا اس سے بھی اجتناب کرنا فرض ہے۔
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"مومن کی روح اس کے قرض کی وجہ سے لٹکی رہتی ہے حتیٰ کہ اس کی طرف سے (قرض) ادا کر دیا جائے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ لٹکنے کا مطلب ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس پر ادائیگی کی ذمے داری باقی رہتی ہے اور وہ ادا کرنے کے قابل نہیں رہتا' اس لیے اسے پریشانی رہتی ہے یا یہ مطلب ہے کہ اسے جنت میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ملتی۔
2۔ مالی حقوق میں نیابت درست ہے' یعنی اگر کسی کی طرف سے ادائیگی کر دی جائے تو قرض وغیرہ ادا ہو جاتا ہے' اور وہ اللہ کے ہاں بھی اس ذمے داری سے سبک دوش ہو جاتا ہے۔
3۔ فوت ہونے والے کا ترکہ تقسیم کرنے سے پہلے اس کا قرض ادا کرنا چاہیے۔ اگر ترکہ کم ہو تو وارث اپنے پاس سے قرض ادا کریں۔
حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جو شخص اس حال میں فوت ہوا کہ اس کے ذمے ایک دینار یا ایک درہم تھا' وہ اس کی نیکیوں سے ادا کیا جائے گا' وہاں (آخرت میں) دینار ہوں گے نہ درہم۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اگر وارث قرض ادا نہ کریں تو میت پر اس کی ذمے داری باقی رہتی ہے جس کی وجہ سے اسے قیامت کے دن مشکل پیش آئے گی۔
2۔ حقوق العباد کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔
3۔ نیکیوں سے ادائیگی کی صورت یہ ہے کہ جس قدر قرض ہو گا' اس کے مطابق مقروض کی نیکیاں قرض خواہ کو دے دی جائیں گی۔ اگر مقروض کے پاس نیکیاں نہ ہوئیں یا اس کے قرض سے کم ہوئیں تو قرض خواہ کے اسی قدر گناہ مقروض کے سر ڈال دیے جائیں گے۔
4۔ نیکیاں کر لینے کے بعد ان کو ضائع ہونے سے بچانا چاہیے اور ایسے اعمال سے پرہیز کرنا چاہیے جن سے نیکیاں ضائع ہو جاتی ہیں' مثلاً "ظلم" حسد' کسی کے ساتھ نیکی کر کے اسے احسان جتلانا' وغیرہ۔

جو شخص قرض یا چھوٹے بچے چھوڑ جائے تو (ادائیگی یا نگہداشت) اللہ اور اس کے رسول کے ذمے ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں جب کوئی مومن مقروض ہو کر فوت ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں پوچھتے اور فرماتے۔
"کیا اس نے اپنے قرض کی ادائیگی کا سامان چھوڑا ہے؟"
اگر لوگ کہتے: ہاں تو آپ اس کا جنازہ پڑھاتے اور اگر لوگ کہتے: نہیں تو آپ فرماتے۔
"اپنے ساتھی کا جنازہ پڑھ لو۔"
جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فتوحات (اور غنیمتیں) عطا فرمائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"میں مومنوں سے ان کی جانوں سے بھی زیادہ تعلق رکھتا ہوں' اس لیے جو کوئی مقروض فوت ہو گا تو

اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمے ہے اور جو کوئی مال چھوڑ کر فوت ہو جائے گا تو وہ مال اس کے وارثوں کا ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقروض شخص کا جنازہ نہ پڑھنا تنبیہہ کے لیے تھا۔

2۔ اسلامی حکومت کو ایسے مقروض افراد کی مالی امداد کرنی چاہیے جو قرض ادا کرنے کے قابل نہیں۔

3۔ اگر کوئی شخص مقروض فوت ہو جائے' جب کہ اس کے وارث نادار ہوں اور ادائیگی کی طاقت نہ رکھتے ہوں تو اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ قرض خواہوں کو بیت المال سے ادائیگی کرے۔

4۔ ناداروں' یتیموں اور کام نہ کرسکنے والے افراد کی کفالت اسلامی حکومت کی ذمے داری ہے۔

تنگ دست مقروض کو مہلت دینا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے کسی تنگ دست پر آسانی کی تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اسے آسانی عطا فرمائے گا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اسلام میں معاشرے کے افراد میں باہمی تعلقات مضبوط کرنے کی بہت اہمیت ہے۔

2۔ تنگ دست مقروض پر آسانی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے سختی کے ساتھ مطالبہ نہ کیا جائے' اسے مزید مہلت دی جائے یا قرض معاف کر دیا جائے۔

3۔ نیکیوں کا بدلہ آخرت میں تو ملتا ہی ہے' اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اچھا بدلہ عطا فرماتا ہے۔ اسی طرح گناہوں کی وجہ سے جس طرح آخرت میں سزا ملتی ہے' دنیا میں بھی اس کے برے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

4۔ اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنے سے دنیا میں امن قائم ہوتا ہے، جس کے فوائد نیکی کرنے والے کو بھی پہنچتے ہیں۔

حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص کسی تنگ دست کو مہلت دیتا ہے' اسے ہر روز صدقے کا ثواب ملتا ہے اور جس نے واجب الادا ہونے کے بعد مزید مہلت دی' اسے بھی یہی ثواب ملتا ہے' (یعنی) ہر روز صدقے کا ثواب ہوتا ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ مہلت دینے کا مطلب یہ ہے کہ قرض دیتے وقت مناسب مدت کا تعین کیا۔ جس میں مقروض آسانی سے قرض ادا کر سکے۔

2۔ مقررہ مدت ختم ہونے کے بعد سختی سے مطالبہ کرنے کی بجائے مزید مہلت دے دینا مزید ثواب کا باعث ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابوالیسر (کعب بن عمرو سلمی رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے سائے میں جگہ دے تو اسے چاہیے کہ تنگ دست کو مہلت دے یا اس کا قرض معاف کر دے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ قیامت کے دن بعض لوگوں کو عرش کے سائے میں جگہ ملے گی۔ اللہ کے سائے سے اس کے عرش کا سایہ مراد ہے۔

2۔ عرش کے سائے میں جگہ ملنا بہت بڑے شرف کی بات ہے کیونکہ اس وقت اور کسی چیز کا سایہ نہیں ہوگا' جب کہ سورج کی دھوپ انتہائی تیز ہوگی جس کی وجہ سے لوگ اپنے اپنے گناہوں کے مطابق پسینے میں غرق ہوں گے۔

3۔ ایک حدیث میں بعض دوسرے اعمال بھی بیان ہوئے ہیں جن کا ثواب عرش کا سایہ ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

"سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دے گا جس دن اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا۔

انصاف کرنے والا حکمران۔

وہ جوان جو رب کی عبادت میں بڑا ہوا۔

وہ شخص جس کا دل مسجدوں میں اٹکا رہتا ہے۔

وہ دو مرد جو صرف اللہ کے لیے محبت رکھتے ہیں۔ اسی حالت میں باہم ملتے اور اسی حالت میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔

وہ مرد جس سے کسی خوب صورت اور صاحب منصب عورت نے (گناہ کا) مطالبہ کیا تو اس نے کہہ دیا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔

وہ مرد جس نے چھپا کر صدقہ دیا حتیٰ کہ اس کے بائیں ہاتھ کو معلوم نہ ہوا کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا۔

اور وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔"

4۔ قرض معاف کر دینا بہت ثواب کا کام ہے' اگر یہ ممکن نہ ہو تو مہلت دینا تو آسان ہے۔

نیک عمل

حضرت حذیفہ (بن یمان رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک آدمی فوت ہو گیا۔ اسے کہا گیا تو نے کون سا (نیک) عمل کیا ہے؟"

اسے یاد آ گیا' یا یاد دلایا گیا تو اس نے کہا۔

میں سکے اور نقدی میں چشم پوشی کرتا تھا اور تنگ دست کو (قرض کی ادائیگی میں) مہلت دے دیا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ لین دین میں نرمی کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

2۔ وفات کے بعد تین مشہور سوالوں (تیرا رب کون ہے؟ تیرا نبی کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟) کے علاوہ بھی بعض معاملات کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔

3۔ سکے میں چشم پوشی کا مطلب یہ ہے کہ سکے کی معمولی خرابی کو نظر انداز کر دیتا تھا جب کہ عام لوگ اس کی وجہ سے سکہ قبول کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ جس طرح آج کل گھسا ہوا سکہ یا پھٹا ہوا نوٹ قبول کرنے سے انکار کر دیا جاتا ہے۔

4۔ اللہ کے ہاں حسن اخلاق کی بہت قدر و قیمت ہے۔

5۔ مقروض کو قرض کی ادائیگی میں مزید مہلت دے دینا بہت بڑی نیکی ہے۔

بعض اوقات ایک نیکی انسان کی نظر میں معمولی ہوتی ہے لیکن وہ بخشش کا ذریعہ بن جاتی ہے' اس لیے چھوٹی چھوٹی نیکیوں کی طرف بھی پوری توجہ دینی چاہیے۔

قرض اچھے طریقے سے ادا کرنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم میں سے زیادہ بہتر لوگ وہ ہیں جو اچھے طریقے سے ادا کرتے ہیں۔"

بیاں ایک سائنس داں کا

انشاجی

ابھی میں نے لیکچر ختم کیا ہی تھا کہ وہ لپک کر میرے پاس پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں پینسل اور کھلی ہوئی نوٹ بک تھی۔ اس نے کہا۔

"معاف فرمائیے۔ آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آج آپ نے جو تقریر کی ہے۔ اس میں اہم نکتے کیا کیا تھے؟ دراصل میں ابھی ابھی پہنچا ہوں، جب آپ تقریر ختم کر کے میزبانوں کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔"

"کیا بات ہے؟ آپ کو آنے میں کیسے دیر ہو گئی؟"

"جی۔ وہ ادھر ہاکی کا میچ ہو رہا ہے نا! میں ذرا وہ دیکھنے چلا گیا تھا۔"

"آپ کھیلوں کی رپورٹنگ بھی کرتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں اس قسم کی رپورٹنگ نہیں کرتا۔ ادبی، سیاسی، ثقافتی اور اس قسم کی دوسری سنجیدہ تقریبات کی رپورٹنگ میرے ذمے ہے۔ کانٹے کا کھیل تھا آج ہاکی کا۔ ایک طرف اس میں یتیم خانہ حمایت السلام کی ٹیم تھی اور اپنے اللہ دتا نے کھیل کا آغاز کیا تھا دوسری طرف ۔۔۔ لیکن آپ کی تقریر کا موضوع کیا تھا؟"

"میری تقریر "جدید سائنس کی فتوحات" کے موضوع پر تھی۔"

"سائنس۔ خوب بڑی اچھی چیز ہے سائنس۔"

اس نے فوراً پینسل سے کاپی میں کچھ نوٹ کیا، پھر سر اٹھا کر بولا۔ "معاف فرمائیے۔ فتوحات "ط" سے ہے یا "ت" سے ہے اور آگے چھوٹی "ۃ" ہے یا بڑی "ح" ہے حلوے والی؟" میں نے بتایا کہ ط اور چھوٹی ۃ نہیں ہے۔

"اچھا۔ اب فرمائیے کہ لیکچر کا مرکزی خیال کیا تھا؟"

"آج میں نے اس مسئلے کو لیا تھا کہ ریڈیائی لہروں کا ایٹمی تشکیلات پر کیا اثر پڑتا ہے؟"

"ٹھہریے!" اس نے کہا۔ "ریڈیائی کے کیا ہجے ہوتے ہیں۔ ریڈیائی ۔۔۔ ریڈیو۔ خیر میں سمجھ گیا۔"

اب اس نے اپنی نوٹ بک بند کرنے کی تیاری کی اور پوچھا۔

"آپ کا پہلے بھی کبھی ہمارے شہر وزیر آباد سے گزر ہوا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ پہلا اتفاق ہے۔"

"یہاں کی چھریوں، قینچیوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرا کچھ خیال نہیں۔"

"آپ سلطان ہوٹل میں ٹھہرے ہوں گے۔ کیسا پایا اسے؟"

"اچھا خاصا ہے۔ ذرا مکھیاں زیادہ ہیں۔"

"مکھیاں۔ تو پھر گویا گڑ کی منڈی کو شہر میں نہیں ہونا چاہیے؟"

"اس بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"آپ نے یہاں کا نیا مذبح گھر دیکھا ہے؟"

"نہیں دیکھا۔"

"بڑا اچھا بنا ہے۔"

"آپ کہتے ہیں تو اچھا ہی ہو گا۔"

اس نے جلد جلد اپنی ڈائری میں کچھ قلم بند کیا، پھر بولا۔

"یہاں کی میونسپلٹی کی کارگزاری کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں تو آج ہی آیا ہوں۔ کیا کہہ سکتا ہوں؟"

"کیا یہ میونسپل کمیٹیوں والے نالائق نہیں ہوتے؟ کوڑے کے ڈھیر پڑے رہتے ہیں۔"

"ہاں اکثر شہروں میں تو نالائق ہی ہوتے ہیں۔ کوڑا نہ اٹھانے کی شکایتیں عام ہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے یہاں چنگی والے لوگوں سے رشوت نہیں لیتے؟"

"مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"آپ کا خیال کیا ہے؟"

"بہت جگہ لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہاں بھی لیتے ہوں۔ آوے کا آوا ہی بگڑا ہے۔"

وہ یہ محاورہ سن کر بہت خوش ہوا اور فوراً نوٹ بک میں چڑھایا اور بولا۔

"آپ کی باتیں بہت دلچسپ ہیں۔ عام طور پر تو تقریریں کرنے والے خصوصاً سائنس پر بولنے والے بڑے بور ہوتے ہیں۔ بلکہ کوڑھ مغز۔ اچھا تو خدا حافظ۔ ہاں ایک سوال اور ہے۔ یہ جو نیا ریلوے کا پل بنا ہے۔ اس میں گول مال ہوا ہے۔ سنا ہے سیمنٹ بہت تھوڑا ڈالا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ بہتر جانتے ہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے عرض کیا۔ "بہت جگہ ایسا ہو رہا ہے۔ ٹھیکے دار اور افسر ملی بھگت کیا کرتے ہیں۔"

اس نے خوش خوش سلام کیا اور چلتا بنا۔

اگلے روز میری روانگی تھی۔ ریلوے اسٹیشن سے میں نے اخبار خریدا اور کھولا تو سامنے ہی بڑی سی سرخی نظر آئی۔

"گڑ منڈی کو شہر سے باہر منتقل کیا جائے۔"

"مشہور سائنس دان پروفیسر مولا بخش کی رائے۔

وزیر آباد۔"

"آج وزیر آباد کے ٹی ہال میں مشہور سائنس دان پروفیسر مولا بخش نے ریڈیو کے موضوع پر تقریر کی اور بتایا کہ ریڈیو کی کیسے حفاظت کرنی چاہیے اور کیسے اس کے سیل بدلتے رہنا چاہیے تاکہ فتوحات حاصل ہوں۔ پروفیسر مولا بخش نے وزیر آباد کی خوب صورتی کی تعریف کی لیکن چھری قینچیوں کے بارے میں تبصرہ کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ پروفیسر موصوف نے نئے مذبح خانے کو بھی سراہا لیکن میونسپل کمیٹی کی مذمت کی، جو کوڑا نہیں اٹھاتی۔ انہوں نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ وزیر آباد کے چنگی والے رشوت لیتے ہیں اور ریلوے پل میں سیمنٹ کم ڈالا گیا ہے۔ بلکہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ پروفیسر صاحب نے، جو سلطان ہوٹل میں ٹھہرے تھے، مطالبہ کیا ہے کہ شہر سے گڑ کی منڈی کو فوراً ہٹایا جائے۔ ورنہ۔۔۔"

اس سے آگے میں نہ پڑھ سکا۔ اخبار میرے ہاتھ سے گر گیا۔

(ابن انشا)

حبا علی سے ملاقات

شاہین رشید

حبا علی

شوبز کے خوب صورت چہرے اور عمدہ اداکاری کے حوالے سے فوری طور پر جو لوگ ہمارے ذہن میں آتے ہیں' ان میں ایک نام حبا علی کا بھی ہے۔ چار پانچ سال قبل میں ان کا انٹرویو لے چکی ہوں۔ طویل عرصے بعد ایک بار پھر اپنے قارئین کے لیے حبا کا انٹرویو کیا ہے۔ اس دوران ان کی شادی بھی ناکام ہو گئی۔ وہ کافی اپ سیٹ رہیں مگر انہوں نے ان حالات کا حوصلے سے مقابلہ کیا۔

زندگی میں تو خیر اتار چڑھاؤ تو آتے ہی رہتے ہیں۔ مگر حقیقتاً "زندگی ڈسٹرب" بہت ہو جاتی ہے۔

"ہیلو حبا! کیسی ہو؟"

"بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"تم کچھ عرصہ شوبز سے غائب رہیں۔ اس کی کیا وجہ تھی۔"

"بس یہی وجہ تھی گھر کے حالات اپ سیٹ چل رہے تھے' پھر اللہ تعالیٰ نے بیٹے جیسی نعمت عطا کر دی تو مصروفیات بہت بڑھ گئیں۔ اب بیٹا ماشاء اللہ چار سال کا ہو گیا ہے۔ تھوڑا ریلیکس فیل کرتی ہوں تو شوبز میں واپس آئی ہوں۔ ابھی بھی اس فیلڈ کو بھرپور ٹائم نہیں دے پا رہی' کیونکہ بیٹا کافی چھوٹا ہے۔"

"تم تو اپنی شادی سے بہت خوش تھیں۔ بلکہ شاید لو میرج بھی تھی؟"

"ہاں' خوش تو تھی' کیونکہ میں میچور نہیں تھی۔ سمجھتی تھی کہ سب کام ٹھیک ہو رہے ہیں۔ سب فیصلے ٹھیک ہیں مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ ایک جذباتی فیصلہ تھا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔"

"پھر آئندہ کے لیے کیا ارادے ہیں؟"

"فی الحال تو اپنے بیٹے کی اچھی تربیت اور تعلیم میں مصروف ہوں' آگے کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی کہ کیا ہوگا۔ جو قسمت میں ہوگا وہی ہوگا' ہمارے اور آپ کے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔ کب' کہاں پیدا ہوئیں؟"

"میں 22 اپریل 1988ء کو پیدا ہوئی۔ والد علی عمران شعبہ میوزک سے وابستہ ہیں جبکہ والدہ یاسمین فاروق ایر ہوسٹس رہ چکی ہیں اور آج کل سماجی کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔ اور ہم دو ہی بہن بھائی ہیں۔"

"خوب صورت خدوخال کی مالک ہو۔ شوبز میں آنے میں دشواری تو پیش نہیں آئی ہوگی' شوقیہ آئیں یا ضرورتاً" آئیں؟"

"نہ شوقیہ نہ ضرورتاً" بس امی کے کہنے پر آ گئی حالانکہ اس وقت میں فرسٹ ایر کی طالبہ تھی اور

اداکاری کے بارے میں اتنی معلومات بھی نہیں تھیں۔ امی نے کہا' اداکاری کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی کرتی رہنا۔ سو پھر میں نے ایسا ہی کیا اور تعلیم بھی ساتھ ساتھ جاری رکھی۔"

"اداکاری میں دشواری تو ہوئی ہوگی کیونکہ بقول تمہارے' تمہیں اداکاری کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا؟"

"ہاں بالکل۔ لیکن شاید صلاحیت تھی کہ میں نے جلد ہی سب کچھ سیکھ لیا کیونکہ مجھے اپنے پہلے ہی ڈرامے "زندگی ایک سفر" کا بہت اچھا رسپانس ملا تھا اور جب پہلی بار میں اچھا رسپانس مل جائے تو کافی حوصلہ افزائی ہو جاتی ہے۔ بس اس تعریف کے بعد مزید کام کرنے کو دل چاہا اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔"

"ایک اداکارہ کا خوب صورت ہونا کتنا ضروری ہے؟"

"میرے خیال میں اداکارہ کا باصلاحیت ہونا بہت ضروری ہے۔ خوب صورتی تو ایکسٹرا کوالٹی ہے۔ مگر چونکہ ٹی وی ایک ایسا میڈیا ہے جس پر سب کی نظر ہوتی ہے تو بندے کو خوش شکل بھی ہونا چاہیے۔"

"تمہاری خوب صورتی یا شہرت تمہارے لیے کبھی مسئلہ بنی؟"

"سچ بتاؤں' مسئلہ بنتی تو ہے۔ جب لوگ پہچان لیتے ہیں اور ہر طرح کے سوال کرتے ہیں تو پھر بہت غصہ بھی آتا ہے۔ اگر لوگ پرسنل نہ ہوں تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ آزادی تو تقریباً" ختم ہی ہو گئی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ نہ جانے لوگوں کو ہمارے فون نمبر کہاں سے مل جاتے ہیں' اتنی رانگ کالز آتی ہیں کہ خدا کی پناہ!"

"اللہ تعالیٰ عزت و شہرت سب کے نصیب میں نہیں لکھتا' کیا اچھا نہیں لگتا تمہیں؟"

"اچھا تو بہت لگتا ہے۔ واقعی میں خوش نصیب ہوں کہ خدا نے شہرت کے لیے میرا انتخاب کیا لیکن آخر انسان ہوں' اکتا بھی جاتی ہوں۔ ویسے اس ساری سچویشن میں میری طبیعت میں بدمزاجی نہیں آئی بلکہ میں پہلے سے زیادہ خوش مزاج ہو گئی ہوں۔"

"زندگی ایک سفر' پہلا ڈرامہ تھا۔ رجسٹرڈ کس ڈرامے سے ہوئیں کہ جس کے بعد آفرز کی لائن لگ گئی؟"

"یاسر نواز کی ڈائریکشن میں سیریل "دل دیا دہلیز" نے مجھے شہرت دی اور اس کے بعد آفرز کی لائن لگ گئی۔ مگر میں نے بہت زیادہ کام نہیں کیا۔ کیونکہ اس وقت میں ایک شادی شدہ زندگی گزار رہی تھی اور گھریلو مصروفیات کی وجہ سے شوبز کو زیادہ ٹائم نہیں دے پاتی تھی۔ ویسے بھی میں چاہتی تھی کہ کم کام کروں مگر ایسا کروں جو یادگار رہ جائے اور اب بھی ایسا ہی ہے۔ میں کردار کو اہمیت دیتی ہوں' بہت زیادہ کام کو نہیں۔"

"گڈ۔ کردار تو ہر طرح کے آفر ہوتے ہوں گے' مگر پھر بھی کوئی ایسے کردار کہ جن کی آفرز کو باوجود مصروفیات کے بھی تم انکار نہ کر سکو؟"

"دو کردار ایسے ہیں' جن کو کرنے کی بہت زیادہ

خواہش ہے۔ ان میں ایک تو پاگل لڑکی کا کردار کرنا چاہوں گی اور ایک میں چاہوں گی کہ نیگیٹو رول کروں۔ ایسا نیگیٹو رول کہ لوگوں کو نفرت ہو جائے اور پاگل لڑکی کا ایسا کہ لوگ رو پڑیں۔"

"تنقید برداشت کر لیتی ہو؟"

"کر تو لیتی ہوں مگر ذرا مشکل سے۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ میں بہت محنت سے کام کرتی ہوں اور اپنے لحاظ سے پرفیکٹ بھی کرتی ہوں۔ اب اتنی محنت کے بعد اگر کوئی کہے کہ آپ نے اچھا کام نہیں کیا تو بس......"

"تو بس' کیا...؟"

"قہقہہ۔ میں کر بھی کیا سکتی ہوں سوائے خاموشی کے۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ تنقید کو بڑے حوصلے اور خاموشی سے برداشت کر لینا چاہیے۔"

"اب تک کتنے ڈرامے اور کمرشل کر چکی ہو؟"

"سچ پوچھیں تو تعداد یاد نہیں ہے حالانکہ میں نے بہت زیادہ کام نہیں کیا۔ پہلا تو "زندگی ایک سفر" تھا۔ پھر "دل دیا دہلیز' چاند پروسا' رانی بیٹی راج کرے' کتنی گرہیں باقی ہیں' کچھ کھیل' اے دشت جنوں' کیسی ہیں یہ دوریاں" اور کچھ ٹیلی فلمز بھی کی ہیں اور جہاں تک کمرشلز کی بات ہے تو کافی کر چکی ہوں۔ گنتی یاد نہیں ہے۔"

"وقفے کے بعد دوبارہ آئیں تو کیا محسوس کیا۔ لوگوں نے مس کیا یا بھول گئے؟"

"میں جب دوبارہ آئی تو لوگوں نے یہ نہیں کہا کہ آپ کہاں غائب ہیں یا آپ اتنا عرصہ کہاں تھیں بلکہ لوگوں نے میرے پرانے ڈراموں کے حوالے سے ہی میری تعریف کی۔ میں نے محسوس کیا کہ لوگ جلدی بھول جاتے ہیں۔ اس لیے میں نے شہرت کو اپنے سر پر سوار نہیں کیا۔ نارمل رہتی ہوں۔"

"کس پروڈیوسر اور ڈائریکٹر اور فنکار کے ساتھ زیادہ کام کرنے کی خواہش ہے؟"

"میں نے اس فیلڈ میں آکر بہت کچھ سیکھا ہے اور میں اب اس بات کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھنے لگی ہوں کہ کام کے معاملے میں کسی مخصوص پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کے ساتھ کام نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی کسی ایک چینل کے لیے۔ اس طرح فنکار پر چھاپ پڑ جاتی ہے کہ اس کا ڈرامہ ہے تو پھر تو یہ فنکار ضرور ہوں گے۔ اس لیے میں نے تو یہی سوچا ہے کہ سب کے ساتھ کام کروں گی ایسا ہی کر رہی ہوں۔"

"اس فیلڈ میں کتنا آگے جانے کا ارادہ ہے؟"

"بہت آگے تک۔ اتنا کہ میں نظر نہ آؤں تو لوگ بے چین ہو جائیں۔ میں نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ ملک سے باہر بھی بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں اور مجھے امید ہے کہ میں ملک سے باہر بھی ضرور نام کماؤں گی۔"

"کیوں نہیں... شوبز کی تو کوئی حد نہیں ہوتی۔"

"جی بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ کوئی حد نہیں ہوتی اور یہاں تو سب کچھ کام پر منحصر ہے۔ آپ کو اچھا کام ملتا رہے تو آپ بہت آگے تک جا سکتے ہیں' ورنہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔"

"کہتے ہیں کہ شوبز میں جگہ بنانے کے لیے سب سے دوستی رکھنا بہت ضروری ہے۔ واقعی؟"

"ہاں ایسا ہے اور یہی کام مجھ سے ہوتا نہیں ہے۔ میں سب سے بہت جلدی اور بلا وجہ فری نہیں ہوتی۔ بہت لیے دیے رہتی ہوں۔ اس فیلڈ میں بہت کم لوگوں سے میری دوستی ہے۔"

"پھر تو لوگ مغرور بھی کہتے ہوں گے۔"

"بالکل کہتے ہیں اور اکثر لوگ تو ناراض بھی ہو جاتے ہیں مگر میری فطرت جیسی اللہ تعالیٰ نے بنا دی ہے اسے تبدیل نہیں کر سکتی اور سچ بات تو یہ ہے کہ میں کسی پر بھروسا بھی نہیں کرتی۔ آج کسی کو اپنا سمجھ کر دل کی بات بتا دیں گے تو کل اس سے تھوڑا سا بھی اختلاف ہو گا تو وہ آپ کی ساری باتیں دوسروں کو بتا دے گا۔ اس لیے محتاط ہی رہنا چاہیے۔"

"غصہ کب آتا ہے؟"

"جب مجھ سے کوئی جھوٹ بولے اور مجھے پتا چل جائے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے تب میں اپنے غصے پہ

قابو نہیں پا سکتی اور جب تک بول بول کر غصہ اتار نہ لوں چین سے نہیں بیٹھ سکتی۔"

"تو کیا آپ کبھی جھوٹ نہیں بولتیں؟"

"ایسی بات نہیں ہے مگر میں بہت زیادہ مجبوری کے تحت بولتی ہوں۔ مجھے اپنے والد کی نصیحت کبھی بھی نہیں بھولے گی کہ کوشش کرنا جھوٹ نہ بولو کیونکہ سچ کو چھپانے کے لیے ایک جھوٹ نہیں کئی جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور اس سے بات بنتی نہیں بلکہ بگڑ ہی جاتی ہے۔"

"مگر اس فیلڈ میں تو بہت جھوٹ ہے اور بھی کچھ برائی ہے؟"

"ہاں ہے۔ لیکن اگر آپ کو عادت نہیں ہے جھوٹ بولنے کی تو آپ کہیں بھی جھوٹ نہیں بولیں گی اور میں سمجھتی ہوں کہ برائی فیلڈ میں نہیں ہوتی۔ آپ میں ہوتی ہے۔ میں جب اس فیلڈ میں آئی تھی تو نہ صرف میرے چچا نے بلکہ دیگر لوگوں نے بھی منع کیا کہ اس فیلڈ میں مت آؤ۔ یہ اچھی نہیں کہلاتی۔ لیکن جب انہوں نے مجھے کام کرتے ہوئے دیکھا تو ان کی سوچ بدل گئی۔ اب کوئی بھی مجھے کچھ نہیں کہتا۔"

"فلمیں دیکھنے سینما ہاؤس کا رخ کرتی ہو یا گھر پر دیکھتی ہو؟"

"سینما ہاؤس جا کر فلمیں دیکھنا بہت بورنگ لگتا ہے۔ گھر والوں کے ساتھ بھی نہیں دیکھتی بلکہ مجھے اکیلے بیٹھ کر بہت ساری کھانے پینے کی چیزیں اپنے پاس رکھ کر فلم دیکھنے کا مزا آتا ہے۔"

"فضول خرچ ہو؟"

"بہت فضول خرچ ہوں۔ ہاتھ روک کر شاپنگ نہیں کر سکتی۔ جو پسند آتا ہے' خرید لیتی ہوں۔ خریداری کے معاملے میں زیادہ سوچ بچار نہیں کرتی۔ کپڑوں اور بیگز پہ زیادہ خرچ کرتی ہوں۔"

"امور خانہ داری میں ماہر ہو؟"

"الحمد اللہ۔ سب کچھ آتا ہے۔ کھانا بھی بہت اچھا پکا لیتی ہوں۔ وہ لڑکی ہی کیا کہ جس کو امور خانہ داری نہ آئے۔ ایک اچھی لڑکی کی پہچان ہی اچھی گھرداری ہے۔"

"مذہب کے معاملے میں جنونی ہو؟"

"مذہب سے بہت لگاؤ ہے مگر جنونی نہیں ہوں۔ دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چلتی ہوں اور آپ کو یہ سن کر یقیناً حیرت ہو گی کہ میں چھ مرتبہ عمرہ پر جا چکی ہوں۔ بس اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے نماز کا بھی پابند کر دے۔ نمازیں قضا ہو جاتی ہیں۔"

"گھومنے پھرنے کے لیے تمہارا انتخاب؟"

"گھومنے پھرنے کو تو بہت دل چاہتا ہے مگر اپنے ملک میں آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتے ہم فنکار لوگ... لوگ ایسے حیران ہو کر دیکھتے ہیں جیسے پتا نہیں ہم کس دنیا کی مخلوق ہیں۔ سی ویو اور پارک میں گھومنا بہت اچھا لگتا ہے۔ کبھی کبھی تو لوگوں کی پروا کیے بغیر چلی بھی جاتی ہوں۔"

"پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہو؟"

"پاکستان کے بارے میں بہت کچھ سوچتی ہوں۔ یہاں بہت سی برائیاں ہیں جو دور ہونی چاہئیں۔ سب سے بڑھ کر تو یہ کہ یہاں خواتین پر بہت ظلم و ستم ہوتا ہے۔ اسے ختم ہونا چاہیے۔ ٹریفک کا نظام ٹھیک ہونا چاہیے۔ بہت کچھ سوچتی ہوں۔ بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں مگر میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔"

"مسائل کس سے شیئر کرتی ہو؟"

"اپنی ماں اور بھائی سے۔ وہ بہت توجہ سے میری باتیں سنتے ہیں اور بہت اچھے مشورے بھی دیتے ہیں۔"

"اس انٹرویو کے ذریعے کچھ کہنا چاہو گی؟"

"ضرور۔ زندگی میں جو بھی کام کریں' جو بھی فیصلہ کریں اس میں اپنے والدین سے مشورہ ضرور لیں۔ کیونکہ وہ تجربہ کار ہوتے ہیں اور ان کے مشورے صحیح بھی ہوتے ہیں۔ نوجوانوں کے جذباتی فیصلے ان کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔"

☆

ماریہ زاہد سے باتیں

شاہین رشید

1 اصلی نام؟
ماریہ زاہد۔
2 پیار کا نام؟
ماریہ ہی کہتے ہیں۔
3 تاریخ پیدائش/ شہر؟
31 مئی 1989ء/ کراچی۔
4 ستارہ/قد؟
جوزا / 5فٹ ساڑھے پانچ انچ۔
5 تعلیمی قابلیت؟
گریجویٹ ہوں۔
6 بہن بھائی آپ کا نمبر؟
پانچ بہن بھائی/ پہلا نمبر ہے۔ میرے بعد ایک بہن اور پھر تین بھائی۔
7 شادی؟
ان شاء اللہ جلد کروں گی۔
8 پہلا پروگرام/وجہ شہرت؟
کاہے کو بیاہی بدیس/ یہ کیسی محبت ہے۔
9 شوبز میں آمد؟
ہماری یونیورسٹی میں ایک فیشن شو تھا اور میں فیشن ڈیزائننگ کی بھی طالبہ تھی وہاں آڈیشن ہوا تو میں نے بھی دے دیا۔ بس اس طرح آمد ہو گئی۔
10 پہلی کمائی؟
صرف ایک ہزار روپے پہلی کمائی تھی (قہقہہ)
11 سال کے کس دن کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے؟
اپنی سالگرہ کا۔
12 کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟
ہاں دکھایا۔ مگر یقین نہیں کرتی۔

13 کس شہر میں اپنا گھر بنانے کی خواہش ہے؟
کراچی میں ہی ایک اور گھر بنانے کی اور لاہور میں۔
14 کس ملک میں رہائش کی خواہش ہے؟
کون سے ملک میں؟ بھئی امریکہ میں۔ جہاں سب کی خواہش ہوتی ہے۔
15 کوئی تحفہ جسے پا کر خوشی ہوئی ہو؟
ابھی تک کسی نے میرے معیار کا تحفہ مجھے دیا نہیں ہے۔
16 انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟
بس ففٹی ففٹی۔
17 مستقبل کے لیے کوئی پلاننگ؟
ایسی کوئی خاص نہیں ـــــ بس بہت کچھ کرنے کی خواہش ہے۔
18 سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
کھڑی رہوں اور دیکھتی رہوں۔
19 مطالعہ ضروری ہے یا وقت گزاری ہے؟
ضروری ہے ـــــ فنکاروں کے لیے خاص طور پر بہت ضروری ہے۔
20 پاکستانی معاشرے کی کوئی اچھی اور بری بات؟
یہاں کے لوگ ایک دوسرے سے نفرت بہت کرتے ہیں اور تنقید بہت کرتے ہیں اور اچھی بات یہ کہ ہم آزاد ہیں۔
21 باہر کے معاشرے کی خوبی 'خامی؟
باہر ڈسپلن بہت ہے۔ وہاں کے لوگ ایک دوسرے کی ترقی میں رکاوٹ نہیں ہیں۔
22 خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل ہوتا ہے؟
خودکشی کرنے والا نہ بزدل ہوتا ہے نہ بہادر بلکہ مجبور ہوتا ہے۔

23 آپ کی شخصیت کی کمزوری اور طاقت؟
چونکہ میرا اسٹار جیمنائی ہے اس لیے دوہری شخصیت کا شکار ہو جاتی ہوں اور میرا موڈ کبھی کچھ اور کبھی کچھ ہو جاتا ہے ـــــ اور طاقت یہ ہے کہ کسی کو من مانی نہیں کرنے دیتی۔
24 اگر میک اپ ایجاد نہ ہوتا تو؟
کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں ویسے ہی بہت خوب صورت ہوں۔
25 میک اپ میں کیا چیز بری لگتی ہے؟
کوئی بھی نہیں۔
26 کس قسم کے رویے دکھ دیتے ہیں؟
بدتمیزی کرنا اور خوامخواہ دکھ دینا۔
27 بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟
میوزک سنتی ہوں۔
28 کس کی یاد تنہائی میں سکون دیتی ہے؟
گزرے ہوئے کل کو یاد کر کے اور اپنی دادی کو یاد کر کے سکون ملتا ہے۔
30 کوئی تاریخی شخصیت جن سے ملنے کی خواہش ہو؟
بے نظیر صاحبہ سے ملنے کی خواہش تھی۔
31 صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟
کہ پیسے ڈالوں بیگ میں اور شاپنگ کے لیے نکل جاؤں' موج مستی کروں۔
32 گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟
اپنے بیڈ روم میں۔
33 شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟
بہت تکلیف ہوتی ہے کیونکہ مجھے السر رہ چکا ہے۔
34 کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟
امی کے اور اپنی پھوپھو کے ہاتھ کا۔
35 ناشتا شوق سے کرتی ہیں؟
کرتی ہی نہیں ہوں۔
36 اپنے مسائل کس سے شیئر کرتی ہیں؟
اس کا انحصار ہے میرے موڈ پر اور مسائل پر ہے۔
37 کوئی گہری نیند سے بیدار کر دے تو؟

بہت برا لگتا ہے۔
38 آئینے کو کتنا وقت دیتی ہیں؟
پہلے بہت دیتی تھی' اب تو بس میک اپ کے وقت ہی اپنے آپ کو دیکھتی ہوں۔
39 کیا آپ اپنی مرضی سے زندگی گزار رہی ہیں؟
ہاں ـــــ بالکل۔
40 زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے۔
اپنی انجوائے منٹ کے لیے اور اپنے فرینڈز کے لیے۔
41 پہلی مرتبہ جب نیا قلم استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی ہیں؟
تو میں کارٹون بناتی ہوں۔
42 کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟
بہت مرتبہ اور کھانا اٹھا کر پھینک دیتی ہوں۔ (یہ تو بہت بری بات ہے رزق کی بے حرمتی ہے)
43 دل کب ٹوٹتا ہے؟
دل کب نہیں ٹوٹتا یہ پوچھیں آپ۔
44 کون سی بات آپ کو جذباتی کر دیتی ہے؟
کوئی ایسی بات جس کی مجھے امید ہی نہیں ہوتی اور ایسی

بات جو میری برداشت سے باہر ہو۔

45 موڈ کب خراب ہوتا ہے؟
بہت ساری باتیں ہیں.... نان پروفیشنل لوگوں کی باتوں سے بھی۔

46 ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟
ڈسپلن کا ہونا ضروری ہے اور ایک دوسرے سے نفرت ختم ہو جائے تو بہت بڑی تبدیلی ہوگی۔

47 کیا آپ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟
کر لیتی ہوں لیکن اگر کوئی دوسرا نہ کرے تو پھر میں بھی نہیں کرتی۔

48 پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟
یا اللہ یہاں کے حالات ٹھیک کردے تاکہ سکون سے کام کر سکیں۔

49 آپ کی زندگی دوسروں سے کتنی مختلف ہے؟
عام لوگوں جیسی ہی ہوتی ہے۔ ہم میں کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے ہوئے۔

50 کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟
اپنے موبائل فون، بیگ اور پیسوں کے بغیر۔

51 اپنا موبائل نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکی ہیں؟
جب سے فیلڈ میں آئی ہوں ایک ہی نمبر ہے۔

52 سفر کے لیے بہترین سواری؟ رکشہ، بس یا اپنی کار؟
اپنی کار۔

53 کن چیزوں پہ خرچ کرتی ہیں؟
کپڑوں پہ۔

54 ایک کردار جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟
ایسی لڑکی کا کردار جو معذور ہو۔

55 اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟
اچھی بھی ہے اور بری بھی کہ میں لوگوں پر جلدی بھروسا کر لیتی ہوں۔

56 دھوکا اپنے دیتے ہیں یا پرائے؟
آج کل تو دونوں ہی دیتے ہیں۔

57 کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟
نہیں کوئی ایسا ملک نہیں ہے۔

58 پاکستان میں کس چیز کی آزادی نہیں ہے؟
یہاں اپنے ہی کام کے لیے بہت روک ٹوک ہے۔

59 لائٹ چلی جانے پر بے ساختہ جملہ؟
کیا مصیبت ہے۔

60 لوگ آپ سے مل کر پہلا جملہ کیا بولتے ہیں؟
کیسی ہیں آپ۔

61 اگر آپ اس ملک کی صدر ہوتیں تو؟
یہ تو میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔

62 ٹی وی آن کرتے ہی پہلا چینل کون سا لگاتی ہیں؟
کوئی بھی انٹرٹینمنٹ

63 اللہ تعالیٰ کی حسین تخلیق؟
انسان کے اندر دل۔

64 دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو فریش محسوس کرتی ہیں؟
جب شام کا وقت ہوتا ہے اور گھر جانے کا وقت ہوتا ہے۔

65 کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟
نہیں بار بار ہوتی ہے مگر پہلی محبت کو کبھی بھول نہیں سکتے۔

66 فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟
منحصر ہے فقیر پہ کہ وہ کس طرح کا ہے۔

67 غصہ کب آتا ہے؟
کسی کی بھی غلط حرکت پر۔

68 ردِ عمل کیا ہوتا ہے غصے میں؟
بات چیت بند کر دیتی ہوں۔

69 نصیحت جو بری لگتی ہے؟
ہر نصیحت بری لگتی ہے۔

70 پہچان کیسی لگتی ہے؟
اچھی بلکہ بہت اچھی۔

71 زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟
کبھی کبھی اچھے پارٹنر کی اور کبھی کبھی اچھے دوست کی۔

72 زندگی کب بری لگتی ہے؟

جب آپ کچھ کرنا چاہ رہے ہوں اور کچھ کر نہ سکیں۔

73 کوئی لڑکا اگر مسلسل گھورے تو؟
منحصر ہے اس بات پر کہ لڑکا ہے کیسا۔

74 بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے لڑکے یا لڑکیاں؟
میرا خیال ہے کہ لڑکے زیادہ بھروسے کے قابل ہوتے ہیں۔

75 اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتی ہیں؟
کچھ بھی نہیں۔ اللہ کا شکر ہے، بہت اچھی ہوں۔

76 گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟
کہ بس آرام کروں۔

77 موت سے ڈر لگتا ہے؟
ہاں جی.... کس کو نہیں لگتا۔

78 جھوٹ آسانی سے بول لیتی ہیں؟
ہاں جی.... کیوں نہیں۔

79 سائنس کی بہترین ایجاد؟
موبائل فون۔

80 اگر موبائل فون ایجاد نہ ہوتا تو؟
تو بڑی مشکل ہو جاتی۔ گھر والوں کو بڑی پریشانی ہوتی کہ پتا نہیں ہم کب گھر آئیں گے۔

81 شوبز کی بڑی برائی؟
کوئی کسی کا بھی نہیں ہے، سب مطلبی قسم کے لوگ ہیں۔

82 چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟
زیادہ تر گھر پہ.... کوئی اچھی سی مووی دیکھ کر۔

83 کون سا تہوار شوق سے مناتی ہیں؟
عید کا دن۔

84 کس لمحے زندگی بدل گئی؟
جب سے اس فیلڈ میں آئی ہوں، زندگی بدل گئی ہے۔

85 اپنی شخصیت میں کیا چیز بہت پسند ہے؟
اپنا چہرہ بہت پسند ہے۔

86 پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا چیز دیکھتی ہیں؟
چہرہ اور بات کرنے کا انداز۔

87 ٹریفک کب مسئلہ بنتا ہے؟
جب کہیں جلدی پہنچنا ہو اور ٹریفک جام ہو۔

88 ٹریفک جام ہو تو وقت کیسے گزارتی ہیں؟
سب کو گالیاں دے دے کر۔

89 اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟
میں جو خریداری کرتی ہوں وہ سب میرے لیے قیمتی ہی ہوتی ہے۔

90 بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟
لپ اسٹک، جیولری بکس، لیپ ٹاپ وغیرہ وغیرہ۔

91 مذہب سے آپ کی قربت؟
بہت زیادہ.... ایک وقت آیا تھا کہ مذہب سے دور ہو گئی تھی مگر اب نہیں ہوں۔

92 اچانک چوٹ لگنے پر بے ساختہ جملہ؟
اف اللہ۔

93 بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں لیتی ہیں؟
تھکن ہو تو فوراً نیند آجاتی ہے۔ ورنہ کروٹیں بدلتی ہوں۔

94 کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل؟
ڈائننگ ٹیبل۔

95 مرد کب برے لگتے ہیں؟
جب وہ فری ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

96 پیسہ کس شکل میں جمع کرتی ہیں؟
زیور کی شکل میں۔

97 کس شخصیت کے بغیر زندگی ادھوری ہے؟
گھر والوں کے بغیر زندگی ادھوری ہے، کوئی ایک شخصیت نہیں ہے۔

98 دوسرے ملک جا کر کیا باتیں نوٹ کرتی ہیں؟
کہ دوسرے ملک کے لوگوں کی زندگی کتنی پر سکون ہے۔

99 اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟
ہر عروج کو زوال ہے۔ اس لیے کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔

عنیزہ سیّد

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے، کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے، کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کردیا۔ وہ اس سے ملنے گئی تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ، ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کررہی تھیں، جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے، کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے، کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ، ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں، جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں فلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ فلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی فلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مگر ماہ نور کو کمہار کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی رمق نظر نہ آئی تو وہ الجھن کا شکار ہو گئی۔

سارہ خان عرف پری نے جب سے ہوش سنبھالا، خود کو سرکس کی دنیا ہی میں پایا تھا۔ وہ سرکس کے استاد عارف خان کو اپنا باپ سمجھتی تھی۔ عارف خان نے پری کی تربیت کی تھی۔ انہوں نے اسے سرکس کے تمام کرتب سکھائے تھے۔ جبکہ مسز پیٹر نے اسے کتابی علم دیا تھا۔ پری چھوٹی عمر ہی سے اپنے فن میں ماہر ہو گئی۔ مگر تھوڑے بڑے ہونے پر وہ سرکس کی دنیا میں اکتاہٹ محسوس کرنے لگی۔

تصویری نمائش میں ایک نوجوان نے ماہ نور سے اس کی تصویر پر منہ مانگی قیمت پر خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا تو ماہ نور سحر زدہ سی اسے دیکھنے لگی۔ اسے اس نوجوان میں وہی چہرہ نظر آیا جو وہ ہر جگہ دیکھتی رہتی تھی۔

مولوی سراج کا تبادلہ دوسرے قصبے میں ہو گیا۔ چنانچہ وہ، آپا رابعہ اور ان کی بیٹی سعدیہ کلثوم دوسرے قصبے میں چلے گئے۔

یہ فون سعد کا تھا۔ اس نے بتایا کہ مختلف روپ میں وہی تھا۔ اس نے ماہ نور کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جو اس نے قبول کر لیا۔

فارم ہاؤس پر کام کرنے والے کھاری کو آپا رابعہ نے نماز سکھائی۔

ماہ نور، سعد کے ساتھ فلزا ظہور سے ملنے گئی۔ وہ واپس آ رہے تھے کہ سعد کو سارا کا میسج ملا۔ وہ ماہ نور کو ساتھ لیے سارا کے پاس چلا آیا۔

قسط نمبر 7

"تمہیں یوں، یہاں بیٹھے دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے، تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔" سعد نے آگے بڑھ کر سارہ سے کہا تھا۔

سارہ کی نظریں سعد کے ساتھ آنے والے اجنبی چہرے پر اٹک گئی تھیں۔

"یہ ماہ نور ہے۔" سعد نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے کہا۔

"اور ماہ نور! یہ سارہ خان ہے۔" اسے سعد کی آواز آئی۔

"سارہ ایک ونڈر فل ایکروبیٹ اور ٹیلنٹڈ آرٹسٹ رہ چکی ہے۔ اگر کبھی اسے عالمی سطح پر اپنا ہنر اور جوہر دکھانے کا موقع ملتا تو ضرور ملک کے لیے عزت و وقار کے کئی تمغے جیت کر لاتی۔" وہ کہہ رہا تھا۔ وہ یہ الفاظ سارہ کے لیے کہہ رہا تھا مگر سارہ کی تمام حسیں جیسے ایک ہی چہرے میں اٹک گئی تھیں۔ وہ کچھ دیر پہلے بارش کے قطروں سے کھیلنے اور پہاڑوں کی بلندیاں ناپنے کی خواہش یکسر فراموش کر بیٹھی تھی۔

"مجھے تم سے مل کر بہت مسرت اور فخر کا احساس ہو رہا ہے سارہ!"

اس اجنبی لڑکی نے مسکراتے ہوئے سارہ کا ہاتھ تھاما۔ سارہ کی نظریں اس کے چہرے سے نیچے اتریں اور اس کے بازو، ہاتھوں کو دیکھتی ہوئی اس کی ٹانگوں اور پھر پاؤں تک دیکھتی نیچے اترتی گئیں۔ گزشتہ ایک عرصے سے اس نے اسپتالوں، ڈاکٹروں، نرسوں، یمی آنٹی اور سعد کے علاوہ کوئی چہرہ نہیں دیکھا تھا اور جو دیکھے تھے ان پر کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔ اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد اس کمرے سے باہر کی دنیا کے لیے اس کی آنکھیں جیسے خالی ہو گئی تھیں۔ نہ تو کسی نئے چہرے کو دیکھ کر ان میں کوئی تاثر اترتا تھا، نہ ہی وہ چونکتی تھیں اور نہ ہی زیادہ دیر کسی چہرے پر ٹھہرتی تھیں اور اب تو کتنے ہی عرصے سے یمی آنٹی اور سعد سلطان کے علاوہ اس نے کوئی چہرہ دیکھا ہی نہیں تھا۔

یمی آنٹی کے چہرے کو اس نے ہوش سنبھالتے کے ساتھ ہی دیکھنا شروع کر دیا تھا اس لیے وہ اتنا مانوس چہرہ تھا کہ اسے اس کو زیادہ دیر تک دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سعد کا چہرہ بھی وہ سرسری ہی دیکھا کرتی تھی۔ اسے سعد کے چہرے کو دیکھنے سے زیادہ اس کی آواز سننے میں دلچسپی تھی۔ اس کے کہے الفاظ اس کے ذہن کی پژمردگی مٹاتے محسوس ہوتے تھے اور اس کے کانوں میں زندگی کا احساس انڈیلتے تھے۔ سعد اسے زندگی سے محبت کرنے کا سبق پڑھاتا تھا۔ حوصلے ہمت اور ولولے کی داستانیں سناتا تھا۔ وہ اس کی باتوں سے کس حد تک متفق ہوتی تھی اور کتنا اپنے دل میں ان پر عمل کرنے کی امنگ محسوس کرتی تھی، اس سے قطع نظر اسے سر جھکا کر یا ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سعد کی آواز میں کہے لفظ سننے میں مزا آتا تھا اور اس کا دل چاہتا تھا سعد اس سے باتیں کرتا رہے۔

اس نے ایک بار پھر نظریں اٹھا کر سعد کے ساتھ آنے والی لڑکی کی طرف دیکھا۔ سعد نے اسے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کبھی کچھ بتایا تھا نہ اس نے کبھی پوچھا تھا لیکن اس لڑکی کو دیکھ کر پہلی بار اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ سعد کی بھی ایک ذاتی زندگی ہو گی، اس سے متعلق لوگ اس کی زندگی میں نجانے اس کے لیے کتنے اہم ہوں گے۔

"مجھے پہلے کبھی یہ خیال کیوں نہیں آیا؟" اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے بار بار اس کے ذہن میں یہ سوچ ابھر رہی تھی۔ "کیا میرے لیے صرف سعد کی موجودگی ہی کافی ہوتی ہے؟" اس نے خود سے بھی یہ سوال کتنی ہی مرتبہ کیا تھا۔

"مجھے ابھی یہاں آتے ہوئے راستے میں تمہارے بارے میں پتا چلا۔" وہ لڑکی اس سے کہہ رہی تھی۔ "تم بہت باہمت لڑکی ہو، مجھے تم پر رشک آ رہا ہے۔"

یکبارگی سارہ کا دل چاہا، اس لڑکی کا ہاتھ جس میں اس نے سارہ کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا، بری طرح جھٹک دے اور کہے "مجھے تمہارے ان الفاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ہمت اور بہادری کیا ہوتی ہے، یہ میں نہیں جانتی۔ ایک بے کار

وجود کے ساتھ زندگی صرف اس لیے گزارے جاناکہ اس سے فرار ناممکن ہے' ایک قابل رشک بات ہے تو کیوں پھر ہر کوئی اس مشقت میں نہیں پڑجاتا۔"

لیکن اس نے اس لڑکی سے ایسی کوئی بات نہیں کی اور سعد کی طرف دیکھ کر زبردستی مسکرائی۔

"میرے میسج نے شاید تمہیں ڈسٹرب کردیا' میں معذرت خواہ ہوں۔" اس نے کہا۔

"تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو۔" وہ حیران ہو کر بولا۔ "تم جانتی ہو کہ تمہارا میسج میرے لیے کتنا اہم ہوتا ہے۔ تو میں یہاں قریب ہی تھا اگر کہیں دور بھی ہوتا تو میسج ملنے پر جلد از جلد پہنچنے کی کوشش کرتا۔"

"ہی از کریزی۔" (یہ تو پاگل ہے) سارہ نے سعد کی بات سن کر ماہ نور کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں مجھے اندازہ ہورہا ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"پکوڑے اور پاپڑ کون کھائے گا؟" اسی دم سیمی آنٹی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں بڑے سائز کی ایک ٹرے تھی۔

"ارے واہ سیمی آنٹی! آپ تو اپنے اندر خاصا بڑا انسانی دل رکھتی ہیں۔" سعد نے ہنس کر کہا۔

"تمہیں کوئی غلط فہمی تھی کیا؟" سیمی آنٹی ٹرے سارہ کے بیڈ پر رکھ کر میز پر سے چیزیں سمیٹ کر اسے خالی کرنے لگیں۔

"نہیں تو۔ میں مذاق کررہا تھا۔" سعد نے شرارت بھری نظروں سے باری باری سارہ اور ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"سارہ! تم نے کھڑکی کھول رکھی تھی دیکھو! سارا رگ اور سیٹی پر رکھی کتابیں بھیگ گئیں۔" سیمی آنٹی ٹرے میز پر رکھ کر کھڑکی کی طرف بڑھیں۔ قریب تھا کہ وہ کھڑکی کے پٹ بند کردیتیں' سعد نے آگے بڑھ کر انہیں منع کردیا۔ سیمی آنٹی وہاں سے ہٹ کر ماہ نور کے پاس جا بیٹھیں۔ سعد' سارہ کی کرسی کو پشت پر دونوں ہاتھ جما کر کھڑا سامنے دیکھ رہا تھا۔

"بولو۔ کون سے پہاڑ پر چڑھنا ہے تمہیں؟" اس نے ذرا جھک کر سارہ کے کان میں سرگوشی کی' جو کھڑکی کے پار دیکھ رہی تھی۔

"وہ جو ٹیلا سا لگ رہا ہے... یا وہ والا جس کے پاؤں میں کھڑا چھوٹا سا پہاڑ گیان میں مصروف بدھا لگ رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میری ہر خواہش وش فل تھنکنگ کا نتیجہ ہوتی ہے۔" سارہ کا لہجہ سپاٹ ہوگیا۔ "کبھی کبھار مجھ پر بچپنا اتنی شدت سے طاری ہوجاتا ہے کہ مجھے بات کرتے ہوئے یاد ہی نہیں رہتا کہ میں جو خواہش کررہی ہوں وہ پوری ہونا ناممکن ہے۔"

اس کی نظروں کے سامنے بجلی کے تاروں پر بیٹھا بھیگتا پرندہ اپنی جگہ سے اڑا اور بجلی کے پول پر جاکر بیٹھ گیا۔

"پرندوں کے پنجوں کے نیچے ایسے قدرتی پیڈز لگے ہوتے ہیں' جو انہیں برقی جھٹکے سے بچالیتے ہیں۔" اسے ایک اور سائنسی حقیقت یاد آئی۔

"میں تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں کہ دنیا میں کوئی بھی بات ناممکن صرف اس وقت تک ہوتی ہے' جب تک ہم سوچتے ہیں کہ وہ ناممکن ہے۔" سعد نے دھیمی آواز میں کہا۔

"اور پھر تم بھی میری بچکانہ حرکتیں دیکھ کر مجھے بچوں ہی کی طرح ٹریٹ کرتے ہو۔ طفل تسلیاں دیتے ہو۔ بچوں کی طرح بہلاتے ہو۔" سارہ کا لہجہ بھیگنے لگا۔ "ایک ناکارہ وجود پہاڑ پر چڑھنے کی خواہش کرے اسے ناممکن اور ممکن کے فلسفے سنائے جانے کا یہی مطلب ہے کہ تم بچوں جیسی باتیں کیے جاؤ' ہم بچوں کی طرح تمہیں بہلاتے جائیں گے۔"

"تمہیں یقین نہیں آیا نا میری بات کا۔" وہ مسکرایا۔ "چلو پھر لکھ کر رکھ لو۔ تمہیں اس پہاڑ کی چوٹی تک نہ پہنچایا تو میرا نام بدل کر کاٹھ کا الو رکھ دینا۔" وہ چیلنج کرنے کے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

سارہ نے گردن پیچھے تک لے جاکر اس کی طرف دیکھا' وہ اسے یقین دلانے کے سے انداز میں سر ہلا رہا تھا۔

"اس نے کہا تھا' ایک روز میں بیڈ سے اٹھ کر اس کھڑکی تک خود پہنچوں گی۔" اسے یاد آیا۔ "مگر وہ پہاڑ... اس کی اونچائیاں۔"

اس نے سامنے دیکھا۔ اس کے دل میں ایک امید نے کروٹ لی مگر دوسرے ہی لمحے اس امید پر عقب میں بیٹھی اجنبی لڑکی کا خیال حاوی ہوگیا جو سیمی آنٹی کے پکوڑوں اور پاپڑوں کی تعریفیں کررہی تھی اور یوں محو گفتگو تھی جیسے ہمیشہ سے یہاں آتی رہی ہو۔ اس روز پہلی بار سارہ خان کے دل میں کسی دوسرے انسان کا خیال نیزے کی طرح گڑ کر رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیسا لگا تمہیں یہاں آکر؟" واپسی پر سعد نے ماہ نور سے پوچھا۔

"میں مبہوت ہوں ابھی تک۔" ماہ نور نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے ایسا منظر زندگی میں پہلی بار حقیقت میں دیکھا ہے' فلموں میں شاید کبھی دیکھا ہو یا کتابوں میں پڑھا ہو لیکن...." اس نے سر جھٹکا۔ "یہ سچ مچ ناقابل یقین منظر تھا لیکن اس منظر نے دو بہت اہم کام کیے۔" اس نے گردن موڑ کر سعد کی طرف دیکھا۔

"وہ کیا؟" سعد نے گیئر بدلتے ہوئے کہا۔

"ایک تو ایک انسانی المیے کا حقیقی آنکھ سے براہ راست مشاہدہ' دوسرا...." اس نے ذرا توقف کیا۔

"دوسرا کیا؟" سعد نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم سے ایک نیا تعارف۔" ماہ نور نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں آج اس وقت سے یہ سوچ رہی تھی کہ میرا دل ایک بالکل اجنبی شخص کے ساتھ کہیں جانے پر کیسے آمادہ ہوا' جب میں تمہارے ساتھ باہر نکلی ہوں.... سارہ کے گھر سے واپسی کے لیے اٹھتے ہوئے مجھے میرے اس سوال کا جواب مل گیا۔"

"مجھے تم سے حسد محسوس ہورہا ہے۔" اس نے سعد کی طرف دیکھا۔

"گو ابھی تک میں ٹھیک سے اندازہ نہیں کرپائی کہ تمہاری شخصیت کے کل کتنے رخ ہیں۔ کتنے میرے سامنے آچکے ہیں اور کتنے آنے باقی ہیں' مگر جتنے میں دیکھ اور جان پائی ہوں' مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ تم قابل رشک انسان ہو۔"

اس نے آہستہ آہستہ بولتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔ اس کی بات ختم ہونے کے بعد کچھ دیر تک گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔

"میرا ایک مشورہ مانوگی؟" سعد کی آواز خاموش فضا میں ابھری۔

"ہوں۔"

"اتنی جلدی نتائج اخذ کرنے سے گریز کیا کرو۔ ایک دو یا پھر تین ملاقاتوں میں ہی ہم کسی کے بارے میں حتمی رائے دینے کے قابل نہیں ہوجاتے' ایسا کرنے سے اکثر ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کسی شخص کی شخصیت کا کوئی نیا روپ سامنے آنے پر بری طرح مایوس بھی ہوجائیں اور اپنی رائے پر شرمندہ بھی۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں' انسٹنکٹ (وجدان) کے زیر اثر سوچتی اور فیصلے کرتی ہوں اور مجھے اپنے

انسٹنکٹس پر خاصا بھروسا ہے۔" ماہ نور نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں ہوسکتا ہے۔" وہ ایک دم زور سے ہنس کر بولا۔ "شاید اس لیے کہ تمہاری نیت میں کوئی فتور نہیں ہے۔"

"نیک نیتی بھی شاید اسی وقت تک ساتھ رہتی ہے جب تک زندگی میں بالکل عام سی توقعات اور خواہشات ہوں۔ جب سوچ توقع اور خواہش کا دائرہ وسیع ہونے لگتا ہے ان کے حصول کے لیے بدنیتی دل میں ابھرنے لگتی ہے اس وقت انسٹنکٹس بھی نیگٹیو ہونے لگتے ہیں۔" ماہ نور نے سادگی سے کہا۔ "زندگی سے میری توقعات اور خواہشات ابھی محدود ہیں اس لیے میری نیت میں فتور نہیں ہے۔"

"تم تو خاصی سیانی باتیں کرلیتی ہو۔" سعد نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہارا کیا خیال تھا؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"میرے خیال کی نہ پوچھو۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "تمہارے نام کے ساتھ میرے ذہن میں بندر کا تماشا دیکھنے کی ضد کرنے والی، میلے میں سائیں سے سوال کرنے والی اور فوک فیسٹیول پر دیوانوں کی طرح بھرے مجمع میں سوال کرتی لڑکی کا خیال آتا ہے۔"

"گویا ایک insane لڑکی کا تصور۔" ماہ نور مایوس ہو کر بولی۔

"نہیں خیر ایسا بھی نہیں ہے۔" سعد نے سرہلایا۔ "تمہارے نام کے ساتھ جتنے بھی خیال میرے ذہن میں آتے ہیں مجھے سارے ہی اچھے لگتے ہیں۔ جب ہی تو میں نے تم سے کہا تھا کہ ہماری دوستی ہوسکتی ہے۔"

"ہوں!" ماہ نور ذرا مطمئن ہوئی۔

"سارہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، کیسی لگی وہ تمہیں؟"

پھر سعد نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"وہ مجھے ویسی ہی لگی جیسا ری ہیبلیٹیشن کے پیریڈ کے دوران ایک انسان ہوسکتا ہے۔ وہ زندگی سے بھی خوف زدہ ہے اور زندگی کو کھودینے سے بھی۔" ماہ نور نے سارہ سے متعلق اپنا اندازہ بتایا۔

"اب تو اس میں بہت تبدیلی آگئی ہے۔ شروع میں وہ بالکل مایوس، وحشت زدہ اور بے اعتباری کی حدوں کو چھوتی ہوئی انسان نظر آتی تھی۔ وہ زندگی سے خوف زدہ تھی، محتاجی اور لاچاری کی زندگی کا چند روزہ تجربہ اس کی رگ رگ میں جذب ہوچکا تھا۔ میں نے اس کی زندگی کے وہ تاریک ترین دن اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اور اب اس کو دیکھتا ہوں تو وہ پہلے سے بہت بہتر نظر آتی ہے۔ میرے لیکچرز اس کے دل میں زندگی کی امنگ ابھارتے ہیں مگر پھر منفی سوچیں اس امنگ پر حاوی ہوجاتی ہیں، وہ پھر مایوس اور پریشان ہوجاتی ہے۔"

"یہ نیچرل سی بات ہے تم اس پر ایسی کیفیات کا اترنا لازم ہے۔" ماہ نور نے کہا۔

"اگر تمہارے پاس وقت ہو اور تمہارا دل مانے تو کبھی اس کے پاس دوبارہ ضرور جانا۔" سعد نے کہا۔

"ضرور جاؤں گی، لیکن مجھے لگتا ہے اسے میں اچھی نہیں لگی۔"

"ہوسکتا ہے۔" سعد نے ماہ نور کی بات رد نہیں کی۔ "لیکن پھر بھی کوشش ضرور کرنا۔"

"اسے میرا اس کے گھر جانا ہی شاید اچھا نہیں لگا۔" ماہ نور نے کہا۔

"بعض لوگوں کو پہلی بار نظر آنے والے چہرے، جگہیں اور چیزیں بھلی نہیں لگتیں، لیکن کچھ عرصے بعد وہ ان کے عادی ہوجاتے ہیں اور نامانوس نہیں لگتے۔" سعد نے کہا۔

"میں سرکس دیکھنے کے شوق میں ایک ہی بار سرکس گیا تھا۔ اسی روز سارہ خان بار پر جمپ کرتے ہوئے بلندی سے نیچے گری تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا۔ سرکس کا شوقین مجمع ساکت تھا، خواتین اور بچے چیخیں مار مار کر رو رہے تھے، سرکس انتظامیہ نے پنڈال کی بتیاں بجھادیں اور سیکنڈوں میں اس ٹوٹے پھوٹے وجود کو اٹھا کر لے گئے۔ بتیاں دوبارہ روشن ہوئیں اور رنگ میں ایک مسخرہ آکر اپنے کرتب دکھانے لگا۔ سرکس کی دنیا جیسے روبوٹس کی دنیا تھی۔ بغیر جذبات و احساسات کے روبوٹس۔ ان کی نظروں کے سامنے ان کی ایک ساتھی پل کے پل میں زندہ لاش میں تبدیل ہوگئی اور ان مسخروں، کرتب بازوں، جادوگروں اور نٹوں کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی پڑی تھی۔ یہ منظر میرے اور میرے جیسے کئی لوگوں کے لیے ناقابل قبول تھا۔ میں اسی پل وہاں سے اٹھ آیا اور اس کے بعد میری کئی راتیں بنا سوئے گزر گئیں۔ میرا دل بے چین تھا اور ذہن بے سکون۔ پھر میں نے اس لڑکی کی خیریت دریافت کرنے کی ٹھانی، جو مجھ ایسے تماشائیوں کو محظوظ کرتے کرتے اس حادثے کا شکار ہوگئی۔ سرکس کا نوائے میرے شہر میں اپنی مدت پوری کرکے روانہ ہوچکا تھا۔ میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچا، جہاں اس کا اگلا پڑاؤ تھا۔ زخمی سارہ خان تک میری رسائی پندرہ دن کے بعد ممکن ہوئی۔ رشوت، تعلقات، اختیارات۔ مجھے جو بھی اس سلسلے میں استعمال کرنا پڑا، میں نے کیا اور جو میں نے دیکھا، وہ اتنی کڑوی حقیقت تھی کہ میرے لیے اسے برداشت کرنا ناممکن ہوگیا۔ ابتدائی مختصر علاج کے بعد سارہ خان۔ جس نے غالباً برسوں سرکس کے لیے آمدنی کا بڑا حصہ کمایا، ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ سرکس والوں کی چھولداریوں میں سے ایک میں پڑی یوں موت کی منتظر تھی کہ اس کے زخموں سے مواد رس رہا تھا اور جسم پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔"

"اوہ!" ماہ نور نے دکھ اور خوف کی شدت سے آنکھیں میچ لیں۔

"میں کس طرح اسے اس بے بسی کے عالم سے نکال کر لایا، یہ ایک الگ داستان ہے۔ میرے پاس پیسہ تھا اور اختیارات بھی۔ مجھے اسے وہاں سے نکالنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ یہاں اس کا علاج کئی مہینوں تک چلتا رہا۔ اس کا جسم شکست و ریخت کا شکار تھا، اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا جگہ جگہ سے پھٹی جلد کی گرافٹنگ کی گئی۔ اس کی شریانوں کو مرمت کیا گیا۔ یہ سارا عمل میرے لیے بھی ایک انوکھا تجربہ تھا، میں ایک بالکل عام سا انسان تھا مگر ان دنوں مجھے لگتا تھا یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں اس کا علاج کراؤں۔ مہینوں کے علاج کے بعد اس کے وجود کی وہ شکل بنی جو آج تم نے دیکھی۔ پھر اسے اس فلیٹ میں شفٹ کیا گیا۔ سیمی آنٹی نے اس سارے عمل میں میرا بہت ساتھ دیا۔ وہ سارہ کے ساتھ اس کے بچپن سے رہی تھیں لیکن ہوش کی دنیا میں واپس آتے ہی سارہ نے میری اور سیمی آنٹی کی موجودگی پر ردعمل اور ناگواری کا اظہار کیا۔ ہم اس کے لیے ناقابل قبول تھے۔ نجانے ایسا کیوں تھا ہمیں سامنے پاتے ہی وہ چیخنا چلانا شروع کردیتی تھی، لیکن نہ میں نے ہمت ہاری نہ سیمی آنٹی نے۔ اور دیکھ لو! آج ہم دونوں ہی اس کی زندگی میں موجود دو اہم اشخاص ہیں۔"

سعد نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"بہت صبر اور ہمت چاہیے۔" ماہ نور نے جھری جھری لیتے ہوئے کہا۔

"سارہ کا آج میری اور سیمی آنٹی کی اچیومنٹ ہے۔" سعد نے کہا۔ "اور اچیومنٹس ایسے ہی ممکن نہیں ہوجایا کرتیں ان کے لیے صبر اور ہمت درکار ہوتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" ماہ نور نے مختصر جواب دیا۔

"ہم تمہارے ماموں کے گھر پہنچ چکے ہیں۔" سعد نے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ "مجھ پر اعتماد کرنے کا بہت شکریہ ماہ نور!" اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"خود کو مجھ سے متعارف کروانے کا بہت شکریہ سعد!" ماہ نور نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

"میں اتنا بڑا بہروپیا ہوں۔" وہ ہنسا۔ "سوچ لو۔ کہیں میں کوئی کرمنل نہ نکل آؤں۔"

"اوہ! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔" ماہ نور نے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا۔ "اب میں اچھی طرح سوچنے کے

بعد ہی تم سے رابطہ کروں گی۔" ماہ نور نے دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکلنے سے پہلے جواب دیا۔

سعد زیر لب مسکرایا اور ماہ نور کو آہستہ قدموں سے چلتے گھر کے گیٹ کی طرف جاتا دیکھتا رہا۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر ماہ نور نے مڑ کر ہاتھ ہلایا اور گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے اپنے سامنے میز پر رکھے اعلا برانڈز پرنٹڈ شاپنگ بیگز پر نظر ڈالی' جس میں ڈیزائنر کپڑے اور جوتے بھرے تھے۔ شاپنگ میں عرصہ کے بعد انہوں نے اتنا وقت لگایا تھا۔ ایک ایک چیز کی کوالٹی اور ڈیزائن کا ہر زاویے سے جائزہ لینے کے بعد خریدتے وقت قیمت کی قطعی پروا نہیں کی تھی۔ ان شاپنگ بیگز پر نظر ڈالتے ہوئے وہ اس کے تصور میں کھو گئے تھے' جس کے لیے انہوں نے گزشتہ دن کا ایک قیمتی حصہ فیشن ہاؤسز کے ان لیڈنگ اسٹورز میں گزار دیا تھا۔

"کیا وہ یہ سب چیزیں کبھی پہنے گا؟" انہوں نے خود سے سوال کیا۔ "کیا اسے یہ سب پسند آئیں گی؟" دوسرا سوال ذہن میں آیا۔ پھر ان کے ذہن کے پردہ پر ایک پرانا منظر ابھرا۔ بارش کے بعد' پانی میں بھیگے جاگنگ ٹریک کا منظر۔ وہ اس وقت آٹھ یا نو سال کا تھا اور ان کے ساتھ جاگنگ پر جایا کرتا تھا۔ اس روز جاگنگ ٹریک پر بھاگتے بھاگتے وہ بارش کے پانی میں کیچڑ بنے کچے حصے پر اتر گیا تھا۔ چھپ چھپ چھپ۔۔۔ اس کے قیمتی جاگرز کیچڑ میں چھینٹے اڑانے لگے' جو اڑ کر اس کے مہنگے ترین جاگنگ سوٹ پر پڑ رہے تھے۔

"ڈونٹ بی ان سین۔ (پاگل پن کی حرکتیں مت کرو۔)"

انہوں نے بلند آواز میں کہا تھا مگر وہ کیچڑ میں چھینٹے اڑاتا' کیچڑ میں لت پت ہوتا آگے بھاگتا ہی گیا تھا اور اس جگہ جہاں جاگنگ ٹریک ختم ہوتا تھا' پہنچ کر انہوں نے دیکھا' وہ سر تا پا کیچڑ میں لت پت تھا جیسے اس میں قلابازیاں لگا کر آیا ہو۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" انہوں نے اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے اپنے کپڑوں اور جوتوں کا حشر کر دیا۔ شہر کی بہترین لانڈری بھی شاید ان کو صاف نہ کر سکے' اتنے برے داغ پڑ گئے ہیں ان پر۔" انہوں نے افسوس سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور نوٹ کیا کہ اس نے ان کی ڈانٹ کی کوئی خاص پروا نہیں کی۔

"تم ان کیچڑ بھرے کپڑوں کو برداشت کیسے کر رہے ہو؟"

"ایسے۔۔۔" اس نے گھاس پر لوٹ لگائی' جہاں کیچڑ جمع تھی۔

"تم کبھی نہیں سدھر سکتے' تمہیں کیچڑ سے اور گند سے پیار ہے غالباً" اور یہ محبت تمہیں وراثت میں ملی ہے تمہاری میٹرنل جینز کا حصہ ہے۔" وہ بے قابو ہو کر چلائے تھے۔ جواب میں وہ شرارت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر مسکراتا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہیں یوں تنگ کرنے میں اسے مزا آ رہا ہو۔

"اور ایسا تو ہمیشہ ہی محسوس ہوتا رہا۔" انہوں نے حال میں واپس آتے ہوئے سوچا۔ "تم نے ہر وہ کام کیا' جو میرے مزاج کے خلاف ہو۔۔۔ صرف اور صرف مجھے چڑانے کے لیے اور ہمیشہ کرتے رہے۔" انہوں نے تصور میں بسی ایک صورت کو مخاطب کیا اور مسکرا دیے۔

"اور اب یہ۔۔۔" انہوں نے دوبارہ ان شاپنگ بیگز پر نظر ڈالی جن پر اعلا اور مشہور برانڈز کے نام پرنٹ تھے۔ "نجانے ان کے ساتھ تم کیا سلوک کرو۔ انہیں استعمال کرو بھی یا نہیں۔۔۔ مگر سچ ہے آج تمہارے لیے یہ شاپنگ کرتے ہوئے مجھے بہت مزا آیا۔ آگے تمہاری مرضی تم ان مہنگی ترین چیزوں کو کیچڑ میں رول دو یا تن پر زیب

کر لو۔" وہ مسکرائے اور ان کے دل میں عجیب سا سکون اتر آیا۔

اسی دم ہیلسنکی کے رہائشی علاقے کیمپی میں گھر گھر اخبار تقسیم کرتی نادیہ بلال کا یہ سوچ کر دل بیٹھنے لگا تھا کہ اس روز وہ اپنی پہلی کلاس سے لیٹ ہو رہی تھی' سائیکل کے پیڈل پوری طاقت اور تیز رفتاری سے گھمانے کے باوجود وقت بھاگ رہا تھا اور ابھی چند اخبار تقسیم کرنے باقی تھے۔

خوشنما اسٹینڈ کے ساتھ پرندوں کے لیے دانہ ڈالنے کے دو ڈبے ترازو کے پاٹوں کی طرح لٹکے ہوئے تھے۔ اسٹینڈ کے عین اوپر ایک چھوٹا سا لکڑی کا گھر بنا تھا' جس کے کھلے دروازے سے کسی پرندے کے لیے وہاں لا کر رکھے گھاس پھونس اور تنکوں کے سرے باہر لٹک رہے تھے۔ فاطمہ نے ہاتھ میں پکڑے کٹورے میں سے باجرے کے دانے دونوں ڈبوں میں منتقل کیے اور ووڈ ہاؤس کا کھلا دروازہ بند کرنے کی سعی کرنے لگیں۔

"اس کی کنڈی خراب ہے جی!" لان کے ساتھ بنی روش پر جھاڑو لگاتی سوسن نے ہاتھ روک کر انہیں مطلع کیا۔ "رشید کو بتاتا تھا' وہ ٹھیک کر لیتا۔" وہ اسٹینڈ کے پاس رکھے لکڑی کے سبز بنچ پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"رشید اپنا کام کون سا پورا کرتا ہے جی' بس کھرپی ہاتھ میں لیے کیاریوں کے پاس بیٹھا او نگھتا رہتا ہے۔" سوسن جھاڑو ہاتھ میں پکڑے پکڑے ان کے قریب آ گئی۔ "اس کے تو پانی دینے کے دونوں فوارے خراب ہیں۔ ایک کا پینداٹپکتا ہے اور دوسرے کا فوارہ آگے سے اتر گیا ہے۔ اس نے وہ بھی ٹھیک نہیں کرایا' لکڑی کے کام پر تو ہاتھ کانوں کو لگائے گا۔" اس نے جھاڑو کا پچھلا حصہ مالٹے کے پیڑ کے تنے پر مار کر تنکے برابر کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں بھی دوسروں کے کام میں نقص نکالنے کے سوا کوئی کام نہیں۔" خدیجہ نے کہا۔ "یہ جو کیاریوں کے ساتھ ساتھ خشک پتے بکھرے ہیں' ان کو کس نے صاف کرنا ہے۔"

"یہ مالی کا کام ہے جی' جمعدارنی کا نہیں۔" سوسن نے بے نیازی سے کہا اور ان کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ "ساتھ والی بی بی ہے نا' اس کی نظر بڑی کڑی ہے' وہ ہر ایک سے اس کے حصے کا کام لیتی ہے۔ مالی سے مالی کا' جمعدار سے جمعدار کا' خانساماں سے خانساماں کا اور ڈرائیور سے ڈرائیور کا۔۔۔ آپ سارے کام اکیلے رشید سے لینے کی کوشش کرتی ہیں' جب ہی ایک بھی پورا نہیں ہوتا۔"

"ہمارا کام ہوتا ہی کتنا ہے۔" فاطمہ نے سوسن کی بات پر دل میں اٹھتے غصے کے طوفان کو بمشکل روکتے ہوئے کہا۔ "خانساماں کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں' ہم کھانا خود بناتے ہیں' رشید برتن دھو دیتا ہے' ڈرائیونگ بھی خدیجہ خود کرتی ہیں' کبھی کبھار وہ نہ جا سکیں تو رشید کو گاڑی ڈرائیو کرنی پڑتی ہے۔ پھر مالی گیری کون سا مشکل کام ہے۔"

"جس کا کام اسی کو ساجھے فاطمہ بی بی! مالی' مالی ہوتا ہے' اس کا ہاتھ لگے تو ہی پودوں' پیڑوں اور گھاس میں جان پڑتی ہے۔ میں' آپ تو صرف کھرپی لے کر ذرا سی صفائی ہی کر سکتے ہیں۔" سوسن نے انہیں جتایا اور بنچ پر رکھا کٹورا اٹھا کر اندر کو چل دی۔

"اف وہ سوسن۔۔۔! کتنی بار کہا ہے' کھانے پینے کے برتنوں کو جھاڑو والے ہاتھ مت لگایا کرو۔" وہ جھنجلا کر بولیں۔

"دھل ہی جاتے ہیں بی بی!" سوسن بے نیازی سے بولی۔ "آپ ہی اتنا پرہیز کرتی ہیں ورنہ سرخ ٹائلوں والی کوٹھی والوں کے تو برتن بھی میں ہی دھوتی ہوں۔" وہ لچکتی مٹکتی پھر چل دی۔

"زمانے نے کیسے کروٹ بدلی ہے۔" سوسن کو اندر جاتے دیکھتے ہوئے فاطمہ نے سوچا۔ "ہم جیسے لوگ تو اب شاید ہی کوئی رہ گئے ہوں۔۔۔ سوسن سے برتن صاف کروائے جاتے ہیں۔" انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ انہیں برسوں پرانا ایک منظر یاد آ گیا' جب وہ اور خدیجہ چھوٹی بچیاں تھیں اور ان کے والدین کا گھر محلّے کا سب سے بڑا اور اونچا گھر سمجھا جاتا تھا۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ مہترانی سارے گھر کا کام کر لینے کے بعد فارغ ہوتی تو باورچی

خانے میں کام کرنے والی خالہ زیبن مہترانی کے لیے رکھی پیتل کی چھوٹی گڑوی میں ٹھنڈا یخ پانی بھر کر لاتی اور اونچائی سے پانی کی دھار نیچے گراتی۔ مہترانی نیچے بیٹھ کر ہاتھوں کی اوک میں پانی روک کر گھونٹ گھونٹ پیے جاتی۔ اسے استعمال کے برتنوں' حماموں کی ٹونٹیوں کو ہاتھ لگانے کی ہرگز اجازت نہ ہوتی تھی۔ کلمہ گو مسلمان کا غیر مسلموں سے یہ پرہیز صرف کلمہ کی بنیاد پر ہوتا تھا' رنگ' نسل یا امیری غریبی کی بنیاد پر نہیں' مگر اب زمانے نے پوری کروٹ بدل لی تھی۔ معاشرے کا مہذب' بااخلاق' عقل و شعور اور روایات کا علمبردار طبقہ پس منظر میں چلا گیا تھا۔ اب معاشرے میں طبقاتی تقسیم صرف روپے پیسے کی بنیاد پر ہو رہی تھی۔ ایسے لوگ اور ایسے خاندان نمایاں اور نامور تھے جن کی تاریخ گزشتہ چند سالوں میں ہی شروع ہوئی تھی۔ اسی لیے تو زندگی گزارنے کے اصول بھی بدل گئے تھے۔

"نجانے کتنی سومن' کس کس گھر کے برتن دھو رہی ہوں گی۔" انہوں نے سوچا۔ "اور ہم جیسے جوان چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں' عجوبے کہلائے جا رہے ہیں۔" وہ بار بار تاسف کے مارے سر جھٹک رہی تھیں۔

"کیسی ہیں فاطمہ آپا؟" منتھ کی باڑھ اور سرکنڈوں کی جافری سے پار کھڑی فائزہ نے گھر کے ڈرائیو وے پر چلتے چلتے رک کر لان میں بنچ پر بیٹھی فاطمہ کو دیکھا اور رک کر پوچھا۔

"ہاں!" فاطمہ اپنے خیالات سے باہر نکلیں اور سر ہلایا۔ "اچھی ہوں' تم کیسی ہو؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ خدیجہ آپا کیسی ہیں؟" فائزہ چلتے چلتے باڑھ کے بالکل قریب آگئیں۔

"وہ بھی اچھی ہیں۔ ماہ نور کب واپس آ رہی ہے۔" انہوں نے سر اٹھا کر پوچھا۔ "بہت دن نہیں ہو گئے اسے گئے ہوئے۔"

"ہاں کافی دن ہو گئے' لیکن ابھی مزید رکنے کا کہہ رہی ہے۔ ان لوگوں کی سپرنگ بریک ختم ہونے میں ابھی کچھ دن باقی ہیں' کہہ رہی تھی وہ وہیں گزارے گی۔ میں نے سوچا چلو کوئی بات نہیں اتنے ٹف شیڈول میں کبھی ہی تو ان کو اتنا لمبا بریک ملتا ہے' ٹھیک ہے گزار لے۔ وہاں خوب انجوائے کر رہی ہے۔" فائزہ نے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" فاطمہ نے سر ہلایا۔ "کبھی کہیں گئی نہیں نا اس لیے عجیب سا لگ رہا ہے' اس سے اتنے دن ملاقات نہ ہونا۔" وہ مسکرائیں۔

"مجھے بھی لگ رہا ہے۔" فائزہ نے کہا۔ "ہمارے گھر میں تو شور شرابا اور رونق اسی کے دم سے ہے' یہ مجھے اس کے جانے پر معلوم ہوا۔"

"اور ہمارے گھر کی بھی واحد باقاعدہ وزیٹر وہی ہے' اس کے جانے پر ہمیں یہ معلوم ہوا۔" فاطمہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھئی ظہر کا وقت ہوا چاہتا ہے' پھر ملیں گے کسی وقت۔" انہوں نے فائزہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

"ہاں جی ضرور۔" وہ مسکرائیں اور اندر چل دیں۔

"سچ کہتی ہے سومن بھی۔ یہ رشید کم بخت بھی دن بدن نکما ہی ہوا جا رہا ہے۔" آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے فاطمہ نے لان کی گھاس پر جا بجا بکھرے پتوں کو دیکھتے ہوئے سوچا "کہتی ہوں خدیجہ سے کسی باقاعدہ مالی کا انتظام کرے' یہ تو بنی بنائی رونق اجاڑ دے گا۔" ان ہی سوچوں میں گم وہ رہائشی عمارت میں داخل ہو گئیں۔ ٹی وی لاؤنج سے خدیجہ اور سومن کی گفتگو کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"لو اب یہ یہاں بیٹھی گپیں لگا رہی ہے' کام کب ختم کرے گی آخر۔" انہیں طیش آیا' مگر وہ کچھ کہے بغیر اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

☆ ☆ ☆

"لو بیٹا کھاری! نماز تو تمہیں پوری یاد ہو گئی۔" آپا رابعہ نے اس شام کھاری سے نماز سننے کے بعد خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"بس اب تم بلا جھجک مسجد میں نماز پڑھنے جایا کرو۔" انہوں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"بس جی تھوڑی پریسٹک (پریکٹس) ہور کرنی ہے۔" کھاری آپا رابعہ کی صحبت میں باقاعدگی سے رہتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اردو بولنے لگا تھا۔

"میں بھل جاتا ہوں کہ سجدے دو کرنے ہیں' میں فرضوں کی اور سنتوں کی گنتی بھی بھل جاتا ہوں۔ ابھی مجھے کلے (اکیلے) نماز پڑھ کر پریسٹک کر لینے دیں' فیر مسیت (مسجد) میں پڑھوں گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" آپا رابعہ نے اس کی منطق کو سمجھتے ہوئے کہا۔

"ہالے بھی (ابھی بھی) لوگ کدوں (کب) جان چھوڑتے نیں۔ میں نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہوں تو بابا نور مجھ سے پوچھتا ہے ہاں تو دس فرضوں میں کیا پڑھا۔ الحمد شریف سنا' قل شریف سنا۔ میرا امتحان لیتے ہیں جناب!"

"تو کوئی بات نہیں' تمہیں کون سا نہیں آتا یہ سب' بغیر ہچکچاہٹ کے سنا دیا کرو۔" آپا رابعہ نے کہا۔

"آتا ہے۔" کھاری نے سر جھٹکا۔ "جب وہ پوچھتے ہیں تو میرا دل چھپ (ڈر) جاتا ہے' مجھے لگتا ہے مجھے کچھ نہیں آتا۔"

"تم اپنا ایمان پختہ رکھو کھاری بیٹا!" آپا رابعہ نے چھاج میں چاول پھٹکتے ہوئے کہا۔ "جن کا ایمان مضبوط ہو' وہ نہیں ڈرتے۔"

"ایمان بھی وقت کے ساتھ ڈاڈھا (مضبوط) ہوتا ہے بھین جی!" کھاری نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ "جس کے ماں باپ ہوں نہ کوئی آگا پیچھا' جس کی ساری عمر بڑوں کی جوتیاں سیدھی کرتے گزر گئی ہو' اس کا ایمان آنے والے وقت کے بارے میں ڈانواں ڈول رہتا ہے۔ وہ خوف زدہ بندہ ہوتا ہے اس کو عادت پڑ جاتی ہے جی حضوری کرنے کی۔ اس کو یاد نہیں رہتا کہ وہ بُرے بندے کی جی حضوری کر رہا ہے یا اچھے کی' کافر کی کرتا ہے یا مسلمان کی۔ اس کی عقل رج یا گلٹی کی عقل سے آگے نہیں جاتی۔ گلے میں بڑا سارا ٹل (گھنٹی) ڈالے وہ بس سر ہلاتا رہتا ہے کسی جانور کی طرح۔"

"جب کوئی رہنما کسی کی رہنمائی پر مقرر ہوتا ہے نا کھاری! تو سب سے پہلے اسے ہجوم کی جوتیاں سیدھی کرنے پر لگاتا ہے۔" آپا رابعہ نے اسے جتایا۔

"اس عمل سے اس بندے کی "میں" مر جاتی ہے' جب بندے کی "میں" مر جاتی ہے' اسی وقت وہ اللہ کے رنگ میں رنگنے کے قابل ہوتا ہے۔ تم تو خوش نصیب ہو کہ تمہیں جی حضوری کی عادت پڑ چکی ہے' تمہارے اندر "میں" ابھرنے سے پہلے ختم ہو چکی ہے۔ اب تمہیں اللہ کا بندہ بننے میں کوئی امر مانع نہیں' بس اپنا ڈر' خوف ختم کر دو اور چل پڑو اللہ کے راستے پر۔"

"قسم سے بھین جی؟" کھاری کے لیے آپا رابعہ کی یہ بات کسی خوش خبری سے کم نہ تھی۔

"بالکل۔" آپا رابعہ نے پُریقین انداز میں کہا۔

"تو پھر اب میں نہیں ڈرتا۔" وہ سینہ ذرا سا باہر نکال کر بولا۔

"شاباش!" آپا رابعہ نے اسے تھپکی دی۔

"وہ جو سانپ قبضہ کر کے بیٹھا ہے سونے کے منہ پر' اسے مار کر دکھاؤ تو پتا چلے تم کتنے بہادر ہو۔" سعدیہ جو کب

سے آپا رابعہ اور کھاری کی گفتگو سن رہی تھی اچانک بولی۔

"او سانپ۔۔۔" کھاری نے سعدیہ کی طرف دیکھا۔ "اس کو دیکھ لیتا' میں ہی ماروں گا۔۔۔ پر بھین جی!" پھر اس نے آپا رابعہ سے کہا۔ "لوگ کہتے ہیں وہ سو سال کا سانپ ہے' صبح کو بندہ بن جاتا ہے رات کو سنپ' کیونکہ وہ صبح ویلے نظر نہیں آتا۔"

"کہانیاں بنائی ہوئی ہیں لوگوں نے۔" آپا رابعہ نے خفگی سے سر ہلایا۔

"چلو۔ تم صبح کے وقت اسے بندے کے روپ میں ہی پکڑ لینا۔" سعدیہ نے چڑایا۔

"اگر میں نے بندہ بنا ہوا سانپ پکڑ لیا نا۔" "تو پھر بھین جی! اس سانپ نما بندے کے ساتھ سعدیہ کا ویاہ کردیں گے۔" اس نے سعدیہ کو چھیڑا۔

بے اختیار آپا رابعہ کو ہنسی آگئی۔ "اور چڑاؤ اس کو۔" انہوں نے سعدیہ سے کہا جو کھاری کی اس بات پر تاؤ میں آکر منہ بنا رہی تھی۔

"بھین جی! سپ کا خرچا بھی کوئی نہیں ہوتا' دودھ پیتا ہے' بس۔" کھاری نے اسے مزید چڑایا۔

"بکواس نہ کرو۔" سعدیہ نے غصے سے کہا اور کمرے کی طرف چل دی۔ کھاری آپا رابعہ کی طرف دیکھ کر ہنس دیا۔ "میںنوں بڑی گلاں (باتیں) کرتی ہے' آج دیکھا کتنا غصہ آیا۔"

"ہاں۔۔۔ تم نے اس کا منہ بند کردیا۔" آپا رابعہ مسکرائیں۔

"چلو فیر۔۔۔ میں چلتا ہوں۔۔۔ آج مولوی صیب واپس آئیں تو ان سے پوچھنا کھاری نے کتنی نمازیں پڑھیں آج مسجد میں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"ضرور۔۔۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔" آپا رابعہ نے دعا دی۔

☼ ☼ ☼
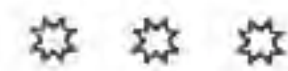
"ایک مکمل اور صحت مند وجود کے مقابلے میں ایک شکستہ اور اپاہج وجود کی کیا حیثیت ہوسکتی ہے۔" سارہ خان کے ذہن کی سوئی ایک ہی نقطے پر اٹک گئی تھی۔

"وہ کون تھی۔۔۔ سعد سے اس کا کیا تعلق تھا۔ اس روز سعد اسے سارہ سے ملوانے کیوں لایا تھا؟" اس نے ان میں سے کوئی سوال سعد سے نہیں کیا تھا' مگر اس کا اپنا ذہن قیافے لگانے میں ہمہ وقت مصروف تھا۔

"اس کمرے میں مجھ سے ملنے کے لیے نکالے گئے چند گھنٹوں کے علاوہ اس کمرے سے باہر کی دنیا میں اس کی ایک الگ زندگی ہوگی۔ ماں' باپ' بہن بھائی' عزیز' دوست۔۔۔ جن کے درمیان وہ دن رات رہتا ہوگا۔"

اس نے وہ بات' جو پہلے کبھی نہیں سوچی تھی' اس دن کے بعد اس نے بار بار سوچی تھی۔

"پھر میرا اس کا کیا تعلق ہے؟" اس نے اپنے شکستہ وجود پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ "ترس' ہمدردی' رحم اور مدد کا تعلق۔" اس کے ذہن میں ایک تلخ سوچ ابھری۔

"ورنہ اس جیسے انسان کو کیا پڑی کہ وہ سرکس کی ایک نٹ کے لیے اتنا وقت نکالے اور اس پر اتنا پیسہ صرف کرے۔" اس کی آنکھیں اپنی بے بسی پر بھیگنے لگیں۔ "سرکس کی کرتب باز لڑکی کی مہذب دنیا میں کیا حیثیت ہے۔ سرکس میں کام کرنے والی لڑکیوں کے بارے میں لوگوں کی سوچ کیا ہوتی ہے' میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ پھر سعد سلطان کے دل میں سوائے ہمدردی اور رحم کے میرے لیے کیا جذبہ ہوگا۔" وہ ہمیشہ کی طرح خود ترسی کا شکار ہونے لگی۔

"لوگ پیسے کے بل پر چھوٹے بڑے کہلائے جاتے ہیں' یہ بھی اس ملک اور اس معاشرے میں ہی میں نے دیکھا ہے کہیں اور ایسا نہیں دیکھا۔" رنگے بالوں کی بڑی سی وگ والا سر ہل رہا تھا جب اس نے یہ بات کہی تھی۔

"لیکن تم کبھی غور کرنا' خوشی کو' میلے کو' جشن کو دل سے وہی لوگ مناتے ہیں' جن کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ ان کے لیے گھڑی دو گھڑی کی خوشی' میلہ اور جشن ہی تفکرات سے نجات کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں' سو وہ جی بھر کر خوش ہوتے ہیں لیکن جن کے پاس پیسے ہیں وہ خوشی' میلے اور جشن کے لمحوں میں بھی فکروں اور اندیشوں میں گھرے رہتے ہیں۔ کسی انہونی کے خوف میں مبتلا' جمع تفریق کے غم میں الجھے' نہ وہ کبھی جی بھر کر خوش ہوتے ہیں نہ پیٹ بھر کر کھا سکتے ہیں۔"

سفید پینٹ میں رنگے ہونٹ کہہ رہے تھے۔

"تم تو یہاں کے باسی بھی نہیں ہو رکو! پھر تمہیں یہ سب کیسے پتا ہے۔" سارہ کی سوچ اجنبی چہرے والی ماہ نور اور سعد کی ذاتی زندگی سے ہوتی ماضی کی طرف مڑ گئی۔

"میں کہاں کا باسی ہوں پریا رانی۔۔۔! یہ تو مجھے خود بھی معلوم نہیں۔" سفید پینٹ زدہ ہونٹ مسکرائے۔ "میری قومیت کے خانے میں پاکستانی درج ہے کیونکہ میرا باپ پاکستانی ہے' مگر پاکستان کے لوگ مجھے پاکستانی نہیں مانتے کیونکہ میرے نین نقش پاکستانیوں والے نہیں ہیں۔" رنگ برنگے نقش و نگار والے چہرے پر تاسف کی جھلک نمایاں ہوئی۔

"تم تو جاپانی ہو۔۔۔ اپنی ناک دیکھو' گول اور اوپر کو اٹھی ہوئی۔ ذرا سی ناک اور اپنی آنکھیں دیکھو' چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی ہوئی۔"

"ہاں!" اس چہرے پر مسکراہٹ دوڑی اور وہ سر ہلانے لگا۔ "میری ماں جاپانی تھی۔"

"تھی کیا مطلب' اب کہاں ہے وہ؟"

"پتا نہیں۔۔۔ ہوگی کہیں۔" لاپروائی سے کہا گیا۔

"تم اپنی ماں کے ساتھ کیوں نہیں ہو رکی؟"

"میں رکی نہیں رکو ہوں پریا رانی! جاپان میں رکی نام نہیں ہوتا' رکو ہوتا ہے۔"

"کیا فرق پڑ جاتا ہے' ذرا سی ری کے فرق سے۔"

"ہاں فرق تو کوئی نہیں پڑتا او اور ری کے فرق سے' فرق تو اس سے بھی نہیں پڑتا کہ انسان جاپانی ہے یا پاکستانی۔"

"تو بتاؤ نا تم اپنی ماں کے ساتھ کیوں نہیں ہو؟"

"میری ماں بڑی سرپھری اور ضدی تھی۔ میں اور میرے بہن بھائی کل ملا کر چار تھے۔ میرا باپ صبح سویرے کام پر چلا جاتا اور ہم چار بچے جب آپس میں لڑتے اور اودھم مچاتے تو میری ماں' ہمیں گھر میں بند کرکے خود کسی ہوٹل میں کمرا کرائے پر لے کے سارا دن وہاں سوئی رہتی۔ وہ وہاں اپنی نیند پوری کرتی اور ہم چاروں بھوکے پیاسے سارا دن ایک دوسرے سے لڑ لڑ کر گزار دیتے۔"

"ہا۔۔۔ یہ کیسی ماں تھی؟"

"بس وہ ایسی ہی ماں تھی۔"

"پھر اس نے میرے باپ پر کیس کردیا جھوٹ کا اور اپنا پیسہ ہضم کر جانے کا۔"

"تمہارے باپ نے اس کا پیسہ کھا لیا تھا کیا؟"

"پتا نہیں۔۔۔ مگر اس نے واویلا کرکے پولیس بلالی اور میرے باپ کو جیل ہوگئی۔"

"ہائے' بیڑا غرق ہوجائے تمہاری ماں کا۔"

"اس کا تو شاید بیڑا غرق نہیں ہوا' ہمارا ہوگیا۔" سفید دستانوں میں مقید ہاتھوں کی انگلیاں رنگ برنگی لمبی ٹوپی پر

پھرتی تھیں اور سفید ہونٹ متحرک تھے۔
"پھر تمہاری ماں تمہیں پالنے لگی؟"
"نہیں وہ تو اپنا سامان باندھ کہیں غائب ہوگئی' ہمیں ہمارے باپ کی بہن کا خاوند پاکستان لے آیا۔"
"چلو۔" قصے سننے کی شوقین پری کو اس نئے موڑ پر مایوسی ہوئی' "پھر خیر سے تمہاری پھوپھی نے تمہیں پالا ہوگا۔"
"نہیں۔" رنگ برنگی وگ ہلی۔ "ہمیں ہماری دادی کے پاس چھوڑ دیا گیا جو ایک پس ماندہ سے گاؤں میں رہتی تھی۔"
"اوئے ہوئے۔ پھر۔"
"پھر ہم جاپانی شکل و صورت والے بچوں نے گلیوں میں پھرنا' گالیاں دینا' بدلحاظی کرنا سیکھنا شروع کردیا۔"
"تو تمہاری پھوپھی کہاں گئی کم بخت!" اس نے غصے سے کہا۔ "جاپانی بچے' پنجابی گالیاں۔" وہ مسکرائی۔
"وہ اپنے بچوں کے ساتھ شہر میں رہتی تھی' میرے سب سے چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ لے گئی کیونکہ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ اس کی تربیت کرنا آسان تھا۔"
"اور تم اور باقی دو؟"
"ہمیں قصبے کے اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ نہ ہمیں اردو ڈھنگ سے آتی تھی' نہ انگریزی۔ البتہ پنجابی میں گالیاں دینی خوب آگئی تھیں۔"
"ہی ہی۔ تو تم نے اسکول کے باقی بچوں کو گالیاں سکھادی ہوں گی۔"
"اسکول کے باقی بچے ہمارا مذاق اڑاتے تھے اور ٹیچرز نے چند مہینوں بعد ہی' ہمیں ناممکن بچوں کی فہرست میں شامل کردیا۔"
"چلو جی۔۔۔ پھر کیا ہوا؟"
"پھر دادی گھر میں ہماری کھال ادھیڑتی اور اسکول میں ہم مرغے بنے رہتے یا کلاس سے باہر نکال دیے جاتے۔"
"تم اور تمہارے دو اور بھائی؟"
"میں اور میری بہنیں۔۔۔ ایک مجھ سے بڑی ایک چھوٹی۔۔۔ جب ہم اچھی طرح بگڑ چکے اور ہماری درستی کا کوئی امکان باقی نہ رہا تو سننے میں آیا کہ ہمارا باپ جو اب جیل سے واپس آچکا ہے' پاکستان آرہا ہے اور وہ خود ہی دیکھ لے گا ہم کیسے نہیں سدھرتے۔۔۔"
"ہاہا۔۔۔ پھر تم اس کے آنے پر سدھر گئے کیا؟"
"وہ آیا اور دادی نے اس کی شادی اپنی بھانجی سے کردی' جو کسر رہ گئی تھی پوری ہوگئی۔ گھر میں سوتیلی ماں آگئی۔"
"ہا۔۔۔ کیا کیا نہ ہوا تمہارے ساتھ۔۔۔"
"جوں جوں آگے سنو گی' پچھلا سا کم لگتا جائے گا۔
جب تک باپ پاکستان رہا' کبھی دادی اور کبھی سوتیلی ماں شکایتیں لگا لگا کر ہمیں چار چوٹ کی مار پڑواتی رہیں۔ باپ ہماری جاپانی ماں کی زیادتی کا بدلہ بھی شاید ہمیں ہی مار کر لیتا تھا۔ پھر وہ واپس چلا گیا' جانے سے پہلے بڑی بہن کو جو خیر سے خوب ہی زبان دراز اور منہ پھٹ تھی بورڈنگ میں داخل کروا گیا۔ چھوٹی کو دوسری پھوپھی لے گئی اور میں رہ گیا دادی کے پاس۔ اس بار باپ تھائی لینڈ گیا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھے کہا۔ اگر وہ وہاں سیٹ ہوگیا تو مجھے اپنے پاس بلالے گا۔ لہٰذا میں اچھا بچہ بن جاؤں۔"

"بڑا احسان کرنا تھا نا جیسے اس نے۔" وہ منہ بنا کر بولی تھی۔ "یہ بتاؤ رونا نہیں آتا تھا جب تمہیں مار پڑتی تھی؟"
"آنکھوں سے رونا تو معمولی سی بات ہے پریا رانی! دل خون کے آنسو جو روتا ہے اس کا تجربہ ہی کچھ اور ہے۔ آپ کا کچھ قصور ہو اور مار پڑے تو شاید اتنی تکلیف نہیں ہوتی' بے قصوری کی مار دل و جگر پر پڑتی ہے۔"
"اچھا یہ بتاؤ تم اچھے بچے بنے؟" بات خاصا دکھی موڑ لے گئی تھی لہٰذا موضوع بدلا گیا۔
"اچھا بچہ بننے سے پہلے میں نے ساتھ والے گاؤں میں لگا سرکس دیکھ لیا۔ سرکس میں کرتب دکھاتے مسخرے نے میرا دل موہ لیا۔ اس سے پہلے بچپن میں اپنی کتاب میں سجے جوکر کی تصویر بھی مجھے بہت بھاتی تھی۔ جب مسخرے کو کرتب دکھاتے دیکھا اور لوگوں کو اس کے کرتبوں پر ہنستے پایا تو خیال آیا کہ اس سے بہتر کرتب میں خود دکھا سکتا ہوں۔ بچپن سے دادی کی مار' ہم عمروں کے طعنوں' بہن بھائیوں کی مار کٹائیوں سے بچنے اور خود کو بچانے کے لیے الٹی سیدھی حرکتیں کرنے کی عادت تھی اور یہ بھی یاد تھا کہ میری حرکتوں پر غصہ کھانے والے کو اکثر ہنسی آجاتی تھی۔ سو ذہن میں خیال آیا کہ خود تو اس وقت تک کی زندگی میں رویا بہت' رلانے والے بھی بہت تھے۔ ہنسانے والا کوئی نہ تھا' ہنسی کے معنی اور اہمیت کا اندازہ بھی خوب تھا' سو کیوں نہ لوگوں کو ہنسانے کا کام کیا جائے' روتوں کو ہنسایا جائے' فکر مند چہروں پر مسکراہٹ بکھیری جائے۔ بس یہ فیصلہ کیا اور گھر سے بھاگ کر یہاں آگیا۔"
"ہاہائے۔۔۔ تو تمہارے گھر والے پریشان نہیں ہوئے تمہارے بھاگنے پر۔"
"پریشان کون ہوتا' دادی جس کا میں نے بقول اس کے' ناک میں دم کر رکھا تھا یا پھر سوتیلی ماں' جو مجھے موت کی بددعا دیا کرتی تھی۔"
"اوفوہ! پھر بھی تمہیں ڈر نہیں لگا گھر سے بھاگتے ہوئے۔"
"میرے جیسے بچے بہت بچپن میں ہی بڑے ہوچکے ہوتے ہیں پریا رانی! ہمارے دلوں سے خوف' ڈر بھاگ چکا ہوتا ہے۔"
"مگر تمہیں یہاں کیا ملا آکر۔ تمہارا باپ اچھا بھلا تمہیں تھائی لینڈ لے جاتا۔"
"کسی نے نہیں لے جانا تھا پریا رانی! وہ صرف طفل تسلیاں تھیں۔ دادی کے گھر میں میرا کوئی مستقبل نہیں تھا' سوائے سوتیلے بہن بھائیوں کی چاکری کے۔ میں نے سوچا کہ میری زندگی میرے تو شاید کسی کام نہ آسکے' دوسروں کے کام تو آنی چاہیے اسی لیے میں یہاں چلا آیا۔"
"تم کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا ہوگا کہ تم اندر سے اتنے دکھی ہو۔"
"میں دکھی نہیں ہوں پری! بڑا مطمئن اور شاد ہوں۔ میں اپنی زندگی اور صلاحیتیں دوسروں کے چہروں پر دو گھڑی مسکراہٹ کے پھول بکھیرنے میں استعمال کرتا ہوں۔ میں روتوں کو ہنسا سکتا ہوں' مجھ پر نظر پڑتے ہی بسورتا بچہ بھی مسکرانے لگتا ہے۔ بدلے میں میں لوگوں کی محبتیں وصولتا ہوں' پیار پاتا ہوں' کیا یہ میرے لیے خوشی کی انتہا نہیں۔"
"میری سمجھ میں تمہاری باتیں نہیں آتیں بھئی۔"
"اس لیے پری بی بی! کہ تم نے کچھ پانے کے بعد کچھ کھویا نہیں۔ جو تمہارے پاس نہیں ہے وہ ہمیشہ سے نہیں ہے جو ہے ہمیشہ سے ہے۔ محرومی دو طرح کی ہوتی ہے' کسی چیز کا کبھی نہ ہونا اور کسی چیز کا مل کر کھو جانا زیادہ تلخ تجربہ ہوتا ہے اور جو اس تجربے سے گزرتا ہے وہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے جو پریا رانی! تمہاری سمجھ میں شاید کبھی نہ آئیں۔"
سفیدے میں لتھڑے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ ناک کی پھننگ پر جمائی سرخ ٹینس بال سانس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہولے ہولے لرز رہی تھی۔

"رکی۔۔۔ رکی۔! ابھی تم آؤ تو دیکھو میں پاکر کھونے کے تجربے سے گزرنے کے بعد کیسی کیسی حقیقتیں بغیر کسی کے بتائے سمجھ جاتی ہوں۔" اس نے اپنی ہتھیلیوں سے بھیگی آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"میں تو اب تجربے میں تم سے بھی بڑی ہو گئی ہوں۔ پہلے میرے پاس ہمیشہ سے نہ ہونے کی محرومی تھی۔ اب پاکر کھونے کی محرومی بھی ہے' میں تو تمہارے بتائے فلسفۂ حیات میں ماسٹرز ڈگری پا گئی ہوں رکو! ابھی آکر تو دیکھو!" اس نے آنکھیں میچ کر چہرے پر تکیہ رکھ لیا۔

☼ ☼ ☼

"میں اتنا بڑا بہروپیا ہوں۔ سوچ لو' کہیں میں کوئی کرمنل نہ نکل آؤں۔" ماہ نور کو سعد کے کہے یہ الفاظ دن میں کئی بار یاد آتے تھے۔

"زندگی اتنی غیر متوقع اور حیران کن ہے کہ کسی بھی امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔" اس نے بارہا سوچا تھا۔

"لیکن جو شخص ایک زخمی اور بے بس لڑکی کو اس جانفشانی سے زندگی کی طرف لانے کی سر توڑ کوشش کر رہا ہو' کیا وہ کرمنل ہو سکتا ہے۔"

"اس کے پیچھے بھی نہ جانے کیا کہانی ہو۔" تشکیک کا تقاضہ تھا کہ ہر پہلو سے سامنے پر غور کیا جائے۔

"سلطانہ ڈاکو کی کہانی بھی تو سن رکھی ہے ہم نے۔" اس نے سوچا اور پھر خود اپنی ہی سوچ پر اسے ہنسی آگئی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جتنا اور جیسا بھی غور فرمالوں۔ تم کسی طرح بھی کرمنل نہیں ہو سکتے۔ ہاں تمہاری شخصیت میں عجیب سا اسرار ضرور ہے۔ اور مجھے دیکھو! جسے ہمیشہ سے جگسا پزلز اور "راستہ ڈھونڈیے" جیسے گیمز سے سخت چڑ تھی میرا دل خود بخود آمادہ ہو رہا ہے کہ میں تمہارے اسرار کو جانوں اسے ایک ایک کر کے کئی منظر یاد آنے لگے۔

"مگر یہ حقیقت بھی تو نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ مجھے ہی تم کیوں بار بار مختلف جگہوں پر نظر آئے۔"

اسے سعد کی کہی بات یاد آئی۔

"تم کو بندر کا تماشا ہی سیکھنا تھا نا' پھر تم نے اس شخص سے کیوں نہیں سیکھا جس کو تمہارے چچا نے گندم کی بوری اور پانچ سو روپے دے کر بلایا تھا؟"

"سچ ہے میں نے اسی سے کیوں نہیں سیکھ لیا' کیوں کوئی اور بندر کے تماشے والا میرے معیار پر پورا نہیں اترا۔ پھر یہ تو طے ہے کہ کوئی خاص ہی بات تھی جس نے مجھے بار بار وہاں موجود رکھا جہاں تم تھے۔ اب اس بات کی کھوج لگانا باقی ہے کہ وہ خاص بات کیا تھی؟" اس نے سوچا اور مسکرا دی۔

"بہر حال تم سے ملاقات ۔۔۔ ایک اچھا تجربہ ہے اور میں اس تجربے کو بار بار دہرانا چاہتی ہوں۔" اس نے طے کیا اور اپنے سیل فون میں سعد کا نمبر فرینڈز لسٹ میں محفوظ کر لیا۔

☼ ☼ ☼

"اسکول والے میری پیدائش کی پرچی مانگ رہے ہیں ابا جی! انہم کا داخلہ بھجوانا ہے انہیں۔" سعدیہ نے کھانا کھانے میں مصروف مولوی سراج سرفراز کو مخاطب کیا۔

"پیدائش کی پرچی؟" شوربے میں روٹی کا لقمہ ڈبوتا ان کا ہاتھ رکا اور انہوں نے اپنی زوجہ رابعہ کی طرف دیکھا۔ جو خود بھی اس سوال پر چونکی بیٹھی تھیں۔

"پیدائش کی پرچی کیا کرنی ہے اسکول والوں نے؟" مولوی سراج نے وہ سوال کیا' جس کا جواب انہیں خود بھی معلوم تھا۔

"بورڈ والے مانگتے ہیں۔ مس نسیمہ کہہ رہی تھیں کہ کمپیوٹر سے نکلی پرچی چاہیے۔ ہو سکتا ہے بورڈ والے ب فارم بھی مانگ لیں' پھر وہ بھی بنوانا پڑے گا۔" سعدیہ نے جواب دیا۔

"لاحول ولا۔" مولوی سراج نے کھانا وہیں چھوڑ دیا۔ "نہم کا امتحان نہ ہو گیا۔ ایم اے کی ڈگری ہو گئی۔ اب جس کے پاس پیدائش کی پرچی نہ ہو' وہ کیا امتحان ہی نہ دے۔"

"کئی بچیوں کے پاس نہیں ہو گی۔" آپا رابعہ نے اپنی خوش فہمی کو الفاظ دیے۔

"کتنی لڑکیاں تو لے بھی آئی ہیں' جن کے پاس نہیں ہیں' ان کے اماں ابا نے درخواستیں دی ہوئی ہیں کمیٹی کے دفتر میں۔" سعدیہ نے اپنی معلومات حاضر کیں۔

"ہوں۔" مولوی صاحب اپنی داڑھی میں ہاتھ پھیرتے سوچ میں گم ہو گئے۔

"آپ نے کھانا کیوں چھوڑ دیا۔ کھانا تو ختم کریں۔" آپا رابعہ نے ان کی توجہ کھانے کی طرف دلائی۔

"اب یہ جو نیا مسئلہ آپڑا ہے' اس کا کیا کریں۔" مولوی صاحب کو بے چینی لگ گئی تھی۔

"ہو جائے گا کوئی حل' میں خود اسکول جا کر پتا کرتی ہوں کل۔" آپا رابعہ وقت کو ٹالنے کی غرض سے بولیں۔

"اندراج بھی کرایا تھا کہ نہیں۔ یاد نہیں۔" مولوی صاحب جیسے خود سے مخاطب ہوئے۔ "کرایا تھا تو پرچی تو لینی چاہیے تھی' لی تھی تو محفوظ ہونی چاہیے تھی۔"

"کرایا ہوتا تو پرچی ملتی' پرچی ہوتی تو محفوظ ہوتی۔"

آپا رابعہ دل ہی دل میں مولوی صاحب کی خود کلامی کا جواب دے رہی تھیں اور سعدیہ زندگی میں پہلی بار باپ کی گفتگو اور ماں کے چہرے کے تاثرات غور سے سن اور جانچ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کچے دودھ کو منہ مارا ہے کسی نے۔" جنت بی بی نے دودھ سے بھری بالٹیاں سامنے رکھے باری باری کھاری' سلیم اور شوکت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"دونوں بالٹیوں میں جھک (جھاگ) کوئی نہیں ہے۔" اس نے ماہرانہ انداز میں بالٹیوں کی طرف دیکھا۔

"کیوں کاکا! یہ کس کا کام ہے۔" اس نے جانچتی نظروں سے ان تینوں کو دیکھا جو سر جھکائے کھڑے تھے۔

"میں نے جب دودھ دوہا' ماسٹر کمال میرے سر پر کھڑا تھا۔ میں فارغ ہوا تو وہ کیری ڈبے میں رکھ کر ادھر کو آگیا۔" شوکت نے اپنی صفائی پیش کی۔

"مجھے آج پھونک کر بخار چڑھا ہے' مجھے تو ماسٹر کمال نے ہاتھ نہیں لگانے دیا کسی گائے کے تھنوں کو۔" سلیم کا بیان مضبوط تھا' اسے واقعی تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔

"تے توں کاکا؟" ماسی جنت نے کڑے تیوروں سے کھاری کی طرف دیکھا۔

"مجھے ایسی بری عادت نہیں ہے۔" کھاری نے اکڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"سالوں سے یہ کام کر رہا ہوں ۔۔۔ میرا دین ایمان اس بے ایمانی سے خراب ہوتا ہے۔"

"دکھاوے کی نمازیں' دکھاوے کے سجدے اور مسلسل ٹکریں ایک برابر ہیں۔" جنت نے طنزاً کہا۔

"دیکھ ماسی!" کھاری نے انگلی کے اشارے سے جنت کو تنبیہ کی۔ "نمازوں کا طعنہ نہیں دینا۔"

"یہ تو چل کے بڑے چوہدری صاحب کو بتا۔" جنت چمک کر بولی۔

"ان کو میں خود بتا دوں گا۔"

"کیوں بھئی! یہاں کیوں اور کس بات پر بحثا بحثی ہو رہی ہے۔" ادھر سے گزرتے ماسٹر کمال نے سب کے

سنجیدہ چہرے دیکھے تو قریب آ گئے۔

"دوبالٹیاں دے دودھ تے جھگ کوئی نئیں سرکار!" جنت نے مودب انداز میں کہا۔ "میں ان بے ایمانوں سے یہ ہی پوچھ رہی ہوں۔"

"اوہو۔" ماسٹر کمال ہنسے۔ "ان دونوں بالٹیوں سے اوپر کا دودھ لے کر چودھرائن کو بھجوا دیا تھا — انہوں نے دودھ کی جھاگ بھیجنے کو کہا تھا کل رات۔"

"دیکھ لیا؟" کھاری تڑپ کر بولا۔ "بغیر نتارے (تفتیش) الزام لگانے والے لوگوں کی نمازوں کا مذاق اڑانے والو! دیکھ لیا۔ اللہ کس طرح پل کے پل میں اپنے معصوم بندوں کو بچاتا ہے۔" اس نے جنت کی طرف دیکھا جو شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"ان سب کا بس نہیں چلتا ماسٹر جی! کھاری کو ڈیرے سے باہر پھنکوا دیں۔ میرے شٹے لس (اسٹیٹس) توں جلدے نیں سب۔"

"او میرے شہزادے!" ماسٹر کمال نے اس کا شانہ تھپکا۔ "کس کی مجال ہے تجھے باہر پھنکوا دے، تو چوہدری صاحب کا بڑا لاڈلا ہے۔"

"بس ماسٹر جی! ہور نئیں برداشت ہوتا۔" کھاری نے سر جھکایا۔ "تم میری ڈیوٹی ڈیرے سے اٹھا کر کہیں ہور لگا دو، اندر لگا دو مہمان خانے میں۔"

"او بھلیا لوکا! تیری کوئی چاکری تو نہیں نا، تو تو ان سب کی نگرانی کرنے والا بندہ ہے۔ تیری نظر چوکتی ہے نہ، تجھے کوئی دھوکا دے سکتا ہے، اس لیے تیری ڈیوٹی ادھر لگی ہے۔" ماسٹر کمال نے اس کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر کہا۔

"او نئیں نئیں۔" کھاری نے نہ ماننے والے انداز میں سر ہلایا۔ "بس تسی مجھے مہمان خانے کی طرف بھیج دو، مجھے ٹرے لگا کر کھانا پیش کرنا آتا ہے۔ مہمان خانے کی صفائی اور سارا بندوبست بھی آتا ہے۔"

"تو اس فارم ہاؤس کی اپچی بپچی (ہربات) جانتا ہے کھاری پتر! تجھے تو آنکھ بند کر کے کہیں بھی بھیج دوں، پر یہ جو دس بھینیں تیرے ہاتھ پر پڑی ہیں، ان کا کیا کروں اور ادھر جو سبزی کے ٹرک لوڈ کرانے کا بندوبست ہے، وہ کون کرے گا۔" ماسٹر کمال نے اب کے اصل بات کی۔

"نہ ماسٹر جی! آپ میری بات نہ سنو گے تے میں چوہدری صیب نوں آپ کہہ لوں گا۔ میں ادھر ڈیوٹی نئیں دینی۔" کھاری نے کندھے پر رکھا رومال ہاتھ میں پکڑ کر اپنے جوتے کی گرد جھاڑتے ہوئے کہا اور ادھر سے چل دیا۔

"اور جو اس نے شکایت لگا دی نا چوہدری صاحب سے تو بس پھر سمجھو سب کی شامت آ گئی۔" ماسٹر کمال نے کھاری کے جانے کے بعد سب کو مخاطب کیا۔

"یہ سارا تمہارا کیا دھرا ہے جنت بی بی!" انہوں نے جنت کی طرف دیکھا۔

"سرکار! میں تے کھرا لے رہی ساں۔" (میں چور کی نشان دہی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔) جنت بی بی نے لرزتی آواز میں کہا۔

"اور کھرا تجھے اسی کا نظر آیا جو اسی فارم ہاؤس کی بھول بھلیوں میں پل کر جوان ہوا ہے۔" ماسٹر کمال نے جنت کو گھر کا۔

"غلطی ہو گئی جی!" جنت نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"شکر کر شیدائی ہے، عقل کا ہولا ہے، کوئی بات چوہدری صاحب تک پہنچاتا نہیں، ورنہ جو کچھ سب کو لگی علتیں وہ جانتا ہے، یہاں کوئی دو دن سے زیادہ رہ نہ پائے تم لوگوں میں سے، مت چھیڑا کرو اسے۔"

ماسٹر کمال نے اپنی گھنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ سب کے سر جھک گئے۔

☼ ☼ ☼

"اوئے! تو کن ہواؤں میں اڑ رہا ہے آج کل۔" اس روز ابراہیم نے صبح صبح ہی سعد کو جا پکڑا۔

"ہواؤں میں کدھر یار! میں تو ٹریک پر ٹانگیں بھگاتا ابھی ادھر پہنچا ہوں۔" سعد نے تولیے سے پسینہ خشک کرتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے کھلاتا ہے۔" ابراہیم نے اسے گھورا۔ "سچ بتا! کدھر غائب تھا اتنے دن سے۔" تو میرا سب سے بڑا جاسوس ہے۔" سعد نے لان میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جو جو رپورٹ تیرے اس چھوٹے سے گول مٹول پیٹ میں موجود ہے، سب نکال دے۔"

"کون ہے وہ لڑکی؟" ابراہیم اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہاہاہا۔" سعد زور سے ہنس دیا۔ "ابراہیم یار! تو پیٹ کا بڑا ہلکا ہے۔ فوراً" اگل دیا۔ تھوڑا ایٹی ٹیوڈ ہونا چاہیے بندے میں یار!"

"تجھے پتا ہے میں اسٹریٹ فارورڈ بندہ ہوں۔" ابراہیم نے ٹانگیں آگے پھیلا کر کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے ہیریاں، پھیریاں نہیں آتیں۔"

"تیری سب سے بڑی کوالٹی یہ ہی تو ہے یار!" سعد مسکرایا۔ "اسی لیے تو اچھے کھانے کھاتا ہے اور چین کی نیند سوتا ہے۔"

"مجھے ٹال مت، جلدی بتا۔" ابراہیم نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ "کون ہے وہ۔"

"تجھے کیا لگتا ہے، کون ہو سکتی ہے۔" سعد نے الٹا سوال کیا۔

"میں تیرے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتا۔ تیرے اور چھور کا کچھ پتا نہیں چلتا۔" ابراہیم نے منہ پھلایا۔

"ویسے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، یہ وہی لڑکی ہے جو میوزیکل نائٹ والے دن آپے سے باہر ہو گئی تھی۔" ابراہیم نے سوچتے ہوئے کہا۔

"تیری آبزرویشن بڑی اسٹرونگ ہے، مگر الفاظ غلط استعمال کر جاتا ہے۔" سعد نے پانی کی بوتل منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔ "آپے سے باہر غصے میں ہوا جاتا ہے میرے بھائی!"

"اچھا۔ چھا۔" ابراہیم نے سر ہلایا۔ "تو اس روز کیا وہ تیری محبت میں پرجوش ہو رہی تھی۔"

"کم آن ابراہیم!" سعد کو پانی پیتے پیتے ہنسی آ گئی اور اچھو لگ گیا۔

"پھر تو سیدھی طرح بتا کون ہے وہ؟" ابراہیم نے کہا۔

"ہے یار! ایک لڑکی، اچھی دوست بن گئی اتفاق سے۔ وہی ہے جس کا چارکول اسکیچ خریدا تھا۔"

"اوہ ہاں۔۔۔" ابراہیم کو یاد آیا۔

"مگر تو نے کہاں دیکھ لیا اس کو؟" سعد نے سوال کیا۔

"جس روز آپ اس کے ساتھ مری روڈ پر چہل قدمی کر رہے تھے۔" ابراہیم نے کہا۔

"کیا؟" سعد حیرت سے چیخا۔ "مری روڈ پر چہل قدمی۔۔۔ تو اپنے حواسوں میں تو ہے۔"

"چہل قدمی کا مطلب چالیس قدم ہوتا ہے، جو پیدل کی جائے یا گاڑی پر ایک ہی بات ہے۔ تم یہاں سے چالیس کلو میٹر دور جا رہے تھے اس کے ساتھ۔"

"سچ بتا!" سعد نے اٹھ کر ابراہیم کی گردن دبوچتے ہوئے کہا۔ "تجھے میری جاسوسی پر کس نے لگایا' قبلہ والد صاحب نے نا!"

"او نہیں جگر!" ابراہیم نے اپنی گردن اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ "اتفاق سے میں اس روز مری سے واپس آرہا تھا۔"

"یہ سارے جو اتفاقات ہوتے ہیں نا' میں ان کی حقیقت خوب جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی ایسی تیسی کیسے کی جاتی ہے۔" سعد نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"دیکھ ابراہیم! تو باز آجا۔" سعد نے انگلی کے اشارے سے اسے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔

"جو بھی ہے یار! لڑکی بہت ڈیسنٹ اور سمجھ دار لگتی ہے' تیری دوست کیسے بن گئی؟" ابراہیم نے شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"دیکھ ابراہیم! میری پہلی اور آخری وارننگ ہے تیرے لیے۔" سعد کی سوئی کہیں اور ہی اٹکی ہوئی تھی۔

"تو نے کچھ نہیں دیکھا' تجھے کچھ پتا نہیں۔"

"اچھا بابا اچھا!" ابراہیم نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی' ہر بات کو ہائی لائٹ نہیں کیا کرتے۔" سعد نے سمجھانے کے سے نرمی سے کہا۔

"مجھے پتا ہے اتنا تو میں بھی بے وقوف نہیں ہوں۔" ابراہیم نے خفگی سے کہا۔

"ہاں میں جانتا ہوں۔" سعد مسکرایا۔

"اچھا... اب ناشتا تو کرا دے' تجھے پکڑنے کے چکر میں سیدھا ادھر ہی آگیا۔" سعد مسکراتا ہوا افضل بخش کو آواز دینے لگا۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے چھت پر لیپائی کی گئی مٹی میں پڑتی دراڑوں کو غور سے دیکھا' جو جا بجا بکھری نظر آرہی تھیں۔ جو اس سال ساون پچھلی بار کی طرح بھرپور ہوا تو چھت کا ٹپکنا لازمی تھا۔ کس سے مٹی منگوائی جائے اور کون گھائی کر کے دے گا۔ یہ ایک فوری مسئلہ تھا جو سر پر کھڑا نظر آرہا تھا۔ مگر انہیں محسوس ہوا کہ اس سوچ پر لاشعور میں موجود کوئی اور بات حاوی تھی۔ اسی دم مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے جمعہ کے خطبہ کی آواز ابھرنے لگی۔ شاید بجلی آنے پر آواز دور' دور تک سنائی دینے لگی تھی۔

"ایک بار ایک شخص' ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔" مولوی سراج سرفراز پنجابی میں خطبہ دے رہے تھے۔

"بزرگ بھی کون ایک ولی اللہ' یعنی اللہ کا خاص بندہ۔ اس شخص نے عرض کی مجھے رات بھر نیند نہیں آتی' دن بھر کا تھکا ہارا میرا جسم رات بھر کے آرام کے بعد بھی تھکا ہارا ہی رہتا ہے' بزرگ نے فرمایا... اے بندے تو صرف نام کا مسلمان ہے۔ تیرا ایمان کمزور اور نیت میں بدی ہے۔ تو آنے والے کل کے دن کی روزی کے غم میں مبتلا انسان ہے۔ اپنی نیت سیدھی کر لے۔ اپنا ایمان مضبوط کر' کل کی فکر نہ کر' تیری نیند اچھی ہو جائے گی۔ تیری رات سکون سے گزرے گی۔"

تیا رابعہ کو ان کا خطبہ دینے کا یہ انداز کبھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ آواز میں کبھی شدت اور گھن گرج پیدا ہو جاتی اور کبھی وہ بہت نیچی ہو جاتی۔ کبھی اچانک بات کو لہک لہک کر گنگنا کر سنایا جاتا اور کبھی آواز سہم سی جاتی۔ خطبے میں سنائے جانے والی اکثر مثالوں کی صحت ضعیف اور بیان پر عبور کی کمی ہوتی۔ مگر گاؤں کے ان پڑھ' محنت مزدوری

کرنے والے لوگ بڑی توجہ اور دھیان سے مولوی صاحب کا خطبہ سنتے۔

مولوی صاحب۔ ایک بے ضرر انسان تھے' جنہوں نے عمر کا بیشتر حصہ اپنے ہی جیسے ایک کم علم مولوی صاحب سے خطابت اور امامت سیکھتے گزار دیا تھا۔ نہ ان کو مطالعہ سے شغف تھا' نہ اپنی معلومات میں اضافہ کرنے سے' وہ سیدھی سیدھی اذان دینے' امامت کرنے' ناظرہ پڑھانے اور خطبہ دینے والے مولوی صاحب تھے۔ اسی کام میں ان کی روزی روٹی کا وسیلہ تھا۔ اسی کام میں چند لوگوں سے عزت پاتے تھے اور یہ ہی کام کرکے چین کی نیند سوتے تھے۔ مذہبی بحث مباحثہ سے انہیں کبھی کوئی سروکار نہیں ہوا تھا' جو کبھی ان کا کوئی مخاطب کسی مسئلے پر بحث کرنے بھی لگتا تو وہ جو صرف اللہ جانتا ہے' اس پر ہم بات نہیں کرسکتے۔" کہہ کر گفتگو کا اختتام کردیتے تھے۔ وہ اس لگی بندھی زندگی کے عادی ہوچکے تھے۔ اس سے آگے کی نہ کبھی انہوں نے سوچی تھی' نہ اس سے زیادہ کی خواہش کی تھی۔

بزرگ اور اس آدمی کا قصہ جس کو رات بھر نیند نہیں آتی تھی ان کے خطبے کا مستقل حصہ تھا۔" ان کی نظر چھت کی خشک پڑی مٹی میں نمودار ہوتی دراڑوں میں سے ایک کے اندر گھستی چیونٹیوں کی ایک قطار پر پڑی۔ قطار میں موجود کسی چیونٹی کو نہ اپنے سے اگلی چیونٹی سے آگے جانے کی دھن تھی' نہ ہی راستہ بدلنے کی' سب اسی قطار میں مخصوص رفتار کے ساتھ چل رہی تھیں۔

"یہ اپنے حصے کا رزق حاصل کرکے رہتی ہیں' جہاں سے بھی ملنا ہو وہاں پہنچ جاتی ہیں۔"

انہیں برسوں پہلے کسی کی کہی بات یاد آگئی۔ "یہ حشرات الارض۔۔ ان کی کیا مجال تھی جو جیتے جاگتے انسان کے جسم پر چڑھ جاتیں۔ ان کو تو انسان کی موت کے بعد اذن ملتا ہے انسان کی مٹی کو مٹی کے ساتھ مٹی کرڈالنے کا مگر یہ انسان کی بداعمالیاں ہیں اس کے شیطانی فعل ہیں' جو حشرات الارض کی دسترس میں جیتے جی آگیا۔ ہم نے کبھی انہیں چارپائی کے پائے پر چڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ اب یہ بستروں پر دوڑتے پھرتے ہیں۔ توبہ کر انسان توبہ کر' خود کو اتنا نہ گرا کہ جیتے جی حشرات الارض کی خوراک بن جا۔" انہیں کبھی کی سنی ایک اور بات یاد آئی۔

"میرا باپ کلمہ گو' میری ماں کلمہ گو مسلمان۔۔ مجھے کیوں کہا جارہا ہے کہ میں مسلمان ہوجاؤں۔" ایک احتجاج بھری آواز انہیں یاد آئی۔

"تیرا باپ اور تیری ماں کتنے وقت کے نمازی تھے۔ سال بھر میں کتنا قرآن تلاوت کرتے تھے؟ مال پر زکوة اور جسم کی زکوة کا کتنا اہتمام کرتے تھے۔ حلال اور حرام کی کتنی اور کیسی تمیز تھی تیرے ماں' باپ کو۔۔ اگر تجھے ان سب سوالوں کا جواب نہیں آتا تو میری مان' مسلمان ہوجا۔" ایک بارعب مگر پرسکون آواز ان کے کان میں گونجی اور انہوں نے مضطرب ہوکر پہلو بدلا۔

"پڑھ۔ لاالہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔

اقرار کر اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم اللہ کے رسول ہیں۔

یہ محض لفظوں کا اقرار نہیں ہے۔ یہ حیات انسانی کا چارٹر آف ایکشن ہے۔ سو دل سے اقرار کر اور دماغ سے اس پر غور کر۔"

انہوں نے اپنی چادر سے چہرے پر آتا پسینہ پونچھا۔ ان کا حلق خشک ہورہا تھا۔ انہیں اس میں کانٹے چبھتے محسوس ہورہے تھے۔

"حق ہے' حق ہے' حق ہے' آپ نے جو بھی کہا سب حق ہے۔" ایک اور آواز سنائی دی۔

"آب زم زم میں بھگو کر سکھائی تسبیحاں اور عجوہ کھجور کے ٹکڑے کس کو چاہیے یہ سوغاتیں۔۔ جو توفیق رکھتا ہے ہدیہ دے جائے' جو نہیں رکھتا تبرک کے طور پر لے جائے۔" کسی نے ان کے کان کے قریب ہی صدا

لگائی۔

وہ انتہائی اضطراب کے عالم میں کھڑی ہوگئیں۔ چھت کی منڈیر سے نیچے صحن میں جھاڑو لگاتی سعدیہ پر نظر پڑتے ہی جیسے ان کو وہ سوال یاد آگیا' جو ان کے لاشعور میں چھپا ہر سوچ پر حاوی۔۔ یادوں کی لگام تھامے انہیں پیچھے کو دوڑا رہا تھا۔

"اماں! ہمارے رشتہ دار کہاں ہیں' ابا جی کے بہن بھائی' آپ کے بہن بھائی' میرے دادا' دادی' میرے نانا' نانی سب کہاں ہیں ہم سے ملتے کیوں نہیں' ہمارے پاس آتے کیوں نہیں۔"

پندرہ سالوں میں پہلی بار سعدیہ کے پوچھے اس سوال نے ان کے لاشعور پر ایسا قبضہ کیا تھا کہ سوچ اور خیال کی سب لہریں اسی کی دھار پر بہنے لگی تھیں۔ اپنی سوچوں سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئیں۔ ڈیوڑھی کی نیم تاریکی میں بیرونی دروازے پر پڑی ہلکی دستک کے بعد اس کے خود بخود وا ہوجانے کے ساتھ روشنی کی لکیر اندر آئی۔ چھت کی تیز دھوپ میں چندھیائی آنکھوں کو پھر بھی کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

"السلام علیکم بھین جی!" ان ۔۔۔ کو کھاری کی مانوس آواز سنائی دی۔

"لڈو بانٹیں آج جی۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "آج آپ دا شاگرد پورا جمعہ پڑھ کے آیا اے میت (مسجد) میں۔"

وہ خوشی سے اچھلا پڑ رہا تھا۔ وہ نیلے رنگ کی دھلی دھلائی شلوار قمیص اور سر پر رکھی کروشیے کی سفید ٹوپی پہنے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

"اج مجھ کو کجھ وی نئیں بھولا۔۔ او بھین جی۔۔ اے سب تہاڈا کمال ہے۔" اس کی باچھیں کھلی جارہی تھیں۔ وہ سب کچھ بھلا کر آگے بڑھیں اور انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"جیتا رہ میرے بچے!" ان کی آنکھیں اشکبار ہونے لگیں۔ "میں نے کہا تھا نا کہ کچھ مشکل نہیں' تو سب کرسکتا ہے۔"

انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے قریب آگیا۔ اس کے کپڑوں سے کسی سستے عطر کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس نے بالوں میں بھی غالباً" کوئی خوشبودار تیل لگا رکھا تھا۔ جمعہ کی نماز کے لیے اس کا اس قدر اہتمام انہیں ایک بار پھر اشکبار کرگیا۔

"تو بڑا خوش قسمت ہے کھاری! تجھے اللہ تعالیٰ نے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے سے بچالیا' اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنے راستے کی طرف بلالیا ہے۔ عمل کے راستے پر' سیدھے راستے پر۔" فرط جذبات میں وہ نہ جانے کیا کیا کہے جارہی تھیں۔

"بڑے راستے اور راستوں کی نہ جانے کتنی سمتیں کھوٹی ہوتی ہیں۔ انسان بھٹکتا پھرتا ہے۔ پھر بھی کتنوں کی قسمت میں یہ راستہ نہیں ہوتا۔ کھاری میرے بچے! کبھی مجھ سے پوچھ' یہ راستہ کتنی کٹھنائیوں کے بعد ملتا ہے۔" ان کا دل ساتھ ساتھ ان کے کہے لفظ بول رہا تھا۔

"بس کہانیاں سنائے جانا تم۔" ان کے عقب سے نکل کر سعدیہ سامنے آئی' جو کچھ دیر سے وہیں کھڑی یہ جذباتی منظر دیکھ رہی تھی۔ "لڈو اماں کیوں بانٹیں' تم بانٹو کنجوس کہیں کے۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"بھین جی ہی بانٹیں گی' یہ بڑی ہیں' میں چھوٹا' او میری ماں برابر' میں اوناں کا بیٹا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"بیٹا!" آپا رابعہ نے اس لفظ پر چونک کر کھاری کی طرف دیکھا۔

"ہاں یہ میرے بیٹوں کی طرح ہی تو ہے۔ میں بانٹوں گی لڈو اپنے ہاتھوں سے بنا کر۔" انہوں نے کہا اور سعدیہ نے انہیں چونک کر دیکھا۔ اس کی اماں کے لہجے میں جو تھا' وہ اس نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"توبہ! اس کمرے کے ماحول میں کتنا ڈپریشن ہے۔ یہ بے چاری یہاں پڑے پڑے کوئی اچھی سوچ سوچے بھی تو کیسے۔" ماہ نور نے کمرے کی چاروں دیواروں پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔

"یہ کیوں آگئی دوبارہ یہاں' اس کو یہاں سے کیا لینا ہے۔ یقیناً" میری بے بسی کا نظارہ کرنے میں اسے مزا آرہا ہے' جب ہی تو مسلسل مجھے ہی دیکھے جارہی ہے۔" سارہ نے ناراض نظروں سے اپنے سامنے بیٹھی ماہ نور کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

"شکر ہے ہفتے میں دوسری بار کسی تیسرے ذی روح کی شکل دیکھنے کو مل رہی ہے۔ انسان کب تک کتابوں میں' اخباروں اور رسالوں میں دل لگائے اور بائبل کا مطالعہ کرتا رہے۔ اب تو بائبل بھی پوری کی پوری زبانی یاد ہوگئی۔" سیمی آنٹی خوشی کے عالم میں چائے بناتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

ان تینوں کی سوچ کے رخ مختلف تھے۔ مگر تینوں ایک دوسرے کے متعلق ہی سوچ رہی تھیں لیکن تینوں ایک دوسرے کی سوچ سے بے خبر تھیں۔

"تمہیں یہاں کا راستہ ڈھونڈنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوئی؟" سیمی آنٹی نے گرم چائے کا کپ ماہ نور کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں یہ راستہ بالکل سیدھا ہے۔ کوئی موڑ نہیں' کوئی چوک نہیں' جہاں کنفیوژن ہو کہ کس سمت مڑنا ہے۔" ماہ نور نے چینی کی سفید پیالی میں بنی ننھی سی گڑیا کو دیکھتے ہوئے کہا' جس کے چاروں طرف ننھے ننھے گلابی پھولوں کا حلقہ تھا۔

"ایسا ٹی سیٹ میں نے پہلے کہاں دیکھا ہے۔" وہ یاد کرنے کی کوشش کررہی تھی' مگر اسے یاد نہیں آرہا تھا۔

"لیکن یہ سادہ سی چائے کتنے سلیقے سے پیش کی گئی ہے۔" لکڑی کی منقش کشتی میں چینی کی چھوٹی سی چائے دانی ٹی کوزی سے ڈھکی تھی۔ چھوٹی سی شیشے کی ڈش میں گھر کے بیک کیے ہوئے بسکٹس رکھے تھے۔ وہ ایک دم متاثر ہوگئی۔ سیمی آنٹی شدید قسم کی سلیقہ مند خاتون تھیں۔

"میری لاہور واپسی میں چند ہی دن باقی ہیں' میں نے سوچا ایک بار پھر آپ لوگوں سے ملاقات کرلوں۔" ماہ نور نے مسکرا کر کہا اور سارہ کی طرف دیکھنے لگی جو بے زار اور ناراض نظر آرہی تھی۔

"تم بکس پڑھتی ہو سارہ؟" سیمی آنٹی کسی کام سے کمرے سے باہر گئیں تو اس نے سارہ کو مخاطب کیا۔

"نہیں۔" سارہ نے سخت لہجے میں مختصر جواب دیا۔

"موویز تو دیکھتی ہوگی؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے شوق نہیں۔" اسی لہجے میں جواب آیا۔

"میوزک سنتی ہو؟" اس نے اس سخت لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"میں ایسا کچھ نہیں کرتی جو نارمل انسان کرتے ہیں۔" سارہ نے درشت لہجے میں کہا۔

"نارمل انسان!" ماہ نور نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ "وہ کون ہوتے ہیں۔"

"تم اچھی طرح جانتی ہو' نارمل انسان کیسے ہوتے ہیں۔" سارہ اپنے لہجے کی روکھائی کو قابو نہیں کرپارہی تھی۔

"مثلاً"؟" ماہ نور اٹھ کر سارہ کے قریب آئی۔ سارہ کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھر آیا۔

"مثلاً" تم اور تمہارے جیسے لاکھوں چلتے پھرتے لوگ۔" سارہ کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

"چلتے پھرتے لوگ نارمل ہوتے ہیں۔ یہ تم سے کس نے کہا سارہ؟" ماہ نور نے ایک بار پھر سارہ کے لہجے کی تلخی کو نظر انداز کیا۔ "نارملیٹی کا تعلق جسمانی سے زیادہ ذہنی صحت سے ہوتا ہے میرے خیال میں۔"

"تم ایسا کہہ سکتی ہو۔" سارہ نے نتھنے پھلا کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیونکہ جسمانی صحت سے مالا مال ہو۔

تمہیں اس کیفیت کا اندازہ نہیں' جو جسمانی عارضوں میں مبتلا لوگوں کی ہوتی ہے۔"

"ایسے لوگوں کو جسمانی طور پر صحت مند لوگوں پر رشک آتا ہے یا ان سے حسد محسوس ہوتا ہے؟" ماہ نور نے سوال کیا۔

فوری طور پر سارہ کے ذہن میں اس سول کا جواب نہیں آیا۔ کیونکہ چلتے پھرتے نارمل لوگوں کے متعلق اس نے ماہ نور سے ملاقات سے پہلے اس انداز میں سوچا ہی نہیں تھا۔

"تمہیں شاید انسانی المیوں کی ان گنت قسموں کا پتا نہیں ہے سارہ!" ماہ نور نے نرمی سے سارہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"تم تو بہت خوش قسمت ہو کہ تمہارا خیال رکھنے کے لیے سعد اور سیمی آنٹی موجود ہیں۔ تم نے شاید ری ہیبلیٹیشن سینٹرز میں پڑے بے بس اور بے سہارا لوگوں کو کبھی نہیں دیکھا' جن کو لک آفٹر کرنے کے لیے غصہ کھاتی نرسوں اور بد مزاج وارڈ بوائز کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں ہوتا۔"

ماہ نور نے دیکھا' سارہ کے چہرے کے تاثرات تیزی سے بدلے تھے۔ "یا پھر ان لوگوں کو بھی کبھی نہیں دیکھا۔ جو اس سے بھی بڑھ کر جسمانی عوارض اور معذوری میں مبتلا ہیں اور جن کے پاس علاج کے لیے پیسے ہیں نہ کسی خیراتی ادارے تک دسترس۔ وہ سسکتے ہیں' بلکتے ہیں' جینا چاہتے ہیں' مگر لمحہ لمحہ موت کی طرف بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ موت' جو سب کو آتی ہے' مگر ان پر کیسے آتی ہے' یہ صرف وہی جانتے ہیں جو اس کو اپنی طرف آتے ہوئے اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔"

سارہ نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ ماہ نور سے چھڑایا اور اپنا دھیان دوسری طرف کرلیا۔

"یہ فلیٹ چھوٹا سہی' مگر کتنا آرام دہ ہے۔" ماہ نور نے ایک بار پھر اس کا دھیان اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔

"سیمی آنٹی بظاہر سخت سہی' مگر اندر سے کتنی محبت کرنے والی اور نرم دل ہیں۔" اس نے کہا۔

"اور سعد..." ماہ نور نے کہتے کہتے رک کر سارہ کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ سعد کے نام پر سارہ کی تمام تر توجہ اس کی طرف ہوگئی تھی۔

"سعد چاہے دوسروں کے لیے کیسا بھی سہی' مگر تمہارے لیے وہ کتنا عظیم انسان ہے۔"

"سعد نے تمہیں اس لیے یہاں بھیجا ہے کہ مجھے شکر گزاری پر راضی کرنے کی کوشش کرو اور مجھے یقین دلا دو کہ میں بہت سوں سے اچھی ہوں اور مجھے اچھے بچوں کی طرح زندگی گزارنے کی تیاری کرنی چاہیے۔" ماہ نور کے سوال کا جواب ذہن میں نہ آنے پر سارہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے سعد نے تو یہاں نہیں بھیجا۔" ماہ نور نے نرمی سے کہا۔ "اسے تو علم ہی نہیں کہ میں اس وقت یہاں تمہارے پاس موجود ہوں۔"

"جتنی تم سعد سے قریب ہو' جتنی تم لوگوں کی ایک دوسرے سے دوستی ہے اور انڈر اسٹینڈنگ بھی... میں مان ہی نہیں سکتی کہ سعد کو علم نہ ہو کہ تم یہاں موجود ہو اس وقت۔" سارہ کے لہجے میں عجیب سی پھنکار شامل ہوگئی۔

"اوہ!" ماہ نور نے بے اختیار کہا اور پھر چند لمحوں کے لیے کمرے میں خاموشی چھاگئی۔ یہ چند لمحے ماہ نور نے سارہ کے لہجے میں چھپے جذبات پر غور کرنے میں لگائے تھے۔ "تو یہ معاملہ ہے۔" ان چند لمحوں کے اختتام پر ماہ نور کی سمجھ میں آیا۔ سارہ کے لہجے کی چبھن' طنز' غصے اور پھنکار میں کون سا جذبہ جھلکتا تھا' رشک کا یا حسد کا' وہ اگرچہ فوری طور پر فیصلہ نہ کرپائی تھی۔ مگر جو بھی جذبہ تھا' اس کی وجہ سمجھ چکی تھی۔

"میری اور سعد کی دوستی۔ میری اور اس کی انڈر اسٹینڈنگ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے سارہ! سعد سے

میری ملاقات صرف چند دن پہلے ہوئی ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت کم جانتی ہوں۔"

ماہ نور کی بات کے ردِعمل میں بستر پر نیم دراز سارہ نے سر اٹھا کر ماہ نور کی طرف دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ ماہ نور کے لہجے میں اور چہرے پر سچائی کی جھلک تھی۔ اس کے حلق میں اگے کانٹے جیسے اچانک سے ایک ایک کر کے غائب ہونے لگے۔

"ہم ایک فنکشن میں اتفاقاً" ملے' باتوں باتوں میں سعد نے تمہارا ذکر کیا۔ مجھے تم سے ملنے کا اشتیاق ہوا اور میں نے اس سے کہا کہ مجھے تم سے ملوائے۔ میں اس جگہ کے راستوں سے ناواقف ہوں۔ اسی لیے اس روز سعد کے ساتھ آئی تھی۔ اب راستے کا علم ہو گیا' اسی لیے اکیلی آگئی۔" ماہ نور کہہ رہی تھی اور سارہ کے حلق سے لے کر سینے تک کی جلن پر ٹھنڈ پانی کے چھینٹے سے پڑ رہے تھے۔

"چند دن بعد میں لاہور واپس چلی جاؤں گی' اسی لیے سوچا تم سے ایک بار پھر مل لوں کیونکہ تم مجھے بہت اچھی لگی ہو' لیکن لگتا ہے تمہیں میرا آنا پسند نہیں آیا۔" ماہ نور نے کہا۔

"نہیں' بالکل بھی نہیں۔" سارہ نے شیریں لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اچانک بدل گئے تھے۔ اس کے لہجے میں حلاوت اتر آئی تھی۔

ماہ نور کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا' اسے سارہ کے لہجے کی تلخی کی اصل وجہ سمجھ میں آچکی تھی۔

"تم بھی بہت اچھی ہو۔" اب کے سارہ نے ماہ نور کا ہاتھ تھاما۔

"اور تم بہت اچھی باتیں کرتی ہو' تم ٹھیک کہتی ہو مجھے اندازہ نہیں کہ چلتے پھرتے نارمل انسانوں کو کیسے کیسے ذہنی عوارض لاحق ہو سکتے ہیں۔" سارہ کا ماہ نور کے ساتھ رویہ لمحوں میں بدلا تھا۔

"جب میں بالکل ٹھیک تھی اور سرکس میں کام کرتی تھی تو مجھے یاد ہے میں نے چند ایسے لوگ دیکھے جو جسمانی طور پر بالکل فٹ تھے مگر ان کے ذہن نارمل نہیں تھے۔" وہ انتہائی دوستانہ انداز میں ماہ نور کو بتانے لگی۔

"وہ کیا کرتے تھے۔" ماہ نور نے پوچھا۔

"وہ سرکس کے ٹرینر تھے اور معمولی سی غلطی پر کھال ادھیڑ دیا کرتے تھے۔" سارہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ "جانوروں کی بھی اور انسانوں کی بھی۔"

"او میرے خدا!" ماہ نور نے بے اختیار کہا۔

"کتوں کو یہ سکھانا کہ وہ آگ کے شعلے نچاتے رنگ کے اندر سے گزر جائیں' ہاتھیوں کو چھوٹی چھوٹی چوکیوں پر پاؤں رکھ کر کرتب سکھانے کی تربیت دینا اور شیروں کو اس حکم کے تابع کر لینا کہ وہ انسانی اشاروں پر ناچنے لگیں۔ یہ دنوں میں نہیں ہو جاتا۔" "اس کے لیے مہینے چاہیے ہوتے ہیں اور ان مہینوں کے دوران ان کتوں' ہاتھیوں اور شیروں پر کیا گزرتی ہے ہم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔"

"اور جانوروں کو سدھانے والے انسان؟" اس نے مارے خوف کے آنکھیں بند کر لیں۔

"وہ انسان نہیں ہوتے ماہ نور۔۔۔ کبھی چاہو بھی تو ان کے بارے میں جاننے کی کوشش مت کرنا۔"

ماہ نور ساکت کھڑی سارہ کی باتیں سن رہی تھی۔ دونوں کے درمیان کھڑا بے نام فاصلہ لمحوں میں طے ہوا تھا اور اب وہ پری کے سارہ خان بننے کی داستان سن رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پتا نہیں کیوں' مجھے یقین نہیں آرہا کہ یہ تم ہو۔" سعد نے یہ جملہ اس گفتگو کے دوران تین مرتبہ دہرایا تھا' جو اس کے اور نادیہ کے درمیان اسکائپ پر ہو رہی تھی۔

"کیوں۔ کیا میں بہت بدل گئی ہوں۔" نادیہ نے تیسری بار اس کے ایسا کہنے پر کہا۔ سعد نے اپنی نظروں کے سامنے موجود اسکرین پر نظر ڈالی۔ اس کی سرخ و سفید رنگت زرد پڑ چکی تھی۔ اس کا صحت مند چہرہ کمزور ہو گیا تھا۔ اتنا کمزور کہ اس کے گالوں کی ہڈیاں نمایاں نظر آرہی تھیں۔ جبڑے کی ہڈیاں کھچی ہوئی لگ رہی تھیں اور چہرہ لمبوترا ہو رہا تھا ——— نادیہ نے اپنے سیاہ بالوں کو باندھ رکھا تھا۔ سعد کو ایسا بھی لگ رہا تھا جیسے اس کی سبز آنکھیں بجھی ہوئی تھیں۔

"ہاں تم بالکل بدل گئی ہو' اتنی کہ مجھے تمہیں پہچاننے میں تامل ہو رہا ہے۔" سعد نے کہا۔ جواب میں نادیہ نے اپنی آنکھیں جھپکیں اور مسکرا دی۔

"جبکہ تم ویسے کے ویسے ہی ہو۔ اتنے کہ میں تمہیں ہزاروں کے مجمع میں بھی پہچان سکتی ہوں۔"

"لیکن مجھے تمہارا اتنا بدل جانا ہضم نہیں ہو پا رہا نادیہ!" سعد کو لگا وہ زبردستی مسکرا رہی تھی۔

"تمہارے چہرے پر مسلسل مشقت کے آثار ہیں اور تم اپنے اندر موجود کسی دکھ کو چھپا نہیں پا رہی ہو۔"

"اوہ!" نادیہ نے جھرجھری لے کر کہا۔ "تم ابھی بھی ویسے ہی اسٹریٹ فارورڈ ہو' ویسے ہی آؤٹ اسپوکن جو دل میں آئے کہہ دینے والے۔"

"ہاں تم جانتی ہو۔ میں ایسا ہی ہوں۔" سعد نے سر ہلایا۔

"یہ بتاؤ تمہاری ممی کہاں ہیں۔" پھر اس نے پوچھا۔

"وہ وہیں ہیں شکاگو میں اپنے ہزبینڈ اور بچوں کے ساتھ۔" وہ ایک دفعہ پھر زبردستی مسکرائی تھی۔

"تو تم ان کے ساتھ کیوں نہیں ہو؟" سعد نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "وہ تمہیں اپنی بیٹی کہہ کے لے کر گئی تھیں اور شاید تمہیں یاد ہو کہ اس کے علاوہ انہوں نے ڈیڈی سے تمہارے بارے میں کیا کہا تھا۔"

نادیہ نے جیسے خلاؤں میں کچھ دیکھا۔ "بہت اچھی طرح یاد ہے۔ جب ہی تو مجھے لگتا ہے کہ جیسے میری کوئی شناخت نہیں ہے' جب ہی تو لگتا ہے کہ جیسے جب تک میری زندگی ہے میں خود ہی اپنے لیے سب کچھ رہوں گی۔"

"تم نے یہ سب کیوں قبول کیا؟" وہ غصے میں اس سے سوال کر رہا تھا۔ "تم نے ڈیڈی سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔" "اب جبکہ تم بڑی ہو چکی ہو اور باشعور ہو۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے تو تم نے یاد دلایا کہ ممی نے ڈیڈی سے میرے بارے میں کہا تھا۔۔۔" نادیہ نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا اور سر جھکا لیا۔ "اس کے بعد ڈیڈی کے میرے بارے میں کیا جذبات ہوں گے' کیا مجھے اندازہ نہیں۔ میں کس برتے پر ان سے رابطہ کرتی۔" کچھ دیر بعد وہ سر اٹھا کر بولی۔

"لیکن میں تمہیں ایسی صورت حال میں پھنسے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔" سعد نے کہا۔ "اس سے پہلے میں بالکل بھی اندازہ نہیں کر پایا تھا کہ تم ان حالات میں رہ رہی ہو۔ آخر تم نے پڑھنے کے لیے فن لینڈ کا ہی انتخاب کیا۔ وہاں زندگی بہت ٹف ہے اور بیرون ملک سے آئے ہوئے اسٹوڈنٹس کے لیے تو بے حد زیادہ ٹف' میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"تم جذباتی ہو رہے ہو اور مجھے علم ہے جذباتی ہو کر تم اکثر کچھ زیادہ ہی غصہ کھا جاتے ہو۔" وہ نرمی سے مسکرائی۔

"لیکن کیوں' آخر کیوں تم نے؟" سعد نے اس کی کہی بات نظر انداز کر دی۔

"کیونکہ مجھے اس کے علاوہ کچھ نہیں سوجھا۔ ممی کا ہزبینڈ مجھ پر بری نظر رکھ رہا تھا اور میرے کریڈٹ میں بہت کم پیسے تھے۔ مجھے وہاں سے نکلنے کا جو بھی راستہ سوجھا' میں نے اندھوں کی طرح اس کو اپنا لیا۔ جب عمر اور تجربہ دونوں ہی کم ہوں تو انسان ایسے ہی احمقانہ فیصلے کرتا ہے۔ اور اب تو ایڈجسٹ کر چکی ہوں' مجھے یہ مشکل نہیں لگتا'

جب ہی تو تمہارے سامنے موجود ہوں۔"

سعد نے سر پیچھے کر کے چھت کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس نے نہیں کہا۔

"اور دیکھ لو' اتنے سالوں کے بعد انٹرنیٹ پر دماغ کھپا کھپا کر میں نے ہی تمہیں ڈھونڈا اور تم سے رابطہ ہونے سے پہلے نہ جانے کتنے سعد سلطانوں سے مجھے ٹکرانا پڑا۔۔۔ تم کو تو شاید میں یاد بھی نہیں تھی۔" پھر نادیہ نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔

"تمہیں تو میں یاد تھا نا؟" سعد نے اپنے رنج کو مسکراہٹ میں دبا کر کہا۔

"ہاں' تم مجھے کبھی نہیں بھولے۔" نادیہ نے کہا اور آنکھیں میچ لیں۔ "اس لیے ہینڈسم! کہ اس پوری دنیا میں تم سے زیادہ عزیز مجھے کوئی نہیں ہے۔ میں دن کے کسی ایسے لمحے کو شاید نہ یاد کر پاؤں' جب تمہارا خیال میرے لاشعور میں موجود نہ ہو' میں ہر رات سونے سے پہلے تمہارے ساتھ گزرے وقت کو یاد کر کے سوتی ہوں اور ہر صبح کا آغاز تمہاری یاد سے کرتی ہوں۔" وہ کہے جا رہی تھی اور سعد ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

"اس لیے میرے پیارے بھائی! کہ مجھے تم سے شدید محبت ہے۔" سعد اسے دیکھ رہا تھا۔ جب اچانک وہ اسکرین سے غائب ہو گئی۔ اس کے غائب ہو جانے پر اس نے تیزی سے اپنا آئی فون اٹھایا' مگر پھر مایوس ہو کر اسے ایک سائیڈ پر رکھ دیا۔

"اس لیے کہ مجھے تم سے شدید محبت ہے میرے پیارے بھائی!"

"میں نے ہی تمہیں ڈھونڈا۔۔۔ تمہیں تو میں شاید یاد بھی نہیں تھی۔"

اسے نادیہ کے کہے الفاظ یاد آئے' پھر اس نے گردن موڑ کر اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے فوٹو فریم کی طرف دیکھا۔ جس میں ایک سرخ و سفید رنگت سیاہ بالوں اور سبز آنکھوں والی بچی سرخ پھول دار فراک اور سرخ چمکتے شوز پہنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

بازاروں میں بلا کی بھیڑ تھی۔ بقر عید کے سلسلے میں لوگوں کی کثیر تعداد شاپنگ کے لیے بازاروں میں موجود تھی اور اسی بھیڑ سے فائدہ اٹھانے کے لیے گداگروں کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ چند ایک گداگر ایسے بھی تھے جنہوں نے بازاروں میں مخصوص اور اہم جگہوں پر پکے ڈیرے لگا رکھے تھے۔ محتاجی' معذوری اور فاتر العقلی کا مظاہرہ کرتے یہ گداگر اپنے پیشے کے ماہر تھے۔ دن بھر میں اچھا خاصا کما لیتے اور مہینے بھر کے بعد ان میں سے اکثر اپنی پوٹلیاں سنبھالے بینکوں کے دروازوں سے اندر داخل ہوتے دکھائی دیتے تھے۔

جیناں بھی انہی گداگروں کے قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے اضافی کمالات میں لکڑی کی ایک چھوٹی سی ہتھ گاڑی میں پڑا چند ماہ کا ایک بچہ تھا۔ بچے کے جسم پر ناکافی کپڑے تھے اور اس کے منہ سے ٹپکتی رال پر مکھیاں بیٹھتی تھیں۔ یہ بچہ جیناں کی بے بسی کی علامت بنا ہتھ گاڑی میں سارا سارا دن پڑا رہتا تھا۔ ناکافی دودھ اور دن بھر کی مشقت کے باعث اس کا جسم ناتواں ہو چکا تھا اور اس کے سینے اور پسلیوں کی ہڈیاں صاف نظر آتی تھیں۔

اس روز بھی گداگر قبیلے کے تمام پیشہ ور اپنے اپنے مخصوص انداز میں اپنے دھندے میں مگن تھے۔ جب اچانک نگرانی پر مامور ان کے گروکی صدا دیتی آواز ادھر ادھر گونجی۔ "پولس۔۔۔ پولس" یہ صدا تھی کہ ادھر ادھر ہو جانے کا سگنل۔۔۔ سب گداگر اپنی چھابڑیاں' پیالے اور پوشاکیں سنبھالتے ادھر ادھر موجود تنگ گلیوں میں غائب ہونے لگے۔ ہفتوں نظر اور کان بند کر کے ادھر ادھر پھرتی ان گداگروں کو نظر انداز کرتی پولیس' کسی نئے افسر کے حکم پر اچانک حرکت میں آ گئی تھی۔

جیناں تک یہ سگنل ذرا دیر سے پہنچا۔ وہ ایک سیکنڈ کے اندر اپنی لکڑی کی ٹانگ اتار اصل ٹانگوں پر بھاگتے انداز میں ہتھ گاڑی چلاتی کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ نزدیکی تاریوں والی گلی میں بھی مارکیٹ بن چکی تھی اور بلا کا رش تھا۔ اس کی ہتھ گاڑی جگہ جگہ بھیڑ میں پھنستی اور نکلتی رہی تھی۔ ادھر ادھر خوف زدہ نظریں دوڑاتے وہ بالآخر ایک پتلی گلی ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ گلی اس وقت سنسان تھی۔ اس میں موجود نئی دکانوں کے شٹر گرے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ دکانیں ابھی کرائے پر نہیں چڑھی تھیں۔ زور زور سے ہانپتی جیناں کی سانس سے سانس اس گلی میں آ کر ملی تھی۔

اس نے اپنے چہرے پر آیا پسینہ پونچھا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کسی محفوظ جگہ کو تاڑنے لگی۔ اسی لمحہ اسے اپنے عقب سے بھاری قدموں کی آواز آتی سنائی دی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ قدموں کی آواز آہستہ آہستہ اس کے عین کان کے قریب آ گئی تھی۔ اس نے گردن گھما کر خوف زدہ نظروں سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے سر پر بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیتا پولیس والا سفید کلف لگے شلوار قمیص میں ملبوس ایک شخص کے ساتھ کھڑا تھا۔

"بڑی پھرتیلی ہے تو الو کی پٹھی!" پولیس والے نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی جیناں کے حلق پر رکھتے ہوئے کہا اور زور سے چھڑی پر دباؤ ڈالا۔

"او کدھر سے اٹھایا ہے یہ بچہ؟" پھر اس نے چھڑی اس کے شانے پر مار کر پوچھا۔

"آرام سے جوان! آرام سے۔" سفید شلوار قمیص والا بولا۔ "اسے تھانے لے چل اور وہاں پوچھ آرام سے۔" اس نے کہا۔

"چل پکڑ اس حرام کے جنے کو۔ اور ناک کی سیدھ چلی چل۔" پولیس والے نے ایک بار پھر جیناں کے شانے پر چھڑی برساتے ہوئے کہا۔

مردہ قدموں سے ہتھ گاڑی چلاتی جیناں پولیس والے کے پیچھے چلی۔ سفید شلوار قمیص والا اس کے پیچھے تھا۔

"خبیث کی اولاد' کتے کا بچہ۔" جیناں دل ہی دل میں گالیاں دے رہی تھی۔ "سارا دن دھندے کا پڑا الگ اور ان کم بختوں سے ہڈیوں کی تڑوائی الگ ہو گی۔ نہ جانے کس نحس کا منہ دیکھا تھا صبح سویرے۔" انہی سوچوں میں گم چلتی وہ تھانے تک پہنچ چکی تھی۔

اس شام جیناں اپنی ہڈیاں سہلاتی تھانے سے خالی ہتھ گاڑی چلاتی باہر نکلی تھی۔ وہ بچہ جو اسے کمالے نے بس اسٹاپ سے اٹھا کر دیا تھا۔ اسے سفید شلوار قمیص والا ساتھ لے گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں آج کل کیلنڈر پر نظر نہیں ڈالتا۔" سعد نے ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا کیوں؟" ماہ نور نے اپنے بازو میں بڑا سفید چوڑا سا کڑا گھماتے ہوئے پوچھا۔ اس روز سعد نے اسے ایک ایسی آرٹ اکیڈمی دکھائی تھی جو ایسے بچوں کو تعلیم دے رہی تھی جن کے پاس وسائل تھے نہ رسائی' صرف پیدائشی ہنر تھا۔

"کیونکہ دن گزرتے جا رہے ہیں' بلکہ ہاتھوں سے پھسلتے جا رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔" ماہ نور نے تعجب سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" سعد نے سر جھٹکا اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیسی لگی تمہیں یہ اکیڈمی۔"

ماہ نور کا ذہن اس کی مبہم سی بات میں الجھا ہوا تھا لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ سعد اس موضوع پر مزید

بات نہیں کر رہا تو اس نے بھی اس بات پر سوچنا موخر کر دیا۔
"بہت اچھی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔
"ویسے تمہیں ایسی جگہوں کا علم کیسے ہے؟" پھر ماہ نور نے سعد کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے' ایسی گمنام سی جگہوں کا۔"
"نامور جگہوں اور نامور لوگوں کے بارے میں تو سب ہی جانتے ہوتے ہیں' گمنام جگہوں اور لوگوں کے بارے میں جاننا پسندیدہ مشغلہ ہے۔"
"اچھا مشغلہ ہے۔" ماہ نور نے کہا۔ "ویسے تمہارے مشاغل کچھ عجیب و غریب سے نہیں ہیں۔"
سعد ہنس دیا۔ "سوچ لو! میرے مشاغل کو عجیب و غریب قرار دینے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو۔"
"اور تمہاری باتیں بھی مبہم سی ہوتی ہیں۔" ماہ نور نے منہ بنا کر کہا۔ "دراصل مجھے پزلز' بھول بھلیاں' پہیلیوں اور اسرار میں کچھ دلچسپی نہیں۔"
"اوہ! میں معذرت خواہ ہوں پھر تو۔" سعد نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔
"اختر سے ملنا پسند کرو گی۔" پھر اسٹیرنگ گھماتے ہوئے اس نے اچانک پوچھا۔
"اب یہ اختر کون ہے۔" ماہ نور نے بھویں اچکا کر ایسے سوال کیا۔ جیسے پوچھ رہی ہو تمہارے شعبدوں کے سلسلے کی کوئی انتہا بھی ہے۔
"ہے ایک اللہ کا بندہ۔" وہ مسکرایا۔ اس کی باتیں دلچسپ ہوتی ہیں اور قابل غور بھی۔
"لیکن اس سے ملاقات کی ایک شرط ہے جو ذرا کڑی ہے۔"
"وہ کیا ہے۔"
"کاڑھے کا پیالہ پینا پڑتا ہے اختر سے ملنے کے لیے۔"
ماہ نور نے جھرجھری سی لی۔ "یہ کاڑھا کیا ہوتا ہے۔"
"پی کر دیکھنا پتا چل جائے گا۔" سعد نے گاڑی کا رخ مخالف سمت موڑتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

"بندہ جب سر جھکا لیتا ہے' جب سجدہ ریز ہو جاتا ہے تو اپنی "میں" کی نفی کا اعتراف کر لیتا ہے۔" ان کے سامنے بیٹھے شخص نے کہا۔ اس شخص کے چہرے کا رنگ گندمی تھا' چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ آنکھوں میں سرخی تھی مگر اس کے بات کرنے کا انداز بے حد مہذب تھا۔
"پھر یہ نفی بھی کئی قسم کی ہوتی ہے۔ کبھی وقتی' کبھی مستقل' کبھی آدھی' کبھی پوری۔" وہ کہہ رہا تھا۔
"آپ باؤ صیب بڑے برے پھنسے ہوئے ہو۔" اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں سعد کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔
"کبھی ادھر کھینچتے ہو کبھی ادھر' سمجھ آپ کو بھی نہیں آتی کہ کدھر کا رخ کرو' آپ کی پوری نفی' آدھی ہو جاتی ہے اور مستقبل کا عہد وقتی بن کر رہ جاتا ہے۔"
سعد نے اثبات میں سر ہلایا۔
"کوشش تو کرتا ہوں کہ سمجھ پاؤں۔" اس نے آہستہ آواز میں کہا۔
"کوشش بھی نہیں ہو گی اب باؤ صیب آپ سے۔" اس شخص نے ہولے سے مسکرا کر کہا۔ "یا تو زن پا لو یا پھر من پا لو۔" اس نے ایک سرسری نگاہ ماہ نور پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔" سعد نے اب کے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"ہمیں بتاتے ہو صیب۔" وہ شخص مسکرایا۔ "ہم اللہ سائیں کے عاجز اور گناہ گار بندے سہی پر ہمیں اس نے اپنی زمین کے سینے پر خوب پھرایا' پہاڑوں پر ٹھکانے بنائے' کبھی دریاؤں میں بسیرا کیا' اس کے میدانوں میں میل ہا میل پیدل چلے' سمندروں کے سینے چیرے اور اس کے بندوں کو پڑھنے کی کوشش کی' تب پتا چلا کہ نظام کائنات اور کاروبار حیات میں ہر جگہ اس کی کار فرمائی ہے۔ زندگی کا کوئی انتظام ایسا نہیں جس میں اس نے اپنا آپ عیاں نہ کر رکھا ہو' نظر ہر کسی کو عطا نہیں ہوتی۔ نظر کا عطا ہو جانا اس کی سب سے بڑی نعمت ہے۔" اس نے اپنی چھوٹی سی گڑگڑی سے کش لگاتے ہوئے کہا۔
"آپ کو عطا ہو گئی نظر۔" سعد نے پوچھا۔
"ہوتی۔" اس نے سر ہلایا۔ "پر کوتاہ ہے' مکمل نہیں' جب ہی تو کبھی کبھی چوک جاتی ہے۔"
"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ آپ کو غلطی لگ رہی ہے۔" سعد نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔
"ہو سکتا ہے۔" اس شخص نے جس کا نام اختر تھا' بے نیازی سے کہا۔ "پر فقیر کا دل جس بات پر فیصلہ صادر کرے' وہ ہوتی ہے۔ اس میں زیر زبر کا فرق نہیں ہوتا۔"
"ہے بی۔" سعد نے شانے اچکائے۔ وہ شخص ہولے سے ہنسا۔ "زن اور من دونوں ساتھ ساتھ پنپ نہیں پاتے باؤ صیب!"
"آپ مجروی کا سبق پڑھا رہے ہو سائیں جی۔"
"نہیں۔" اس نے سر ہلایا۔
"مجروی ہمارا شیوہ نہیں' پر ایک کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ یہ فیصلہ تو کبھی جا کر آپ کو کرنا پڑے گا۔"
"دیکھیں گے۔" سعد کہہ رہا تھا اور ماہ نور اپنی آنکھیں پوری کھولے اپنے سامنے کا منظر دیکھ رہی تھی اور ہونقوں کی طرح وہاں ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ وہ شخص جس کا نام اختر تھا ہاتھ میں چھوٹی سی گڑگڑی پکڑے عجیب سی گفتگو کر رہا تھا۔ ماہ نور کو اس شخص اور سعد سلطان کے درمیان کوئی تعلق جوڑنے میں دقت ہو رہی تھی۔
"بی بی صیب! آپ کا من بڑا صاف ہے اسی لیے بڑا شانت بھی ہے۔" اچانک وہ شخص ماہ نور سے مخاطب ہوا۔
"آپ کے دل میں نہ حسد ہے نہ رشک ہے' آپ کی زندگی میں کوئی بغض نہیں ہے اسی لیے آپ کی زندگی بڑی پر سکون ہے۔" وہ کہے جا رہا تھا۔
"مگر۔" اس نے گڑگڑی کا کش لیا۔ "آگے آپ کے لیے دشواریاں ہیں اور کٹھنائیاں بھی۔"
ماہ نور ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔
"آپ چاہیں گی بھی تو اس سے فرار ممکن نہیں۔" اس نے کہا۔ ماہ نور بے اختیار اس سے کچھ پوچھنے لگی مگر اسے اپنے ہاتھ پر ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا وہ سعد تھا جو اسے منع کر رہا تھا۔
"آپ کی ذات بہت سے غیر متوقع کام کرنے والی ہے' خود کو ذہنی طور پر تیار کر لو۔" اس شخص نے کہا۔
"اب ہمیں اجازت دیں سائیں جی!" سعد ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
"ہاں جائیں آپ باؤ صیب!" وہ شخص مسکرایا۔ "پر یاد رکھو حقیقت سے فرار' ہونی کو انہونی نہیں بنا سکتا۔"
"اللہ حافظ سائیں جی!" سعد کٹیا سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔
"آپ کو اللہ سلامتی دے باؤ صیب! اللہ حامی و مددگار ہو
فکر مت کرنا' آپ کے من تک راستہ آپ کو ضرور ملے گا۔"
"ہوں۔" سعد نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

"خبطی ہے۔ سرپھرا اور من موجی۔" باہر نکل کے سعد نے ماہ نور کو تسلی دینے کے سے انداز میں کہا۔ جس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔
"میں معذرت خواہ ہوں۔ میں نے غلط کیا جو تمہیں یہاں لے آیا۔"
"نہیں۔ تم نے بہت اچھا کیا۔" ماہ نور نے پُریقین لہجے میں کہا۔
"یہ شخص خبطی ہے نہ سرپھرا اور تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو' مجھے یوں تسلیاں مت دو۔" ماہ نور کی بات پر سعد چونک گیا۔ اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
"ارے یہاں ایک بالکا تھا سائیں کا۔ وہ کدھر گیا؟" اس نے بات بدلی۔ "نہ اس کا الاؤ ہے نہ کاڑھا۔"
پھر اس نے جھونپڑی کے عقب میں اسے جا پکڑا۔
"کیا بات سائیں جی! الاؤ کیوں بجھا دیا۔" سعد نے اس لڑکے کے شانے پر ہاتھ رکھا جو بازو ٹانگوں کے گرد باندھے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھا تھا۔

اج سک متراں دی ودھیری اے
اج جندڑی اداس گھنیری اے

اس لڑکے نے سعد کے سوال کے جواب میں کہا' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
"اوہو سائیں جی! کی ہویا؟" سعد گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا۔
"کچھ نئیں ہویا۔ جا نس جا (جاؤ بھاگ جاؤ)" اس لڑکے نے سعد کو جھڑکا۔
"کوئی سوغات دے دیو۔" سعد شاید اس کو بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ لڑکا چپ چاپ اٹھا اور کچھ فاصلے پر رکھی چنگیر میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ اس چنگیر پر دستر خوان رکھا تھا۔
"لے جا فقیر دی سوغات لے جا' فقیر دا ڈیرہ دو دن دا' غیر فقیر کدھرے ہور تے توں کدھرے ہور۔" اس نے چنگیر سے ایک روٹی نکال کر سعد کو پکڑائی۔
"تھینک یو سائیں جی!" سعد نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اسے سلیوٹ کیا۔
"تیرے متھے تے نیلی لڑا نے' تے تیرے بھاگ بڑے اچے نیں۔" (تمہارے ماتھے پر نیلی رگ نمایاں ہے اور تمہارے نصیب بہت اچھے ہیں۔)
"چلو ماہ نور!" سعد نے فوراً قدم آگے بڑھا دیے۔
"نس جا نس جا فقیر دی گل نہ سن نس جا کم بخناوہ" بالکا پیچھے سے بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔
"یہ سب کیا ہے سعد! اور یہ سب کیوں ہے۔" گاڑی میں بیٹھ کر دم لینے کے بعد ماہ نور نے کہا۔
وہ سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔
"تم یہ سب کیوں کرتے ہو۔" ماہ نور نے بے اختیار سوال کیا۔
"ایک ازلی و ابدی تنہائی سے نجات کے لیے ماہ نور!" وہ سیدھا ہو کر بولا۔
"کیوں ہے یہ تنہائی' کیسی ہے یہ تنہائی؟" وہ الجھ کر بولی۔
"بتاتا ہوں۔" اس نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

وہ آنکھیں کیسی آنکھیں ہیں جنہیں تم اب چاہا کرتے ہو؟
تم کہتے تھے۔ میری آنکھیں اتنی سچی' اتنی اچھی ہیں۔
اس حسن اور سچائی کے سوا دنیا میں کوئی چیز نہیں۔
کیا اب ان آنکھوں کو دیکھ کے بھی
تم فیض کا مصرعہ پڑھتے ہو؟

کبھی یہ بھی ہوا' کسی لمحے میں تم سے روٹھ کے وہ آنکھیں رو دیں۔
اور تم نے اپنے ہاتھ سے ان کے آنسو خشک کیے۔
پھر جھک کر ان کو چوم لیا۔ (کیا ان کو بھی؟)
"وہ ایک بار پھر خود سے بچھڑی ہوئی تھی۔ ایک بار پھر اس پہ آذر کی یادوں کا حملہ تھا۔ وہ بے بسی سے سسک اٹھی۔ دس سال کم تو نہیں ہوتے کسی کو

بھلانے کے لیے۔ وہ بھی کسی بے وفا کو بھلانے کے لیے مگر پتہ نہیں وہ کیوں اس معاملے میں اتنی بے بس تھی۔ یادیں تھیں کہ آکٹوپس جو جکڑ لیتی تھیں خون چوستی تھیں۔ وہ آنسو بہا رہی تھی جب دروازہ کھلا اور نوریہ نے اندر جھانکا۔

"بجو! اتنا اندھیرا! اف سو تو نہیں رہیں؟ بھول گئیں آج شاہ بخت کو آنا تھا محترم تشریف بھی لے آئے ہیں۔ آیئے نا ملیں اس سے، بجی اتنا ہینڈسم ہو رہا ہے نا کہ مجھے تو یقین ہی نہ آ رہا تھا' یہ وہی سوکھا سڑا سا شاہ بخت ہے جسے ہم سب شاہو کہا کرتے تھے۔"

لائٹ آن کر کے وہ تیز تیز بولتی اس تک آئی تب تک ماریہ آنسو پونچھ کر خود کو نارمل کر چکی تھی۔ اور جب وہ بغیر کسی پس و پیش کے نوریہ کے ساتھ لاؤنج میں آئی شاہ بخت کو سب گھر والوں کے درمیان گھر سے ہنستے مسکراتے پایا۔

"السلام علیکم میم! ہاؤ آر یو؟"

وہ اٹھ کر اس کے سامنے جھکتے ہوئے شوخی و شرارت سے بولا تھا' ماریہ مسکرا دی۔

"تم بھی تک نہیں بدلے' بالکل ویسے ہی ہو۔"

"آپ تو بدل گئی ہیں۔" شاہ بخت نے اس کے ملگجے سے حلیہ کو دیکھ کر منہ بنایا۔

"ہاں۔ بڈھی ہو گئی ہوں نا۔" وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنسی' اس بات پر دھیان دیے بغیر کہ اس کی اس بے رنگ ہنسی اور تکلیف دہ جملے نے ماما' پاپا کے ساتھ تاؤجی کے بھی چہرے پہ تاریک سائے لہرا دیے ہیں۔

"خوامخواہ بڈھی ہو گئی ہیں۔ بڈھے ہوں آپ کے دشمن! ارے آپ کی تو بس روح بڈھی ہو گئی ہے' اسے بھی ہم جوان کر لیں گے کیوں چاچو!؟"

وہ اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے پاپا کی تائید چاہنے لگا۔ وہ محض اداسی سے مسکرا دیے۔

"آپ کو پتہ ہے میں آپ کے لیے پنک کارڈیگن لایا ہوں۔ ابھی پہن کر دکھائیں مجھے۔"

وہ بیگ کھولتے ہوئے بولا تو ماریہ گھبرا اٹھی۔

"نہیں ابھی نہیں' پھر پہن لوں گی۔"

اس کے ہاتھ سے پیکٹ لیتے ہوئے وہ جلدی سے بولی تو شاہ بخت کا چہرا اتر گیا۔

"ایز یو وش!" اس نے نرمی سے کہا تھا۔

"آپ کو پتہ ہے ماریہ! آپ پہ پنک کلر کتنا سوٹ کرتا ہے؟"

شام کو جب وہ سب لوگ لان میں چائے پی رہے تھے تب شاہ بخت نے اچانک اسے نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے اتنی بے ساختگی سے کہا تھا کہ ماریہ سب کے سامنے خفیف سی ہو گئی۔ جب سے آزر نے اس کے ساتھ یہ کیا تھا وہ بہت محتاط زندگی گزارنے کی قائل ہو گئی تھی۔

"تم بھی نوری کی طرح سے مجھے بجو کہا کرو شاہو! بہت بڑی ہوں تم سے۔"

اس کے رسانیت سے کہنے پہ وہ کھی کھی کرنے لگا۔

"چاچو! سنی آپ نے محترمہ کی بات۔ بجو کہا کروں! دیکھنے میں صاف چھوٹی لگتی ہیں مجھ سے۔"

"لیکن میں تم سے چھوٹی ہوں نہیں۔ سمجھے۔"

اس نے جتا کر کہا اور ایک جھٹکے سے وہاں اٹھ گئی۔ سب بے حد خاموش بیٹھے تھے۔

آزر شاہ بخت کا بڑا بھائی تھا۔ ماریہ ایف ایس سی میں تھی جب آزر کی خواہش پہ ہی اس کو آزر کے ساتھ منسوب کر دیا گیا۔ دو سال بعد جب وہ ہائر اسٹڈی کے لیے ملک سے باہر جا رہا تھا تب سب کی باہم رضا مندی سے دونوں کا نکاح کر دیا گیا۔

طے یہ پایا تھا کہ اگر آزر کا وہیں جاب کا ارادہ ہو تو بعد میں ماریہ کو بھی وہیں بھیج دیا جائے گا۔ مگر وہاں جا کے آزر کی پسند اور خیالات بدل گئے۔ اس نے نا صرف وہاں شادی کی بلکہ ماریہ کو بھی طلاق کی صورت آزادی کا پروانہ بھیج دیا۔ وہ ماریہ کو خوامخواہ اپنا پابند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس حادثے نے ماریہ کو اتنی بری طرح سے توڑ پھوڑ ڈالا کہ وہ بہت عرصہ تک نہ سنبھل پائی۔

پاپا اور تاؤ کے سمجھانے پہ اس نے ادھوری تعلیم مکمل کر لی اور کالج میں لیکچرار بھی ہو گئی مگر وہ دوبارہ شادی کے بندھن میں بندھنے کو تیار نہ ہو پائی۔ بہت سے رشتے آئے مگر پاپا چونکہ اس کے ساتھ زبردستی نہیں کرنا چاہتے تھے جب ہی کسی کو بھی ہاں نہیں کہی گئی۔

پچھلے سال نوریہ کی بھی نسبت طے ہو گئی تھی۔ عنقریب شادی تھی۔ مگر ماریہ تھی کہ ابھی تک آمادہ نہیں تھی۔

"ماریہ! آپ کو پتہ بھی ہے' مجھے آپ کے ہاتھ کے کھانے کتنے پسند ہیں پھر بھی آپ نے ابھی تک میرے لیے کچھ نہیں بنایا۔"

لان میں جھولے پہ بیٹھی وہ شام کے ڈھلتے سایوں کے ساتھ پرندوں کو آشیانوں کی جانب لوٹتے دیکھ رہی تھی جب شاہ بخت اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے شاکی انداز میں بولا۔ وہ چونکی پھر اس کا دل رکھنے کو بولی تھی۔

"سوری شاہو! مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ بتاؤ کیا کھاؤ گے' میں ابھی بناتی ہوں۔"

وہ اسی لمحے اٹھ کھڑی ہوئی تو شاہ بخت کھل اٹھا۔

"گڈ! یہ ہوئی نا بات۔ کل آپ تیار رہیے گا ہم پکنک کے لیے فارم ہاؤس جا رہے ہیں۔" وہ اس کے ساتھ ہی کچن میں چلا آیا تھا۔

"آپ کو پتہ ہے ماریہ! آپ کی مسکراہٹ کتنی حسین ہے' جس سے ایک عرصے سے آپ نے اپنے پیاروں کو محروم کر رکھا ہے۔ مجھے بتائیں آپ کے چہرے پر وہی مسکراہٹ سجانے کے لیے مجھے کیا کرنا پڑے گا۔" وہ ایک دم ہی سنجیدگی سے بولا۔ ماریہ کے چہرے پہ اضمحلال بکھر گیا۔

"تم کیا کر سکتے ہو بھلا؟"

"ضروری تو نہیں ہے ماریہ! کہ ہر زخم اسی مرہم سے بھرے جو ہم اپنے لیے موثر سمجھتے ہوں۔"

"کیا مطلب؟" ماریہ بہت زور سے چونکی۔

"آپ بھائی کو بھول کیوں نہیں جاتیں؟"

"میں اسے یاد کب رکھے ہوئے ہوں' مجھے نفرت ہے اس سے۔" وہ شدت جذبات سے چیخ اٹھی۔

شاہ بخت نے بے اختیار تسلی کی خاطر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ مگر ماریہ نے زور سے اسے جھٹک دیا تھا۔

"تم جاؤ یہاں سے۔ بھائی ہو نا اس کے' اس سے مختلف کیسے ہو سکتے ہو۔ میرے زخموں کو کریدنے آئے ہو؟" وہ برہمی' نفرت اور شقاوت سے چیخنے لگی۔

شاہ بخت ہونٹ بھینچے اسے دیکھے گیا تھا پھر تحمل سے گویا ہوا تو لہجے میں سنجیدگی کے ساتھ متانت بھی شامل تھی۔

"نہیں۔ میں آپ کے زخموں پہ مرہم رکھنے آیا ہوں۔ میں آزر کا بھائی ضرور ہوں ماریہ! مگر میں ان جیسا نہیں ہوں میں اپنی بات ثابت کر کے دکھاؤں گا۔"

"کیا کرو گے تم؟" وہ سرد آواز میں بولی تھی۔

"آپ سے شادی کروں گا۔"

شاہ بخت کے منہ سے نکلنے والی بات ماریہ کو گنگ کر گئی۔ اس نے بے اختیار سلیب کا سہارا لیا تھا۔

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اسے روکنا چاہتی تھی مگر شاہ بخت پلٹ کر جا چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آیئے نا' وہاں تک واک کر کے آتے ہیں۔"

کافی کا بڑا سا مگ ہاتھ میں لیے وہ ٹیرس کی ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑی لایعنی سوچوں میں گھری ہوئی تھی جب اپنے کمرے سے نکلتا ہوا شاہ بخت اسے وہاں دیکھ کر اسی سمت چلا آیا۔ ماریہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا پھر بے نیازی سے منہ پھیر لیا۔

"کیا سوچنے لگیں۔ ہر بات کو اتنا نہیں سوچتے پاگل لڑکی! وقت تیزی سے گزر جاتا ہے۔" اس کے لہجے میں معنی خیزی در آئی۔

"وقت گزر چکا ہے۔" وہ جیسے اس کو جتا کر بولی۔

"نہیں میں نہیں سمجھتا۔" اس کا لہجہ ہنوز ذو معنی

تھا ماریہ تپنے لگی۔
"تم پاگل ہو۔"
"آپ کی محبت میں۔" وہ برجستگی سے بولا۔
"شاہو! زندگی مذاق نہیں ہے۔"
"میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں آپ سے کہ اسے مذاق سمجھ کر مت برتیں' آپ کو اچھے ساتھی بہترین ہم سفر غمگسار کی ضرورت ہے۔"
"اور وہ تم نہیں ہو سکتے۔" اب کی بار ماریہ نے طنزیہ لہجے میں اس کی بات آگے بڑھائی تھی سو وہ مسکرایا۔
"یہی تو آپ نہیں سمجھتیں۔ وقت ثابت کرے گا کہ میں آپ کے لیے کتنا بہترین شوہر ثابت ہوں گا۔" وہ اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے بولا تو ماریہ جھنجلا گئی۔
"شاہو! مجھے غصہ مت دلاؤ۔ بہت فرق ہے ہماری عمروں میں۔ بہت جلد تمہیں اپنی اس جذباتیت کا احساس ہو گا' تم پچھتانے لگو گے مجھے۔ اور مجھے بتاؤ کیوں کر رہے ہو تم ایسا۔ ہاں ازالہ کرنا چاہتے ہو اپنے بھائی کی زیادتی کا یا پھر ترس کھا رہے ہو مجھ پہ؟"
اس کے لیے یہ بات' بہت اذیت کا باعث تھی کہ شاہ بخت نے اپنی یہ خواہش گھر کے سب بڑوں تک پہنچا دی تھی۔ کیا سوچتے ہوں گے سب؟ میں اور شاہو۔؟ مائی گاڈ!
"ازالہ صرف وہی کر سکتا ہے ماریہ! جس نے زیادتی کی ہو۔ اور میں نے کوئی زیادتی نہیں کی آپ کے ساتھ' جہاں تک ترس کی بات ہے تو کیوں ترس کھاؤں گا آپ پر؟ آپ نہ لپاہج ہیں نہ کم صورت۔"
"پھر اس ہمدردی کی وجہ؟"
"آپ کو یاد ہے میں بچپن سے ہی آپ سے محبت کرتا آیا ہوں اب اگر یہ محبت اپنا انداز بدل گئی ہے تو آپ اتنی خفا کیوں ہو رہی ہیں
جہاں تک عمروں کی بڑائی چھوٹائی کی بات ہے تو ماریہ! عمر آپ کے چہرے پہ نہیں لکھی ہوئی جو لوگ پڑھ لیں گے اگر کسی کو پتہ بھی ہو تو آئی ڈونٹ کیئر۔ میں اس معاملے میں کسی کی نہیں فقط اپنے دل کی سننے کا قائل ہوں۔"

خدشات جھٹک دیں۔ میں دل کی تمام آمادگی سے آپ کو اپناؤں گا۔ اور ہمیشہ یہ دعا مانگوں گا اس سے پہلے کہ آپ کا خدشہ درست ہو مجھے موت آجائے۔ پلیز زندگی خوب صورت ہے' اس کی خوب صورتی سے منہ نہ موڑیں۔ بلکہ آگے بڑھ کر اس کی خوب صورتی کو سمیٹنے کی کوشش کریں۔ پلیز حصار ذات سے نکل آئیں۔"
نرمی و آہستگی سے کہتا وہ دھیرے سے پلٹ گیا۔ وہ بے خیالی میں اس کی بات پہ غور کرتی رہی۔ اس کی آنکھیں کہتی ہیں حصار ذات سے نکلو۔

تمنا میری بن جاؤ شب برباد سے نکلو
کنارہ تھام لو دل کا بھلا دو ہر گلہ شکوہ
کبھی تو ہنس دو' پرانی یاد سے نکلو
خیال یار اچھا ہے مگر جس نے وفا نہ کی
پلٹ کر بھی صدا نہ دو' در فریاد سے نکلو
نہیں کوئی محبت بھی ہجر بھی رفاقت بھی
تو یہ دھڑکا سا کیا ہو' ہم سا کیا ہو' ہم کی گھات سے نکلو

اس نے شاہ بخت کی بھیجی یہ نظم پڑھی اور موبائل واپس رکھتے ہوئے' بہت عرصے بعد دل سے مسکرائی۔
اس کی بات مان لینے کو جی چاہنے لگا تھا۔ ایک عرصہ بتا دیا تھا غم کی ردا میں اب خوشیوں کی نوید پر لبیک کہہ دینا چاہیے اس نے سوچا تھا۔
وہ جانتی تھی وہ عمر کے جس ڈھلکتے حصے میں تھی وہاں کسی کی ایسی انمول چاہت کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔ خوش بختی اس کے در پہ دستک دے رہی تھی' اس نے بڑھ کر دروازہ وا کر دیا۔ تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اللہ کے اس انعام کو دلی آمادگی کے ساتھ وصول کرنا چاہتی تھی۔
اس نے اپنا فیصلہ اللہ پہ چھوڑا تھا اور اللہ کا فیصلہ قبول کرنے میں بھلا قباحت کیسی؟

☆

صباحت یاسمین

آج بلا کی گرمی تھی۔ کچھ تو وہ یونہی تپی ہوئی تھی اور کچھ اس دھینگا مشتی نے تپا دیا' جو آگ جلانے کے دوران اسے کرنی پڑی تھی۔ بہرحال سو حیلوں بعد آگ جل ہی گئی اور اس نے حسب ضرورت پھلکے بنا لیے۔ سالن تو وہ دوپہر کو اسکول سے آنے کے فوراً بعد بنا چکی تھی۔ لہٰذا آخری پھلکا دسترخوان میں لپیٹتے ہی اس نے گندھے آٹے کا برتن اٹھا کر فریج میں رکھا۔ خشک آٹے کی چاپچی اور بیلنا وغیرہ کچن میں شیلف پر رکھ کر آئی اور پھر واپس آکر چولہے کے پاس رکھی پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

یہ چولہا اماں نے لوہے کی بالٹی میں مٹی لگا کر بنایا ہوا تھا۔ گھر میں سلنڈر موجود تھا مگر وسائل اتنے محدود تھے کہ وہ مہینے میں دوسری بار سلنڈر نہیں بھروا سکتے تھے۔ ایک ہی سلنڈر کو کھینچ تان کر پورا مہینہ باوقا بنائے رکھنے کے چکر میں وہ نہ صرف خوشی خوشی کالے کلوٹے برتن مانجھتی بلکہ آگ کے ساتھ بھی گھنٹوں دل جمعی سے لڑتی رہتی کیونکہ لکڑیوں کا ایندھن بہرحال سستا پڑتا تھا اور زندگی کی گاڑی گھسیٹنے کے لیے انہیں بہت سی ایسی بچتیں کرنا پڑتی تھیں۔

ابھی بھی وہ چمٹے کی مدد سے چولہے میں سے کوئلے نکال کر ایک دوسرے درجے کے گھی کے خالی ہوئے ڈبے میں گراتی جا رہی تھی تاکہ اگلی دفعہ آگ جلانے کے لیے ذرا سی آسانی اکٹھی کر سکے۔ چولہے میں جب راکھ کی جلتی بجھتی چنگاریوں کے سوا کچھ نہ بچا تو اس نے توا اٹھا کر کوئلوں والے ڈبے کے اوپر رکھ دیا اور اٹھ کر گیٹ کی طرف چلی آئی۔ گیٹ کے قریب ہی ایک کونے میں جھاڑو' مانجھا اور وائپر وغیرہ دھرے رہتے تھے۔ اس نے جھاڑو اور لوہے کا پلٹا اٹھایا اور پھر چولہے والی جگہ پر آگئی۔ چولہا گھسیٹ کر دیوار کے قریب لگانے کے بعد وہ بیٹھ کر جھاڑو لگانے لگی۔ سارا گند اکٹھا کر کے وہ اٹھی ہی تھی کہ گیٹ دھڑ دھڑانے کی آواز آئی اور اگلے ہی لمحے تائی اماں گرمی سے ہانپتی ہوئی گھر میں داخل ہو گئیں۔

"اف گرمی اللہ توبہ!" آتے ہی انہوں نے اپنا خوب صورت شیفون کا دوپٹا اتار کر چارپائی پر پھینک دیا اور آستینیں چڑھانے لگیں۔

"ارے انیلا تم؟" تایا زاد بہن کو دیکھ کر اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف گئی اور سیڑھیوں پر رکھے صاف ستھرے شاپر چڑھے ڈسٹ بن میں پلٹا الٹ دیا۔ پھر جھاڑو اور پلٹا اپنی جگہ پر رکھ کر اس نے واش بیسن پر رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھوئے اور دوپٹے سے ہی پونچھتی ہوئی ان لوگوں کی طرف آگئی۔ وہ تب تک صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ تائی اماں کو سلام کرنے کے بعد وہ انیلا سے گلے ملی اور پھر باری باری اس کے دونوں بچوں کو پیار کیا۔ اتنے میں اماں بھی نماز سے فارغ ہو کر آگئیں۔

"کمزور ہو گئی ہو بیٹا!" انہوں نے انیلا کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"بس چاچی! بچوں نے گھن چکر بنایا ہوا ہے۔"

"کب آئی ہو؟" اماں نے اس کے چھوٹے بیٹے کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ کچن میں چلی گئی۔

"پرسوں آئی ہوں اور ہفتے کو جانا ہے۔ آج بازار گئی

تھی' سوچا آج ہی کپڑے دے آؤں۔ لائٹ تو ہوتی نہیں لیکن آپ ہفتے تک کسی طرح مینیج کر لیجیے گا۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کر کچن کی طرف آگئیں۔ اس کے ہاتھ میں لال شربت کی بوتل دیکھ کر انہوں نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔

"کیوں اماں؟" وہ وجہ جانتی تھی پھر بھی پوچھ بیٹھی۔

"بھابھی کی تو خیر ہے آتی جاتی رہتی ہیں۔ بیٹی آئی ہے آج۔ میں کولڈ ڈرنک لے آتی ہوں۔"

انہوں نے کہہ کر آگے بڑھ کر سامنے والی شیلف پر پڑی پلاسٹک شیٹ کے نیچے ہاتھ مار کر گھر میں بچا سو کا آخری نوٹ ہاتھ میں دبایا اور باہر چلی گئیں۔ وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے کچن سے نکل کر صحن میں بچھی چارپائیوں کے قریب آگئی۔ انیلا کا چھوٹا بیٹا ماں کے قریب ہی کھڑا منہ بسور رہا تھا جبکہ بڑا والا برآمدے کی دیوار کے ساتھ رکھی سلائی مشین کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں بہت سی نلکیاں پکڑ رکھی تھیں جنہیں وہ بار بار ہوا میں اچھالتا اور پھر کیچ کر کے خوش ہوتا۔

"یہ تمہاری کتاب ہے؟" انیلا نے یقیناً "وہ کتاب اپنے بیٹے سے چھینی تھی' جب ہی وہ رونی صورت بنائے کھڑا تھا۔ تائی اماں چارپائی پر بالکل سیدھی لیٹی ہوئی تھیں۔

"ہاں میری ہے۔ لاؤ دو میں رکھ دوں۔" اس نے نوٹ نہیں کیا کہ اس کے جواب نے تائی اماں کو اٹھا کر بٹھا دیا ہے۔ کمرے میں کتاب رکھ کر وہ واپس آئی تو تائی اماں ہاتھ نچا کر کہہ رہی تھیں۔

"کیا فائدہ اتنا پڑھنے کا جب آخر کار چولہا چوکی ہی کرنی ہے۔"

وہ محض مسکرا کر انیلا کے ساتھ بیٹھ گئی اور اس کے بیٹے کو وہ پرانی کاپی پکڑا دی' جو وہ اس کے لیے بطور کھلونا اندر سے لے کر آئی تھی۔

"ہمیں تو ویسے بھی نوکری کرنے والی لڑکیاں پسند نہیں چلن ہی اچھے نہیں ہوتے ان کے۔"

وہ نخوت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے ناک سے مکھی اڑا رہی تھیں۔ اسے لگا' وہ پھر سے گیلی لکڑیوں کو جلانے کی کوشش کر رہی ہے مگر وہ بولی کچھ نہیں۔

"نہ جانے کہاں کہاں پھرتی رہتی ہیں' کس کس کے ساتھ گھوم کر آتی ہیں۔" نظریں بھی اسی کی طرف تھیں اور اشارہ بھی۔ صرف نام نہیں لیا گیا۔

"خوشبو بھی معصومیت ماری کہہ رہی تھی کہ اماں میں بھی ٹیچر نہ لگ جاؤں۔ روز روز سیر و تفریح کو جایا کروں گی مفت میں' پر میں نے کہہ دیا کہ یہ سب ہمیں گوارا نہیں۔ جن کا شوق ہے' وہ کرتے پھریں۔ ہماری طرف سے لعنت ہو ان پر بھی' ان کے شوق پر بھی۔"

ہاتھ نچا نچا کر کہتے ہوئے انہوں نے آخر میں حقیقتاً "لعنت بھیج دی تھی۔

اب اسے بولنا ہی تھا۔ ناچتی تھرکتی چنگاریوں کو وہ پھونک مارتی تب ہی اس کی آنکھوں میں مرچیں بھرتا دھواں ختم ہوتا۔

"تائی اماں! میری جاب میرا شوق نہیں۔ ہمارے گھر کی ضرورت ہے۔ وہ لوگ میرے پابند نہیں کہ میری سہولت دیکھ کر ورک شاپس اور ٹریننگ سیشن کیا کریں۔ میں ان کی پابند ضرور ہوں۔ دل سے جاؤں یا بددلی سے مگر مجھے جانا پڑتا ہے۔"

اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ نہ تو اس نے ہاتھ نچائے تھے' نہ اس کی نظروں میں معنی خیزی تھی۔ جو اسے کہنا تھا وہ اس نے مختصر ترین الفاظ میں کہہ دیا تھا۔

اور پھر تائی اماں کچھ نہیں بول سکی تھیں۔ انیلا تمام وقت اس سے نظریں چراتی رہی اور وہ انیلا سے اپنے آنسو چھپاتی رہی۔ اماں نے آکر خود ہی انہیں کولڈ ڈرنک پیش کی۔ انہیں کمپنی دی جب تک کہ انیلا نے تمام جوڑوں کے متعلق انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ انہیں کس اسٹائل میں اور کس سائز میں سیا جائے۔ جاتے ہوئے جب انیلا نے اس سے کہا کہ "میرے ہوتے ہوئے چکر لگانا" تو اس کا لہجہ بہت کھوکھلا سا تھا۔ وہ بھی محض ایک بے ڈھنگا سا "ہوں" کر کے رہ گئی مگر جوں ہی وہ لوگ گھر سے نکلے' اس کا ضبط ٹوٹ گیا۔ پہلے آنسو گرتے رہے' پھر سسکیاں نکلنے لگیں اور جب دل

کا بوجھ ذرا سا ہلکا ہو گیا۔ تب وہ سر گھٹنوں میں دے کر خاموشی سے سوچنے لگی کیا تائی اماں ہمارے گھر کے حالات سے بے خبر ہیں؟ کیا انہیں میری فطرت اور مزاج کا پتا نہیں؟ یا پھر انہیں میری عادتوں پہ شک ہے؟"

"کیا بات ہے بیٹا؟" کسی نے بہت شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا تھا۔

"ارے خالہ جی آپ؟ آئیں بیٹھیں۔" وہ چارپائی پر ایک طرف سمٹ کے بیٹھ گئی۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" انہوں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے برآمدے میں مشین کے آگے جھکی اماں سے پوچھا۔

"اس کی تائی اماں آئی تھیں۔"

اماں نے وہیں سے خالہ جی کو تمام قصہ مختصراً" بتا دیا۔

"نہ میرا بچہ نہ' دل چھوٹا نہ کر۔" خالہ جی نے بڑھ کر اسے ساتھ لگا لیا۔ اس کی آنکھیں پھر سے نم ہو گئیں۔

"لوگوں نے تو پیغمبروں پر بھی باتیں بنائی ہیں۔ ہم تو پھر گناہ گار انسان ہیں۔" وہ اسے چمکارنے لگیں۔

"خالہ جی! میں بہت بری لڑکی ہوں کیا؟"

"نہ میرا بچہ نہ۔ تو تو بڑا پیارا بچہ ہے۔"

"تو پھر انہوں نے میرے لیے اتنی گری ہوئی بات کیوں کی... میں اتنی ارزاں ہوں۔ کیا میں ان کے خاندان کا ایک فرد نہیں... یہ حیثیت ہے میری ان کے آگے۔ کیا میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں؟ اماں تو ان کی بیٹیوں کو اپنی بیٹی کہتی ہیں تو پھر وہ مجھے کیوں نہیں اپنی بیٹی سمجھتیں... انہیں نہیں پتا کہ لڑکیاں آبگینوں کی طرح نازک ہوتی ہیں؟"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

"ہونہہ تو تائی اماں نے جنرل بات کی تھی۔"

کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے اس نے تاسف سے سوچا۔ اسکول میں اس وقت بریک ہوئی تھی۔ ملک کے مشہور و معروف چین سسٹم کی اس برانچ میں وہ گزشتہ تین سال سے کام کر رہی تھی اور پچھلے ایک سال سے سینئر سیکشن ہیڈ کے عہدے پر فائز تھی۔

"جنرل بات!" اس نے طنزیہ انداز میں زیرِ لب دہرایا۔ اپنی ماں کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش میں اس کے پڑھے لکھے تایا زاد نے اسے سائیکو کہا تھا' اس کی سوچ کو محدود اور نیگیٹو کہا تھا۔ جس کو وہ قریب قریب بھائیوں کی سی عزت دیتی تھی' اسی نے گھنٹہ بھر اس پہ استہزا ابھری ہنسی ہنس کر اس کے سامنے اپنی سوچ کو وسیع اور پوزیٹیو بھی ثابت کر دیا تھا اور خود کو متوازن ذہن کا مالک بھی۔

وہ تلخی سے مسکرائی اور اٹھ کر کمپیوٹر لیب کی طرف چل دی۔ مصروفیت غم غلط کرنے کا ایک اچھا طریقہ ثابت ہو سکتی تھی۔

کمپیوٹر لیب بریک کی وجہ سے خالی پڑی تھی۔ صرف سامنے والے کمپیوٹر پہ ایک لڑکا بیٹھا تھا' جسے وہ پشت سے بھی با آسانی پہچان سکتی تھی کہ یہ شوخ سا فریدین ہے۔ بنا ہیل والے سادہ سے جوتے کے سبب وہ بنا کوئی چاپ کیے اس کے قریب چلی گئی اس لیے فریدین کو اس کی آمد کی خبر نہیں ہو سکی۔ کمپیوٹر اسکرین پر نظر پڑتے ہی اس کی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ اس کے خود سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا محسوس ہو رہا ہے۔ اسکرین ایک خوبرو اور طرح دار دوشیزہ کی تصویر دکھاتی رہی۔" پھر فریدین نے جیب سے موبائل نکالا اور کال ملا کر کان سے لگا لیا۔

"ہاں جی ملی؟"

"ہاہاہا۔ دیکھ لو! کتنی یونیک کلیکشن ہوتی ہے میرے پاس۔"

"فلرٹ کہاں یار! میں تو "فلرٹ سا" کر رہا تھا' یہ چپک ہی گئی۔"

فریدین ذرا ذرا سے توقف کے بعد بولتا چلا جا رہا تھا اور وہ سانس روکے سن رہی تھی۔

"نہیں' نہیں! ایسا ارادہ نہیں ہے میرا۔ بس کچھ

تصویریں میں نے اپنے مطلب کے مطابق تیار کرلی ہیں۔ ان کی مدد سے جیب بھی گرم رہے گی اور ملاقات کے دوران یہ لڑکی مجھ پر مدذ و فیوو بھی نہیں باندھا کرے گی۔"

"ہاہاہا!" وہ ایک دفعہ پھر خباثت سے ہنسا۔ اس سے اب مزید کچھ بھی سننا دو بھر تھا اسی لیے اس نے ذرا سا گلا کھنکارا۔ فریدین ایک دم مڑ کر دیکھنے لگا۔ اس پر نظر پڑتے ہی پہلے وہ ذرا سیدھا ہو کر بیٹھا پھر "بعد میں بات کرتا ہوں۔" کہہ کر فون بند کیا اور کھڑا ہو گیا۔

"السلام علیکم میم!" وہ گھبرایا ہوا سا تھا۔

"میرے کیبن میں آیئے۔" وہ رعب دار آواز میں کہتی ہوئی اپنی مخصوص پر تمکنت چال میں اپنے آفس کی طرف مڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

"مے آئی کم ان میم؟" فریدین نے مؤدب انداز میں پوچھا۔

"لیں۔" اس نے یک لفظی اجازت دے کر سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"تھینک یو میم!" اس نے تھوک نگلتے ہوئے بمشکل کہا۔

"آپ نے پیپر آؤٹ کروایا مگر بات میرے اور آپ کے درمیان رہی۔"

"ج۔۔۔ جی!" وہ بھلا اس بات کا مزید کیا جواب دیتا۔

"حسن اتفاق سے میرا موبائل ریکارڈ پہ تھا۔" اس نے کمال مہارت سے جھوٹ بولتے ہوئے بہت اعتماد سے موبائل دراز سے نکال کر ٹیبل پر رکھ دیا۔

"م۔ مم ۔۔۔ میم وہ ایکچوئیلی۔۔۔" فریدین گھگھیانے لگا۔

"جاب آپ کی ضرورت ہے نا فریدین! آئی ایم شیور یہ آپ کا شوق نہیں ہے۔"

"یس میم!" اس کی پیشانی نم ہو گئی تھی۔

"خوشبو از مائی سسٹر!"

اطلاع تھی یا بم پھٹا تھا۔ فریدین چونک گیا۔ گھبراہٹ سے اس کی آنکھیں کچھ زیادہ ہی کھل گئیں۔

"آپ سمجھ دار ہیں فریدین!" براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بولی۔

"یس میم۔ ڈونٹ یو وری۔۔۔ پپ۔۔۔ پلیز!"

"شاید آپ نے دوست کو بھی تصویر بھیجی تھی۔"

"میم وہ میں۔۔۔ سنبھال لوں گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔" فریدین کہہ چکا تو اس نے آنکھ کے اشارے سے اسے جانے کا حکم دے دیا۔ وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ اس کی چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔

"بھلا کیسے آپ مجھے نازک لڑکی جانتیں تائی اماں!" اس نے سوچتے ہوئے سر کرسی کی پشت سے ٹکا لیا۔ "بھلا کیوں آپ میرا دل ٹوٹنے کا امکان نظر میں رکھتیں؟ میں اب اس جنس سے کہاں رہی ہوں جس کا دل ٹوٹا کرتا ہے اور آبگینوں کی طرح نازک ہوتی ہے۔

گردش دوراں نے میرے اندر کی چھوئی موئی لڑکی کو تو نگل ہی لیا۔ اب تو میں مرد ہوں۔ غیرت مند مرد معاش کی فکر رکھنے والا گھر کی عزت پہ بات آئے تو آہنی دیوار بن جانے والا۔۔۔ شکر ہے میں لڑکی نہیں رہی۔۔۔ میں عورت کی صنف سے نکل آئی۔۔۔ شکر ہے میں آپ کی طرح کی عورت نہیں تائی اماں ورنہ عزتوں کو گھر کی چار دیواری سے مخصوص کر لیتی اور آپ کی طرح۔۔۔ بالکل آپ کی طرح خاندان کی کسی اور لڑکی کو غیر۔۔۔ بہت غیر جان کر اس پہ ہنستی لعنت بھیجتی اور منہ موڑ لیتی۔"

☼ ☼ ☼

فریدین لمحہ بھر میں اپنے تمام مذموم عزائم بھول گیا۔ مقابل کے سامنے اسے اپنا آپ بہت کمزور لگا کیونکہ مقابل مرد تھا۔ صرف مرد نہیں مرد میدان بھی ۔۔۔ مین آف ورڈز بھی۔۔۔ مین آف لیٹرز بھی۔۔۔ یعنی ایک مکمل مرد۔۔۔!

☼

شاہین ملک

"آج کی عورت اپنے روایتی کردار سے نکلنے کے بعد عملی زندگی کے ان گنت دائروں میں داخل ہو چکی ہے۔ اس کی شخصیت بدل چکی ہے۔ جس کا اظہار اس کے رویوں' طرز احساس اور فکر کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے تجربات سے ایک نئی دنیا منکشف ہو رہی ہے۔ اس تنوع کے ساتھ ساتھ نئے عہد کی نئی تصویر بننے لگی ہے۔ پاکستان میں نسائی ادب اور کلچر کے حوالے سے بات کرتے ہوئے صورت حال بڑی غیر واضح نظر آتی ہے۔ تعلیم اور معاشی آزادی کی طرف پیش رفت کے باوجود ہماری عورت کو تخلیقی اظہار کی کھلی فضا نہیں مل رہی' کیونکہ ہمارا معاشرہ آج بھی قدیم روایتوں' علاقائی رسم و رواج' انتہاپسندی اور اقدار کی کھینچی ہوئی سرحدوں کے اندر محسوس ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں ہر چند کہ عورت کو "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" کا مژدہ سنایا جا چکا ہے مگر بولنے والی عورت فرسودہ ذہنی رویوں اور ردعمل کے نتیجے میں قابل نفرت سمجھی جاتی ہے۔"

"یار ریان ٹی وی آن کرو آکاش چینل پر بھابھی بھاشن دے رہی ہیں۔"

ممتاز نے اپنے دوست ریان کو ایس ایم ایس کیا۔ ریان ابھی گھر کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ چابی تالے میں گھومی۔ ذہن میں کچھ یادیں ابھریں' دل دھڑکا' لائٹ آن کی اور پھر ہاتھ ٹی وی آن کرنے کے لیے سوچ پر گھوم رہے تھے۔

"یہ ریموٹ کنٹرول کہاں ہے۔" وہ چلانا چاہتے تھے مگر کس پر چلاتے' کوئی وہاں کہاں تھا۔

"میں ہی کہیں رکھ کے گیا ہوں گا۔ میرے سوا یہاں آتا کون ہے؟" وہ اپنا غصہ پیتے ہوئے سوچنے لگے۔

"یہ ممتاز بھی نا کچھ زیادہ ہی ہندی فلمیں دیکھنے لگ

گیا ہے۔ حبہ خواتین کی این جی او چلا رہی ہے۔ کتابی جملے تو بولنے ہی پڑیں گے اسے۔"

یہ سوچ کر انہوں نے ممتاز کا بتایا ہوا چینل لگایا۔ حبہ کی تقریر شاید ختم ہونے کو تھی۔ "شکر ہے میں نے جلدی لگالیا۔" ریان نے ایک ہی سانس میں کتنی ہی باتیں کرلیں اپنے آپ سے۔ حبہ کہہ رہی تھی۔

"زندگی کا اصل منظر دیکھئے تو آج بھی مرد حاوی ہے۔ باپ' بھائی اور شوہر سے ڈائیلاگ کرنا آسان نہیں۔ خاموش رہنا' صبر و برداشت کرنا اور ظلم کی اجازت بنا مانگے دے دینا شرافت اور مشرقیت ہے۔ احتجاج کرنا' بغاوت کرنا' اعتراض کرنا اور انکار کرنا مغربیت ہے۔ میں آج تک ایسی عورت سے نہ مل سکی جو زبان کو بالکل نئی طرح لکھنا چاہتی ہو۔ یہ میرا خیال تھا کہ ایک طاقت ور جذبہ' احساس یا خیال اپنا پیکر خود بناتا ہے۔ اپنے لیے درست الفاظ خود چنتا ہے لیکن اصلی لفظ لکھنے والی عورت ناپید ہی ہے۔ کتنا اچھا سوال ہے کہ عورتیں کس دائرے میں رہ کر' یا اسے پار کرکے لکھیں گی؟ کیا اس کا فیصلہ وہ خود نہیں کریں گی؟"

اس کے بعد دانشوروں نے بات آگے بڑھا کر اپنا بریڈ اسٹریٹ اور ژولیا کرسٹوا کے فن تحریر کے حوالے سے بات آگے بڑھادی۔

نسائی ادب کے حوالے سے یہ پروگرام خاصا جامع تھا مگر ریان کو پہلے مرحلے میں حبہ کا یوں منظر عام پر آکر بولنا اچھا نہیں لگا مگر جوں جوں رات بھیگ رہی تھی' غصہ بھی کم ہوتا جارہا تھا۔

"میں اسے اتنا ہی توانا اور پراعتماد تو دیکھنا چاہتا تھا۔ اتنی آزادی اور جرات اسے میں نے ہی تو دی ہے۔ ورنہ جب وہ بیاہ کے میرے گھر آئی تھی تو چار آدمیوں میں بیٹھ کے بات کرتے وقت اس کی حالت دیدنی ہوتی تھی۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے آجاتے اور وہ کبھی پانی تو کبھی چائے یا کھانے کے بہانے ڈھونڈ کے کچن میں بھاگنا چاہتی۔ بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوجاتی تھی' کیونکہ وہ عورت تھی۔ یہ کچن بھی نا عورتوں کی راجدھانی اور آخری پناہ گاہ ہوتا ہے شاید۔۔۔ یہاں چھپ کر میں نے اسے گنگناتے ہوئے بھی دیکھا۔ بنتے ہوئے بھی اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے بھی۔ کبھی مسکرا کر ہنڈیا بھونتے وقت تو کبھی مسالے والی برنیاں دھو کے خشک کپڑے سے پونچھتے وقت' اس کے چہرے پر بلا کا اعتماد اور روشنی سی آجاتی تھی۔ مجھے یاد ہے میں نے ایک بار اس سے پوچھا تھا۔

"کیا بات ہے آج کل ابٹن بہت استعمال کررہی ہو؟"

پہلے تو ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں دیپ جل اٹھے مگر پھر میرا لہجہ اسے طنزیہ سا لگا۔ وہ بجھ گئی ایک دم ہی اور بولی۔

"صرف نیند پوری کرلیتی ہوں۔" پھر اس کے ہاتھ کانچ کے برتنوں پر تیزی سے چلنے لگے۔ کچھ اس کا وہ کانچ سا کڑا اور کچھ اس کے ہاتھوں میں برقی لہروں کا عود کر آجانا عجیب سا لگا مجھے تو۔ جیسے ابھی مجھ پر برس اٹھے گی لیکن پتا نہیں کس مٹی سے اس کے وجود کو ڈھالا گیا تھا۔ وہ زبان سے چپ تھی۔ میں بھول گیا کہ میں تو اس کا کوزہ گر تھا اور وہ تھی میری چکنی انمول مٹی۔

"بس پانچ منٹ اور۔۔۔ ابھی لگاتی ہوں۔" روبوٹ نے ایک رٹا ہوا جملہ تحمل سے کہا۔ جیسے وہ ہر بار کہا کرتی تھی۔

کھانے کی میز پر پھیلی کتابیں چند سیکنڈ میں سمیٹ لی گئیں۔ میز پوش صاف کیا گیا اور کھانا لگنا شروع ہوگیا۔ گرما گرم ساگ' مکئی کی روٹی' سوجی کا حلوہ اور سادہ روٹیاں' مکھن کی کٹوری بیچوں بیچ رکھی ایسی مہکی کہ ہر سو کھانے کا سماں سا بن گیا تھا۔

آج ایک برس ہونے کو آیا۔۔۔ حبہ اپنے میکے میں رہ رہی ہے۔ ساگ کا موسم آیا بھی اور چلا بھی گیا۔ کئی بار لوگوں کے گھروں سے سرسوں کے ساگ پر تڑکے لگانے کی آوازیں اور خوشبوئیں اٹھیں۔ میرے قدم رکے' دل سے ہوک سی اٹھی کہ میرے گھر کا چولہا

ٹھنڈا پڑا ہے۔ کوئی نہیں جو میرے حکم کی تعمیل میں میری تواضع کرسکے۔ میری خاطر داری کرسکے' جو میرے لیے پسینہ پسینہ ہوکر مجھے آرام دے سکے۔ حبہ چپ کی دیوی صبر کی مورتی ایسی باغیانہ سوچ کی مالکہ کیسے ہوگئی؟

ہوتا ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بے ارادہ انجانے سفر پر نکل پڑو تو ضروری نہیں ہوتا کہ تحریریں جاگیں یا کوئی حرف بولیں اور بسا اوقات نہ تو آنکھیں رستوں کو دیکھتی ہیں' نہ ہی راہیں منزل سے آشنا ہوتی ہیں۔ تمام منظر بدل جاتے ہیں۔ کہانیاں بھی بدل جاتی ہیں۔

"چھوڑو یار۔۔۔ بڑی خوب صورت مگر خاصی بدذوق بیوی پائی ہے تم نے بھی۔۔۔ تم شاعر ہو اور وہ شعروں کی زبان سمجھتی ہی نہیں ہے۔۔۔ مشاعرے میں لے جاکر بٹھادو' داد تک نہیں دیتیں' کسی شعر یا مصرعے پر' تم ساری ساری رات جاگ کر غزل کہتے ہو' وہ اپنی نیندیں پوری کرتی ہیں کیونکہ انہیں تو رتجگے نہیں بھاتے۔۔۔ فجر کی اذانوں کے وقت جب تمہاری آنکھیں جھپکتی ہیں تو وہ انگڑائیاں لے کر بیدار ہوجاتی ہیں اور پھر وہ میکانکی سی عورت ہوجاتی ہیں۔ نہ ان کے چہرے پر رومانس اور نہ ہی خوشی کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ بیوی تو ایسی ہونی چاہیے کہ جس پر نظر پڑتے ہی روح تک سرشار ہوجائے۔ ہر بات مان لینے کی صلاحیت رکھے۔ صرف اداکارانہ اپروچ نہ ہو۔"

ریان کے دوست ممتاز کا ان کے بیڈ روم تک آنا جانا تھا۔ کیونکہ گھر میں ایک ہی واش روم تھا اور وہ ان کے بیڈ روم سے منسلک تھا۔ ظاہری سی بات ہے کہ بے تکلف دوست جب رات گئے تک کے مہمان بنتے ہیں تو واش روم بھی اسی بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ ممتاز کے کہے ہوئے چند جملے اس کے کانوں سے ٹکرائے' وہ ایک دم بجھ سی گئی۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اور اس کے کہنے میں ایک ہی بات کی کسر رہ گئی تھی کہ۔ "یار! تم نے کیا دیکھ کے شادی کی؟"

لوگ بھی نا' سوچ کر نہیں بولتے' دوست ہونے کا مطلب کہیں یہ نکلتا ہے کہ ذاتیات میں الو الو ہوجاؤ؟

اس نے چائے ایک طرف رکھی اور لپک کر ڈریسنگ ٹیبل سے اینٹی ایجنگ کریم اٹھائی۔ ایک' دو' تین ماتھا' رخسار' ٹھوڑی اور ناک ہر جگہ ایک ایک قطرہ جذب کرکے بلش آن لگایا اور ہونٹ لپ گلوز سے نرم کیے اور کسی ماہر اداکارہ کی طرح ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔۔۔ ریان نے ایک نظر اٹھا کے دیکھا۔

ممتاز جھینپ سا گیا اور اس نے لپک کر حبہ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی پکڑ لی۔۔۔ ایک ہی نظر میں وہ ممکن ہے سمجھ گیا ہو کہ عورتیں ہواؤں پر لکھی تحریریں بھی پڑھ لیتی ہیں۔ دل کے اندر کھلنے والی آنکھوں سے دوستوں کے دلوں کا اصول دیکھ لیتی ہیں، سمجھ لیتی ہیں۔

"بھئی بھابھی! میں ریان سے کہہ رہا تھا، بہت دن ہو گئے۔ مچھلی کے شکار پر نہیں گئے اور تو اور فلم بھی دیکھنے نہیں گئے۔ اس ہفتہ کی شب یا دن میں کوئی آؤٹنگ کا پروگرام رکھیں۔ آپ کو پتا ہے تھری ڈی تکنیک پر فلم دیکھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔"

وہ جو تھوڑی دیر پہلے اس کی شخصیت میں کیڑے نکال رہا تھا۔ اچانک بچہ سا بن گیا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اس معصومیت کے واری صدقے جاتا۔ وہ ہولے سے مسکرا دی۔

"بھئی ہمارے صاحب مصروف ہی بہت رہتے ہیں۔ ویسے ہم ہیری پوٹر کی فلم تو حال ہی میں دیکھ کے آئے ہیں۔" اس نے ریان اور ممتاز کو یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"وہ۔۔۔ وہ تو دو مہینے پہلے کہیں لگی تھی۔ بھابھی جان! تفریح تو ہر ہفتے دس دن میں ضرورت بن جاتی ہے۔ آپ سا سادہ بھی کوئی نہ ہو۔" اور وہ چائے پینے لگا۔

☼ ☼ ☼

سیل فون پر پیغام کی بیل بجی۔ سیل فون میز پر رکھا ہوا تھا۔ وہ وہیں لپکی۔ ایک نامی گرامی ادبی جریدے کی مدیرہ نے یاد دلایا کہ حبہ کا افسانہ ابھی تک موصول نہیں ہوا۔ کیا بات ہے۔ اشاعت کا وقت سر پر آن پہنچا ہے۔ بلا ارادہ اس کی آہ نکلی۔

"کیا لکھوں افسانہ۔۔۔ مصروفیت ہی اس قدر رہتی ہے۔ دماغ مائل ہی نہیں ہوتا لکھنے کی طرف اور سچی بات تو یہ ہے کہ شادی سے پہلے جتنا لکھنا تھا، لکھ لیا۔ اب کیا تیر مار لوں گی، جو پہلے نہیں مار سکی تو۔"

اس نے پتا نہیں کس دل سے سچ بولا تھا۔ پتا نہیں یہ سچ تھا بھی یا نہیں مگر اتنا تو سمجھ میں آ رہا تھا کہ تخلیقی کام مسلسل ڈپریشن میں تکمیل کو پہنچنا مشکل ہوتے ہیں۔

"اتنی کڑواہٹ کس لیے؟ بھرپور زندگی گزارنے والی حبہ ایسی مایوسانہ گفتگو کرتی بھلی نہیں لگتی۔"

مدیرہ نے بہت حد تک سچ کہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے نمکین پانی چھلکنے کو تھا۔ اس نے سامنے رکھی منرل واٹر کی بوتل کا ڈھکن کھول کے اسے منہ سے لگا لیا۔ پروا ہی نہ کی کہ کبھی وہ اپنے بچے کو اس بدتہذیبی پر ٹوکا کرتی تھی۔ عین اسی وقت اس کی بڑی بیٹی فضیلہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بھی ایک لمحے کو چونکی اور اس نے پوچھ ہی لیا۔

"کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟"

حبہ نے گردن ہلائی۔ اس نے آنکھ جھپکتے ہوئے ایک دفعہ اور ماں کو بغور دیکھا جیسے اسے یقین نہ آیا ہو۔ حبہ نے اس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور بولی۔

"کیا بات ہے بیٹا! ہوم ورک ہو گیا؟"

"جی! تھوڑا سا رہ گیا ہے بس۔" وہ گھٹے گھٹے لہجے میں بولی اور واپس اپنے کمرے میں چلی آئی۔

"ایک تو یہ بچے بھی بڑے حساس ہوتے ہیں۔ ذرا سی اونچی آواز میں بات کیا کر لو سارے معاملے کی جیسے سن گن لے لیتے ہوں۔" وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی اور اسٹور روم کی چابی لے کر جا ہی رہی تھی کہ سیل فون پر میسج کی گھنٹی سن کر چونکی۔ ریان بتا رہے تھے کہ شام کو وہ گھر ہی پر رہے۔ فریج میں بونگ اور نلی کا گوشت رکھا ہے، نہاری تیار کر لے۔ دو دوست کوئٹہ سے آنے والے ہیں اور فضیلہ کا کمرا ان مہمانوں کے لیے خالی کر دیا جائے۔ صرف ایک رات قیام کے بعد وہ الصبح اسلام آباد روانہ ہو جائیں گے۔

اس نے میسج پڑھ کے اسٹور روم جانے کے بجائے کچن میں جانے کی ٹھانی۔ اس کے ہاتھ فریزر پر لپکے اور پھر آناً "فاناً" گوشت چولہے پر چڑھ چکا تھا۔ اس کے بعد فضیلہ کا کمرا مہمان خانہ بن رہا تھا۔ اس کا موڈ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ "میں نے پاپا کے ساتھ بازار جانا تھا۔ میری اسٹیشنری، میرا بیگ اور میرے جوتے تنگ

ہو رہے ہیں۔ پاپا کو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ امی! یہ کیا، آپ کھانا لگائیں گی، مہمان داری کریں گی یا میرے ساتھ بازار جائیں گی؟"

"نہیں سب کچھ صغراں کو بتا کے جاؤں گی۔ کھانا ہوسٹس ٹرالی میں گرم رکھا رہے گا۔ وہ ٹرالی تو پاپا بھی آسانی سے استعمال کر لیتے ہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔" حبہ نے بیٹی کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہیں مان رہی تھی۔

"امی! نہیں ہو سکے گا۔ آپ نہیں جانتیں۔ ہر چیز پھیل جائے گی۔ انہیں کوئی برتن یا چیز نہ ملی تو وہ صغراں پر چلائیں گے۔ ہماری تو بے عزتی ہی ہو گی۔" فضیلہ نے اپنے والد محترم کی عادت اور مزاج کا جو نقشہ کھینچا، وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔

"کیا تم واقعی سینئر اسکول کی طالبہ ہو بیٹا! ایسا کیا ہو جائے گا اگر آج ہی اسٹیشنری نہ آئی؟ مہمان تو کبھی کبھی آتے ہیں۔" اب حبہ کو غصہ آنے لگا تھا۔

"اور جوتوں کا کیا ہو گا، میں انہیں پہن کر چل نہیں سکتی۔ دکان دار نے کہا تھا فوراً" نہ تبدیل کروائے تو یہی رکھنے پڑیں گے، دیکھیے گا پھر اسی کو۔"

تب حبہ کو احساس ہوا کہ اسی تھوڑے سے وقت سے کچھ وقت چرا لینا ہی بہتر ہے۔ بیٹی بھی خوش ہو جائے گی اور اس کا اسکول سے ناغہ بھی نہیں ہو گا۔

"صغراں کے سپرد کرتے ہیں کچن، یوں بھی یہ ہڈی نلی اور گوشت چار گھنٹے سے پہلے تو گلنے والے ہیں نہیں، ہم ابھی چلے جاتے ہیں بازار، آدھے گھنٹے کا کام ہی تو ہے۔ یوں گئے، یوں لوٹیں گے۔ چلو تیار ہو جاؤ۔ شام کا بکھیڑا ہی نہ رکھو۔"

اس نے اپنی چادر نکالی اور فضیلہ نے لباس بدلا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ خالی رکشے کو روک رہی تھیں۔

راستے میں دل خراب بھی ہوا کہ ریان کو ایک میسج نہیں کیا۔ بتا کے نکلتے تو اچھا تھا۔ وہ کہاں دوپہر میں گھر آتے ہیں۔ وہ دونوں سیدھی جوتوں کی دکان پر گئیں۔ جوتے بدلوائے۔ سڑک پار کی اور سامنے واقع اسٹیشنری کی دکان میں داخل ہو گئیں۔ فضیلہ کو جو کچھ لینا تھا لیا اور الٹے قدموں واپس لوٹیں۔ مرحلہ اب رکشا لینے کا تھا۔ وہ فٹ پاتھ کے ایک کونے پر کھڑی تھیں اور رکشا دور، دور تک موجود نہیں تھا۔

ریان گاڑیوں کا بزنس بھی کرتے تھے۔ کبھی کبھی دو، دو گاڑیاں پورچ میں کھڑی رہتیں اور کبھی ذاتی گاڑی بھی گھر والوں کے استعمال میں نہ ہوتی۔ یہ لوگ گھر کے مزاج کو خوب سمجھتے تھے۔ اس لیے ٹیکسی، رکشا اور رینٹ اے کار جو سہولت میسر آتی، اسی سے مستفید ہوا کرتے تھے۔ شکوہ، شکایت نہیں کرتے تھے۔ آج بھی چند ہی ساعتوں میں جوتے تبدیل کروا کے اسٹیشنری کی اشیا کی خریداری کر لی تھی اور بالکل ہی اچانک ایک لینڈ کروزر عین رکشے کے سامنے آن کر کھڑی ہوئی۔ فضیلہ رکشے کو روکنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس لیے اسے اس گاڑی کے سامنے آجانے سے کوفت ہوئی۔ اس نے ڈرائیور کو گھور کے دیکھا۔ مگر یہ کیا؟ یہ تو ریان تھے جو آناً "فاناً" آگے بڑھ گئے۔ بجائے پارکنگ میں اپنی جگہ بنانے کے۔ بجائے انہیں دیکھ کر کچھ پوچھنے اور گھر تک چھوڑنے کے، وہ چلے کیوں گئے اور یہ گاڑی کس کی تھی۔ شاید شوروم پر فروخت کے لیے آئی ہو اور وہ ٹرائی کرنے کے لیے لے کر نکلے ہوں۔

"امی! یہ پاپا ہی تھے نا؟" فضیلہ نے بے یقینی سے اپنی ماں کی جانب دیکھا۔۔۔ حبہ بھی سوچوں میں گم تھی۔ پلک جھپکنے میں نظر آنا اور پھر آناً "فاناً" آگے بڑھ جانا، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"شاید انہوں نے تمہیں دیکھا ہی نہیں اور میں بھی تو اوٹ ہی میں تھی نا!" وہ رکشے میں بیٹھتے ہوئے بیٹی کو مطمئن کر رہی تھی۔

عین اسی وقت حبہ کے سیل فون پر میسج آیا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی سیل فون بیگ سے نکال کر میسج پڑھا۔

"تم لوگ بازار میں کیا کر رہی ہو۔۔۔ کام تھا تو بتایا کیوں نہیں؟ مہمانوں کا پتا ہے نا آنے والے ہیں۔"

اب تو شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی کہ لینڈ کروزر میں کوئی اور نہیں ریان ہی تھے۔

"تمہاری پکنے رکھ کر صرف جوتے تبدیل کروانے آئی تھی مگر آپ رکے کیوں نہیں؟"

"میرے ساتھ غیر ملکی تاجر تھے، تم تو جانتی ہو عورتوں کے معاملات میں یہ کیسے ہوتے ہیں۔"

ریان نے ایک آدھ مرتبہ ذکر کیا تھا کہ کچھ عرب چھٹیاں گزارنے پاکستان آئے ہیں تو کراچی کو دوسرا دبئی سمجھ رہے ہیں۔ پھر ان کی جیبوں سے پیسہ اچھلتا ہے تو انہیں انسان "انسان" نہیں معلوم ہوتے، وہ ہر چیز کھانا، خریدنا اور استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ چاہے وہ عورت ہو یا ٹشو پیپر!

حبہ کو ان میسجز سے اندازہ ہو ہی گیا تھا لیکن فضیلہ تو کم عمر اور نا سمجھ تھی، اسے آسانی سے بات کی گہرائی سمجھ میں آنی مشکل تھی۔

"میں نے آج پاپا سے بات نہیں کرنی۔" وہ الٹی میٹم دے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ حبہ صرف نہ نہ ہی کرتی رہ گئی۔ کھانے کا اہتمام سر شام عروج پر جا پہنچا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل کو فرنچ میری گولڈ پھولوں کے خوب صورت گل دانوں سے سجا کر دیسی اور سنگاپوری کھانوں سے بھر دیا گیا تھا۔ ریان اپنے دفتر کے پیون کو ساتھ لے آئے تھے۔ وہی دعوت شیراز کے بکھیڑے سمیٹتا رہا۔ حبہ اور فضیلہ کھانا گرم کرنے اور برتن آگے بڑھانے میں بٹی رہیں۔ رات بارہ بجے ریان نے کہلوا دیا کہ اب تم آرام کر لو، باقی سارا انتظام نواز کرتا رہے گا۔ وہ یہ نہ کہتے تب بھی حبہ میں مزید جاگنے کی ہمت نہیں تھی۔ کچھ دیر ٹی وی دیکھ کر وہ سو گئی۔ فضیلہ کو بھی آج اس نے اپنے ساتھ ہی سلایا۔ ویسے بھی اسی کا کمرا تو مہمان خانہ بنایا گیا تھا۔

"اندر سے لاک مت کرنا۔ مجھے کسی ضروری کام سے آنا پڑ سکتا ہے۔" ریان نے اسے بہت پہلے ہدایت کر دی تھی۔ آج اسے پہلی بار اپنے ہی گھر میں عدم تحفظ کا احساس ہوا لیکن اس نے دھیان بٹا دیا۔

صبح چار بجے کے قریب کمرے میں ہلکی روشنی کی گئی اور اس کی چادر کو سرکایا گیا۔ حبہ نیند میں کسمسائی، پہلو بدلا اور ریان کو خلاف توقع اپنے سامنے پا کر آنکھیں مسلتے ہوئے پوچھا۔

"خیریت ہے؟"

"ایک ڈیل ہوئی ہے۔ دو کروڑ کا بنگلہ، اسی لاکھ میں مل رہا ہے۔ بنگلہ نیا بنا ہے۔ بہت شان دار لوکیشن پر ہے۔ تیسرے فلور پر چوکیدار کا کمرا زیر تعمیر ہے۔ اگر تم کہو تو لے لوں۔"

"پتا نہیں۔۔۔ سمجھ میں آئے تو دیکھ لیں۔" اس نے اپنے حواس بحال کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔۔ ایسے نہیں لیا جا سکتا۔۔۔ تمہارے پاس آبائی مکان کی فروخت کے بعد جو رقم ہے، فی الحال وہ دے دو، ہم یہ بنگلہ بیچ کر نفع کما لیں گے۔" حبہ سوچوں میں گم ہو گئی۔

جب انسان فیصلہ کرنے پر اختیار نہ رکھ پاتا ہو تو اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ جاتے ہیں۔ حبہ نے برا سا منہ بنایا تو ریان نے سختی سے کہا۔

"آج تک کوئی قربانی نہیں دی تم نے اور بیٹھے بٹھائے سب کچھ وصول کیا ہے۔ حالات دیکھ رہی ہو، گاڑیوں کے بزنس میں سرمایہ کاروں کو صبح سے گھسیٹا پھر رہا ہوں۔ کبھی شاپنگ کے بہانے احسان کرتا ہوں، تو کبھی بازار حسن کے دھکے کھا رہا ہوں، تاکہ موٹی اسامیاں جال میں پھنسی رہیں اور تم ہو کہ نہ زیور دے سکتی ہو نہ پیسہ؟"

وہ چوٹی کھول کے سوتی تھی۔ ریان نے جھٹکے سے بال کھینچ کے اس کے چودہ طبق روشن کیے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ فضیلہ جاگ رہی تھی یا شاید اپنی ماں کی سسکی سے چونکی تھی۔ بہرحال کروٹ بدل کے بولی۔

"میں کہہ رہی تھی نا آپ سے۔ اتنا نہ کھپا کریں کچن میں آپ۔ کوئی فائدہ نہیں اتنی بے وقوفیاں کرنے کی۔ انہیں تو صرف پیسہ چاہیے، وہ مل جائے تو ٹھیک ہے۔"

"سو جاؤ فضیلہ!" وہ کراہ کر بولی۔

اسے یہ بھی تو اچھا نہیں لگا کہ جوانی کی سرحدوں کو چھونے والی بیٹی باپ سے نفرت کرے یا بدگمان ہو جائے لیکن قدرت نے بہت سی باتیں اپنے اختیار میں رکھی ہیں۔ اولاد اور والدین کے رشتے میں محبت یا نفرت، سرد مہری یا گرمجوشی، دوستی یا فاصلوں کے عذاب وقت اور رویوں کو دان کر دیتے ہیں۔ ریان اپنا اصلی چہرہ نہ دکھاتے تو فضیلہ بدگمان نہ ہوتی اور حبہ بھی مثبت انداز میں سوچتی۔

وہ اوندھے سیدھے تیار ہو کر ایئرپورٹ چلے گئے۔ صغریٰ اور وہ کمرا صاف کرتے ہوئے اچھے خاصے پریشان ہوئے۔ کارپٹ پر بوتلوں کے کارک، شیشے کے ٹوٹے ہوئے گلاسوں کے ٹکڑے، بجھے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے اور عجیب و غریب بو، اس نے تو آگے بڑھ کے فوراً کھڑکیوں کے پردے سرکا دیے۔ بہت کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کہ رات بھر یہاں کیا ہوتا رہا ہے، لیکن فضیلہ کو کوچنگ جانا تھا۔ اس لیے اس نے تیاری کے بہانے اس کمرے کا پھیرا نہیں لگایا۔ حبہ نے اس کے ضروری کپڑے، اسٹیشنری اور جوتے اسے لا دیے، صغراں محلے کے دو اور گھروں میں بھی جاتی تھی۔ حبہ کو بیٹھے بٹھائے نئی فکر ہونے لگی کہ کہیں یہ بھانڈا محلے کے کسی گھر میں نہ جا پھوڑے۔ عزت بنانے اور ساکھ جمانے کے لیے برسوں لگ جاتے ہیں لیکن اسے بگڑتے، خراب ہوتے وقت چند سیکنڈ بھی نہیں لگتے۔ صغراں نے بھاپ بھی نکالی تو ریان کا کیا ہو گا؟ اتنا تو صغراں بھی سمجھ گئی ہے کہ مالکن خود اس کمرے میں اٹھی بیٹھی نہیں ہے لیکن عزت اور خاص کر میاں اور بیوی کا بھرم سانجھا ہوا کرتا ہے۔

"آج کچرا تم پھینک آنا کچرا کنڈی میں۔"

چند منٹ بعد ریان کا میسج آیا تو وہ ہرگز بھی نہیں چونکی، لیکن دن دیہاڑے کچرا اٹھائے وہ گلی سے کیسے گزرے گی۔ خواتین اس وقت سبزی خرید رہی ہوتی ہیں۔ کچھ مرد حضرات کاموں پر جا رہے ہوتے ہیں۔ ان کی پیاری اور خاندانی بیویاں انہیں گھروں کے صدر دروازوں تک اللہ حافظ کہنے آتی ہیں تو پڑوسیوں سے علیک سلیک کرنے کھڑی ہو جاتی ہیں اور پھر کچرا پھینکنے کا کام روزانہ صغراں کرتی ہے۔ اگر آج اسے ٹوکا جائے تو وہ کیسا محسوس کرے گی۔ اور اگر صغراں لے جا کر کہیں کھلے میدان میں رکھ دے اور کوئی ان ٹوٹی ہوئی بوتلوں کی سن گن لے لے تو۔۔۔ لیکن کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ حبہ نے صغراں کو اس قدر مصروف کر دیا کہ وہ بوکھلا کے خود ہی کچرا اٹھانا بھول گئی۔ فضیلہ کے کوچنگ جاتے ہی اس نے چادر کی بکل ماری اور کچرا اٹھا کے پھینک آئی۔ کس طرح اس نے سانس کو بے قابو ہونے سے بچایا۔ یہ بھی اپنی نوعیت کا خاصا انوکھا تجربہ تھا۔

رات گئے جب ریان کا موڈ خوش گوار تھا تو حبہ نے ہمت کر کے کہا۔

"آئندہ گھر والی مہمان داری ذرا احتیاط سے کیجیے گا۔ جوان بیٹی گھر میں ہے۔ بہنیں، بھائی سب ہی تو پڑوس میں رہتے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے، کاروبار بند کر دوں؟" ان کا لہجہ بگڑ رہا تھا۔

"ایسا تو نہیں کہہ رہی میں۔ لیکن یہ پینا پلانا اور دیسی دعوتیں ہمارے ماحول میں کہاں جچتی ہیں۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"یہ تو چند ایسے کلائنٹس ہیں جنہیں باہر لے کر جانا افورڈ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اپنی جیب سے کچھ خرید لائیں تب بھی ہم نخرے دکھائیں۔ تم تو چاہتی ہی نہیں ہو کہ میرا کاروبار پھلے پھولے۔ بس تمہیں تو اللے تللے سوجھتے ہیں یا یہ پردے داری۔"

وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ حبہ نے اٹھ کر پانی کا گلاس بھرا اور بڑے بے ہنگم انداز میں غٹاغٹ پانی حلق میں انڈیلا۔ غصہ اسے بھی شدید آیا تھا۔ جسے وہ پانی کی ٹھنڈک سے زیر کرنا چاہتی تھی۔

"اور بیٹی کے بارے میں بات نہ کیا کرو۔ آج کل اچھے اچھے گھروں میں یہ کام ہو رہے ہیں۔ دنیا کے ساتھ چلنے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں یہ طریقے پتا ہوں۔"

"رہنے دیں اپنا نظریۂ تربیت ہم اسے شریعت کے تقاضے سکھادیں۔ ناظرہ قرآن کی تعلیم دے دیں' گھر گرہستی اور دنیاوی علم سکھادیں۔ بڑی بات ہے۔"
اب کے وہ ٹھیک ٹھاک اعتماد سے بولی۔
"اس لیے تو تم پیچھے ہو۔ مسز درانی کے ہاں جاؤ تو جدید تراش خراش کے بلاؤز پہنے سامنے آتی ہیں اور چھوٹتے ہی ڈرنک کی آفر دیتی ہیں۔ شوہر بھی خوش اور بیوی بھی۔ دونوں مطمئن کر کے دوستوں کو رخصت کرتے ہیں اور اگلے روز ان کے کام چٹکی بجاتے ہوتے ہیں۔"
"میں کیا بحث کروں اب' مسز درانی ہی اچھی ہوں گی۔ جو جیسا لائف اسٹائل کسی کو بھلا لگتا ہے' وہ اختیار کر لیتے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ مجھ میں وفا یا خلوص سے رشتے نبھانے کی صلاحیت نہیں۔ لیکن اگر ایسا ہے بھی تو آئندہ اور کوشش کر دیکھوں گی۔"
"تم سات جنم بھی لے لو تو ان کامیاب عورتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ تم کو کچھ نہیں آسکے گا کبھی پینڈو!" وہ گرجتے ہوئے بولے۔
وہ خاموش ہو گئی۔ غصے کو اندر ہی اندر پیتے ہوئے وہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ اسے برداشت کرنا بھی خوب آتا ہے۔

☼ ☼ ☼

اس شب وہ گہری نیند سو گئے تو وہ چپکے سے گیلری میں آگئی۔ یہاں قریب ہی آرام دہ کرسی رکھی تھی' وہ اپنا وزن اس پر منتقل کر کے گویا اس سے سہارا لے رہی تھی۔ پتا نہیں زندگی اب کس زاویے سے ہاتھ ملانے یا ہاتھ چھڑانے آئے گی؟
معلوم نہیں ہماری مائیں اچھی عورتیں تھیں یا مسز درانی جیسی بے باک اور آزاد خیال عورتیں اچھی ہیں۔ ہمارے باپ شریف النفس اور درویش قسم کے مرد تھے یا جھولیاں بھر بھر کے کامیابیاں اور مالی وسائل اکٹھا کرنے والے آج کے مرد جلد باز ہیں۔
پچھلے وقتوں میں جنت کا تصور کر کے احتیاط بھری زندگی گزاری جاتی تھی۔ آج کل دنیاوی جنت کے تصور میں ابدی زندگی کو بھلا دیا جاتا ہے۔ لوگ بہت بے صبری سے خوابوں کی تعبیر چاہتے ہیں۔ خواب دیکھنا تو بری بات نہیں' یہ تو زندگی اور امید کی علامت ہوتے ہیں' لیکن اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے ہر جائز و ناجائز کام کرنا۔ ترقی کے نام پر اخلاقی حدود سے گزر جانا یا اپنے معزز رشتوں کو داؤ پر لگانا تو سراسر غلط ہے گناہ ہے۔ یہ رویہ جس نسل کی رگوں میں خون بن کر دوڑنے لگے اس سے پناہ نہ مانگی جائے تو اور کیا کیا جائے۔
اسے پیاس محسوس ہوئی تو وہ دھیرے دھیرے باورچی خانے میں گئی۔ اس نے آج کے اس جدید دور میں بھی مٹی کی صراحی اور تانبہ کا قلعی دار پیالا سلیب پر رکھا ہوا تھا۔ اسے خیال آیا کہ کیا وہ بوڑھی روح ہو چکی ہے۔ مٹی کے کونڈے' صراحیاں اور یہ آباء و اجداد کی چاندی کے برتن' یہ سب کیا متروک ہو جانے چاہئیں' پھر ان میں پانی کا پہلا گھونٹ لیتے ہی ٹھنڈک سی کیوں پڑ جاتی ہے۔
ریان نے کہا تھا۔ "تمہاری اولڈ فیشن ممی آج بھی فریج کو چھوڑ کے صراحی والا پانی پیتی ہیں۔" حبہ کے چہرے کا رنگ نہیں بدلا تھا۔
"چلیں یہی سمجھ لیں کہ کچھ لوگ اپنی اساس سے جدا نہیں ہونا چاہتے۔" جواباً" ریان ٹیلی ویژن کے چینل بدلنے میں مشغول ہو گئے تھے۔
رات کا پچھلا پہر ہو گا' جب اس نے تائی جان کو میسج کیا۔
"کیا آپ صبح فرصت کے کسی وقت مجھے فون کر لیں گی؟"
حالانکہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ تائی جان نے سیل فون کا استعمال ابھی نہیں سیکھا۔ وہ کسی بیٹی یا بہو سے میسج پڑھوائیں گی۔ پھر وہ خوامخواہ وسوسے بھی پال لیں گی اور ہر کوئی پوچھے گا' کیوں فون کروایا' خیریت تو ہے؟ وہ کس کس کو کیسے بتائے گی کہ بظاہر ہنستے بستے گھر خیر و عافیت سے ہوتے ہیں۔ مگر وہ انجانے طوفانوں کی

زد میں بھی ہوتے ہیں۔ آندھی کی پہلی لہر ہی ان کے آشیانے کو تنکا تنکا کرکے رکھ سکتی ہے۔

میرا خیال ہے مجھے تہجد کی نماز پڑھ کے سوجانا چاہیے اور اپنی زندگی کو ایشو نہیں بنانا چاہیے۔ صلح جو طبیعت نے اپنے آپ کو ہدایت کی اور وہ روبوٹ کی طرح واش روم میں چلی گئی۔ سجدے میں گر گر گڑگڑاتے ہوئے گھر کی خیروبرکت کے لیے دعائیں کیں۔ اگلی سہ پہر کو تائی جان نے فون کیا مگر وہ صبح تک فیصلہ کرچکی تھی کہ انہیں ہی کیا کسی سے بھی کچھ نہیں کہے گی، لیکن اس کے ارادے پختہ نہیں رہے۔ وہ ان سے مشورے کی خاطر ان سے ملنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے اس نے ریان کے رویے سے متعلق اشارتاً بہت کچھ بتادیا۔

"لیکن کیا ایک بار پھر تم اسے روپیہ دے کر خود محتاج نہیں ہوجاؤ گی۔ پہلے بھی تم نے ایک بار ایسا کرکے دیکھ لیا ہے نا۔ اچھا چلو شام کو چکر لگالو۔ بہو بیٹی کوئی گھر پر نہیں ہوگی۔ ہم اکیلے میں اونچ نیچ پر غور کریں گے۔" پھر حبہ بھاگ بھاگ کے ہر کام نپٹانے لگی۔ ایک گاڑی ان دنوں شوروم سے گھر پر تھی۔ پرانی گاڑی تھی۔ خریدار نہیں مل رہے تھے۔ اس لیے گھر پر کھڑی کردی گئی تھی۔ حبہ نے فوراً" سی این جی بھروالی" تاکہ وہ پبلک ٹرانسپورٹ کے چکر اور خواری سے بچی رہے۔

"فضیلہ بیٹا! بہت دن ہوگئے تایا، تائی کے ہاں نہیں گئے" آج چلیں کیا؟" اس نے کمپیوٹر پر مشغول اپنی بیٹی کی توجہ چاہی۔

"میں تائی جی سے ملنے جاؤں گی" اچھا ہے تم بھی چلو بہت دن ہوگئے گھر سے باہر گئے نہیں، یہ نئی گاڑی بھی ٹرائی کرلیں گے۔"

"میں نے اسٹارٹ کی تھی گیراج میں، فضول سی ہے۔" اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

"میں ڈرائیو کرلوں گی۔ چاچا جی بھیل پوری لے جائیں گے، وہیں کھالیں گے۔"

وہ دونوں تیار ہونے لگیں۔

ریان اس وقت کسی میٹنگ میں تھے جب انہیں میسج ملا کہ "آج بوریت سی ہورہی ہے کیا میں اور فضیلہ تائی جان کے ہاں ہو آئیں؟"

"تم لوگ ہی چلی جاؤ، مجھے تو ایک تقریب میں جانا ہے، واپسی میں رات ہوجائے گی۔" ہر دفعہ کی طرح آج بھی روکھا سا جواب آیا۔

اسی جواب کی توقع تھی۔۔۔ اس نے میسج پڑھا اور اپنے دل کو تسلی دے لی۔ "آج تو ویسے بھی ریان! آپ نے ساتھ لے جانا ہی نہیں تھا۔ اب آپ چاہیں رات گئے لوٹیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

☼ ☼ ☼

تائی جی کے گھر پہنچتے ہی کھانوں کی خوشبوؤں نے استقبال کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھ ہی لیا۔

"کیا آج گھر میں کوئی دعوت ہے؟" تائی جی نے چھالیہ کاٹتے سروتہ ایک جانب رکھ دیا۔ "سمجھو تمہاری ہے۔ بڑی بہو زلیخا نے کسی رسالے میں عالمگیری پلاؤ کی ترکیب پڑھی تھی" آج وہ کامیاب تجربہ کرچکی ہے لیکن میں نے کہا کہ اصل جج تو حبہ ہوگی، وہ ماہر ہے پکانے میں۔"

"مگر تائی جی! میں نے گھر میں کسی کو بتایا نہیں اور یہ چاٹ، برگر، چاؤمین اتنا سب بھی لے آئی ہوں۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"میں جانتی ہوں ریان کے بغیر کھانا نہیں کھاتیں تم۔ اسے فون کرکے بلالو۔ ہم سب کچھ تھوڑا تھوڑا چکھ لیں گے۔ اب کوئی بہو، بیٹی رات ایک بجے سے پہلے لوٹنے والی نہیں۔ تم بتاؤ کیا رویہ ہے تمہارے ساتھ ریان کا؟" تائی جی نے نرم لہجے میں کریدا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"کچھ بہت اچھا نہیں ہورہا" جو دن خوشی خوشی طلوع ہوتا ہے، وقت پر ہر چیز دستیاب ہوجاتی ہے۔ طلب کرتے ہی چائے، لانڈری، جوتے، کاغذات، ضروری دوائیں، مگر پھر بھی جوان بیٹی کے سامنے

پھوہڑپن کے طعنے دیے جاتے ہیں۔ وہ شدید جھنجلاتی ہے۔ ہمارے وقتوں میں اماں ابا کب بچوں کے سامنے آپس میں ایسی تکرار کرتے تھے۔ ہم نے تو کبھی ماں کو باورچی خانے میں چپکے چپکے روتے نہیں دیکھا۔ کس طرح آج ہمیں وہ جنتیں یاد آتی ہیں۔ جب تک امی زندہ تھیں، ریان کبھی اونچی آواز میں کسی کو بلاتے تک نہ تھے۔ اب گھر میں قدم رکھتے ہی شیروں کی طرح چنگھاڑتے ہیں۔ بزرگ کتنی بڑی نعمت ہوتے ہیں۔ زندگی میں پیار محبت کے علاوہ توازن بھی قائم رکھتے ہیں۔ رات بھر ٹیلی ویژن دیکھتے رہنا، وقت بے وقت کھاتے پیتے رہنا" فیس بک پر دوستوں سے چیٹنگ، ایس ایم ایس یا پھر گھر سے چلے جانا اور گرتے پڑتے جھومتے ہوئے علی الصبح گھر لوٹنا۔۔۔ یہ سب کچھ شاید اس لیے ہورہا ہے کہ میں اچھی بیوی نہیں ثابت ہوسکی۔"

"ریان نے کبھی اچھی بیوی کی تعریف کی، میرا مطلب ہے کن لفظوں میں؟" وہ کہتے کہتے رک گئیں۔

"پہلا وصف خوب صورتی، دوسرا ایثار پسند، تیسرا کنبہ بنانے والی اور چوتھی خوبی، اس کا بار بار لاٹری کا نکلنا۔۔۔ یہ سب میری کمزوریاں ہیں۔ میرا رنگ شہابی نہیں۔ نقوش کا کیا کرنا، جب رنگ ہی گندمی ہو۔ اولاد میں بھی لے دے کے یہی بیٹی بچی ہے۔ اس لیے میں بدنصیب کنبہ نہ بناسکی اور لاٹری بھی کوئی نہیں نکلی۔ اب بتائیے! میرے والدین کا گھر بکا تو میرے حصے کی آدھی رقم کاروبار میں لگادی۔ ان دنوں میں حور پری بھی تھی اور کنبہ پرور بھی، اچانک کاروبار تنزلی کا شکار ہوا تو محبت بھی ہوا برد ہوگئی۔"

"گروسری کے لیے اخراجات کس کے ذمے ہیں بیٹا!" تائی جی کی آواز دور کسی پاتال سے آتی معلوم ہوئی۔

"کبھی چھٹی کے دن خود سودا لے آئیں تو لے آئیں، ورنہ عام دنوں میں نہیں۔"

"اس طرح تو تم اپنا جمع جتھا سب کچھ خرچ کر بیٹھو گی۔ کیا تمہیں جوان بیٹی گھر کی دہلیز پر بیٹھی نظر نہیں آئی؟"

"تائی جی! وہ اپنے اس رویے پر فخر کرتے ہیں یا اپنی محتاج سمجھ کر ایسا کرتے ہیں۔ اس وقت ان کی شعلہ بر آنکھیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر نہیں" آپ ریان کا یہ روپ کبھی نہیں دیکھ سکتیں وہ بہت بڑے اور کامیاب اداکار ہیں۔ میں اتنے برسوں میں انہیں سمجھ نہیں سکی۔" حبہ نے کمال ضبط سے اپنی بکھری ہوئی خانگی زندگی کا نقشہ کھینچا۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہوگا" مگر تمہارا ردعمل کیسا ہے؟ ظالمانہ" انتقام بھرا یا مفاہمت اور پیار کا سایہ لیے ہوئے؟"

تائی جی نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ پہلو بدل کے بولی۔ "انسان ہی ہوں نا تائی جی! تنہائی کے غاروں میں بھٹکتی پھرتی ہوں۔ ہر چیز ٹھیک کرنے کی کوشش میں خود کو کہیں رکھنا بھول گئی ہوں۔ میں کون تھی کیا بن گئی ہوں۔ ایک شب زار چٹان جیسا مقدر ہے میرا۔ مجھ پر وہ کیوں خوش رنگ گلابوں کی مہک برسائیں گے۔ ایک ضرورت کا رشتہ ہے، کبھی خیال آجائے تو پاس آجاتے ہیں ورنہ دھتکارنا تو انہیں خوب آتا ہے۔ مجھے شکایت کرنا سکھایا ہی نہیں گیا۔ بہت ہوتا ہے تو فضیلہ پر غصہ اتار لیتی ہوں مگر اس کے سامنے ان سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرتی، کہیں بھرم ہی نہ کھودوں۔ ایک فریادی شہزادی جیسی زندگی ہے میری۔ شہزادی تو کسی کے روبرو فریاد کرسکتی ہے۔ میں صرف اپنے آپ کو بہلاوے اور تسلیاں دیتی رہتی ہوں۔ بات بات پر جھڑکنا، طعنے دینا اور سب سے بڑا مسئلہ یہی تو ہے کہ میری کوئی لاٹری نہیں نکلی۔"

"نہیں حبہ ایک بار تو نکلی تھی پانچ لاکھ کی۔۔۔ اور تم نے دیکھا کہ اس نے پرانی گاڑیوں میں سرمایہ کاری کی مگر یہ تمہارا قصور تو نہیں کہ گاڑیوں کے کاغذات مکمل نہیں تھے یا جعلی تھے۔"

"تائی جی! میرا قصور یہی تو ہے کہ میں بدنصیب ہوں۔"

"چپ ہو جاؤ' مت کوسا کرو اپنے آپ کو۔ یہ بتاؤ کوئی نیا نکاح تو نہیں پڑھوالیا اس نے؟" تائی جی کے ماتھے پر شکنیں ہویدا ہو گئی تھیں۔ وہ انہیں ایک ٹک دیکھتی رہ گئی۔

"نہیں تائی جی۔۔۔! ایک پچیس برس کی لڑکی سے عشق ضرور فرمایا جارہا ہے آج کل۔۔۔ اپنی بساط بھر تحفے تحائف کا لین دین بھی جاری ہے۔ اسے جھانسا دیا گیا ہے کہ اس کے بھائیوں کو نوکری دلوادی جائے گی۔ باپ کو بزنس میں مدد دی جائے گی اور وہ شرعی پردے کی آڑ میں پچاس سالہ بڈھے سے عشق کرکے خود کو پتا نہیں کسی پرستان کی شہزادی سمجھے ہوئے ہے۔ سمجھ سے باہر ہے کہ اسے کیا مل رہا ہے؟ دیکھنے میں شرفاء کے خاندان سے معلوم ہوتی ہے۔ لاج لج شرم وحیا کی دیوی بن کر گھر آتی رہی۔ کہنے کو وہ دفتری امور نپٹانے گھر آتی تھی مگر۔۔۔ آگے میں کیا بتاؤں۔"

"تم نے اس وقت اسے روکا کیوں نہیں؟"

"کوشش کی تھی' ناکام ہو گئی۔"

"میں تمہیں اب صبر و شکر کے علاوہ کیا مشورہ دوں۔ ہمت کرو تو کرائے پر ایک گھر لو اور بیٹی لے کر الگ ہو جاؤ' اپنا کماؤ کھاؤ' اپنے آپ کو ایک بار پھر دریافت کرو۔ میرا نہیں خیال کہ تمہارے چلے جانے کے بعد اس کا رویہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ وہ تنہائی کا شکار ہوگا تو تمہاری قدر بھی کرے گا۔ تمہارے تمام بھائی بہن اپنے اپنے گھروں کے ہو گئے ہیں اور جوان بیٹی کا یوں کسی کے در پر جانا مناسب نہیں ہے۔ لیکن پہلے ملازمت ڈھونڈو۔ روپیہ تمہارے بینک میں ہے۔ تم کبھی ہاتھ نہیں پھیلاؤ گی کسی کے بھی آگے' پھر اگر بیٹی کا خرچہ دیتا ہے تو ویل اینڈ گڈ' ورنہ ہماری سپورٹ ہمیشہ رہے گی۔ لیکن ایک بار سوچ ضرور لینا کہ مرد آسانی سے پچھاڑ نہیں کھایا کرتا' نہ ہی اپنی طرف کیے جانے والے وار کو آسانی سے سہہ لیتا ہے۔ وہ برابر چوٹ کرے گا۔ اپنی بدکرداری مرد کو اپنی شان دکھائی دیتی ہے اور عورت کا پہلا ہی قدم اٹھے تو اسے زندہ درگور کرنے میں دیر نہیں لگاتا اور یہ بھی جان لو کہ جو بنا کچھ کیے گالم گلوچ اور مار پیٹ کر سکتا ہے۔ وہ بغاوت کو کن معنوں میں لے گا۔ تمہیں گھر نہیں اجاڑنا ہے۔ اتنا خیال رکھنا کہ سمجھ دار عورت اپنے لیے آپشن رکھا کرتی ہے۔ تاکہ اپنا دین' وقار اور اپنا مان نہ کھوسکے۔ دنیا کی دو دھاری تلوار پل صراط سے مشابہہ ہوا کرتی ہے بیٹا! اس پر ننگے پیروں سفر کرنا' تم سمجھ سکتی ہو کہ بچوں کا کام نہیں ہوتا۔"

"یہ سب آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں تائی جی! میں کہاں گھر چھوڑنا چاہتی ہوں' لیکن میرے لیے طعنے سہنا کٹھن ہوتا جارہا ہے۔ وہ کئی بار کہہ چکے ہیں' پھر کب جارہی ہو تم؟ اور میں جواباً" کہتی ہوں چلی جاؤں گی۔"

"اچھا یہ نوبت بھی آگئی ہے تو مزا چکھا ہی دو صاحبزادے کو۔ ہوش ٹھکانے آجائیں گے گھر میں کوئی عورت نہ ہوئی اور چولہا ٹھنڈا پڑا رہا تو۔"

تھوڑی دیر ہی میں رات کے دس بج گئے۔ فضیلہ بھی ٹی وی دیکھ دیکھ کر اکتا سی گئی تو حبہ نے تائی جی سے رخصت چاہی۔ آج وہ ان کے ہاں سے لوٹتے وقت اپنے اندر کی عورت کو مضبوط پارہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"پھر ہفتے بھر ہی میں اس نے ایک این جی او میں ملازمت کرلی۔ شروع شروع میں اسے بہت شکایات ہوئیں۔ دفتری سیاست' پیشہ وارانہ حسد اور مقابلے کے سخت رجحان میں وہ خود کو دلدل میں پھنستے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ یہ کوئی ماورائی قوت ہی تھی' جو اسے سنبھالا دیے ہوئے تھی۔ اسے ہر پچھاڑ پر فضیلہ کا چہرہ نظر آنے لگتا۔

اسے یہ احساس ستاتا تھا کہ کم سن اور معصوم بچی کو مستقبل میں کن حالات سے نپٹنا پڑ سکتا ہے۔ بہت دنوں تک اسے یوں ہی محسوس ہوتا رہا کہ جیسے وہ نیند میں چل رہی ہو۔ آنکھیں بے خوف مگر پیر زخمی' جیسے رستوں میں خاص طور پر شیشوں کے تراشے پھیلا دیے گئے ہوں۔ پھر رفتہ رفتہ دفتری کامیابیوں کی تعداد

بڑھنے لگی۔ اس نے اتنی محنت ضرور کی کہ دفتر کی ضرورت بن گئی۔ یوں اس کی مجبوری کو اچھا معاوضہ ملنے لگا۔ یعنی اس کے ہر سال انکریمنٹس کی تعداد بڑھنے لگی۔ اب اس نے قسطوں پر ایک چھوٹی گاڑی لے لی تھی کہ کم از کم اس نے فضیلہ کو باپ کی ایک آسائش سے محرومی کے بعد چھوٹا سا سہی تحفظ تو دیا۔

ریان نے دو' ایک بار بیٹی کو میسج کیے۔ جس کا اس نے بہت سرد مہری سے ذکر کیا۔ ریان کی سالگرہ کے دن وہ چپکے سے گھر گئی۔ ایک پرفیوم' ایک گلاب اور اپنے ہاتھ سے بیک کی ہوئی براؤنی ٹیبل پر رکھ کر واپس آگئی۔ صغراں کہتی رہ گئی "صاحب کو جگادیتی ہوں' ان سے تو ملتی جاؤ۔" "امی میرا انتظار کررہی ہیں۔ انہیں دفتر سے دیر ہو رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ زینہ عبور کرکے سڑک پر آگئی۔

گاڑی میں پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولی۔ "امی! صغراں روک رہی تھی۔ پاپا تو ابھی سو رہے تھے۔" اور اس نے گھڑی پر نظریں جمادیں۔ ٹھیک گیارہ بج رہے تھے۔ حبہ نے گاڑی آگے بڑھادی۔

"اللہ ہم دونوں کو زندگی سے کاندھا ملا کے چلنے کے لیے حوصلہ دے۔"

حبہ نے دل ہی دل میں صبر و استقامت کی دعا کی۔ وہ دونوں ماں' بیٹی زندگی کی رگڑ کھا کے نڈھال نہیں ہوئی تھیں۔ حالانکہ حبہ ذاتی زندگی کے ہاتھوں بری طرح پٹی تھی۔ فضیلہ بھی زندگی اور معاشرے کو سمجھنے کی کوشش میں پسی جارہی تھی۔

ڈھائی بجے اسے ایک عجیب سا میسج ملا۔ یہ گلزار کی ہائیکو تھی اور اسے ریان نے نقل کیا تھا۔

"تمام صفحے کتابوں کے پھڑپھڑانے لگے
ہوا دھکیل کے دروازہ آگئی گھر میں
کبھی ہوا کی طرح تم بھی آیا جایا کرو"

اس نے جواباً" لکھا۔ "اچھا مشورہ ہے۔"

ریان کا جواب ملا۔ "تحفے کا شکریہ۔"

اس نے جواباً" لکھا۔ "یہ آپ کی بیٹی کا تحفہ تھا میں صرف اسے گھر تک لانے کی سزاوار ہوں اور بس۔"

اور پھر سارا دن خاموشی رہی۔ وہ گھر لوٹی تو آپ ہی بے دھیانی میں منہ سے نکلا۔ "پاپا کا کوئی میسج آیا؟"

"صرف تھینک یو لکھا تھا وہ بھی سہ پہر چار بجے۔" حبہ خاموش ہو گئی۔ وہ بتا نہ سکی کہ اسے بھی ان کے کچھ میسج آئے تھے۔

برسوں کی جمی گرد آسانی سے صاف نہیں ہوا کرتی۔ اس عمل میں تو سانسیں رکنے لگتی ہیں۔ اضطراب کی اس کیفیت کو طب کی زبان میں دمہ ہو جانا کہتے ہیں اور دمے کی دوا کرو تو تھکن روح میں جاکے ڈیرا جمالیتی ہے۔

☆ ☆ ☆

"واپسی کا راستہ کھلا رکھنا۔" حبہ کی ایک ہمدرد خاتون نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا یہ کمزوری کی دلیل نہیں اور کیا عزت نفس اس طرح مجروح نہیں ہوتی۔"

"ہوتی ہے' بالکل ہوتی ہے' لیکن اجڑی ہوئی عورتوں کی بیٹیاں ڈولی نہیں چڑھا کرتیں۔ انا اور ظلم کی بھٹی میں پسا کرتی ہیں۔ کوئی سورما نہیں آتا انہیں بیاہنے اور کیا مرد کی عیاشی کی کہانی اولاد سے لے کر داماد تک کو سنانا بس کی بات ہے؛ کوئی یقین نہیں کرتا ان باتوں پر' سب عورت کو الزام دیتے ہیں کہ نباہ نہ کرنے والی اپنی کوکھ کی پلی بیٹی کو گھر بسانا کیا سکھائے گی اس لیے کہتی ہوں' میاں سے سمجھوتہ کرلو۔ عقل تو ٹھکانے آگئی ہوگی اب تک' تنہائی بھی کوئی معمولی استاد نہیں ہوتی۔"

"غلطی کسی کی ہو قصوروار عورت' گناہ کوئی کرے عذاب بھگتے عورت' یہ دنیا دوغلوں کی کیوں ہے؟" حبہ نے مسز احمد سے اپنا دکھ بیان کیا۔

"یہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی اور اس نے بدلنا نہیں ہے۔ ہمیں یہی باسی گلی سڑی روایتوں والی زندگیاں گزارنی ہیں۔ اس گلاب کو دیکھو! کانٹوں کے سہارے خوشبو بکھیرتا ہے ناں اس تک نے سیکھ لیا کہ فرار ممکن نہیں۔" وہ کمال ضبط سے بولیں۔

"میں نے فرار حاصل نہیں کیا' میری گھٹن بڑھ گئی تھی۔ محرومیوں کی گھٹن' نارسائی کا دکھ' نظر انداز کرنے کا عذاب اور اذیت سب مجھ پر وار کرتے رہتے تھے۔" اس نے انکشاف کیا۔

"وہ تو چپکے سے اب بھی تمہارے وجود میں اترتے ہوں گے تم یوں ہی تو اتنی نمازیں نہیں پڑھا کرتیں۔"

"مجھے ایک دم احساس ہوا کہ شاید میں نے اپنے رب کو ناراض کر دیا ہے' جو میری زندگی الجھنوں میں گھر گئی اس لیے میں نے فرضوں کے ساتھ نفلوں کی ادائیگی بھی شروع کر دی اور کچھ نہیں۔ اسے خود غرضی نہ سمجھو تم۔" حبہ کو سہیلی کا ٹوکنا اچھا نہیں لگا۔ لوگ ایک ایک فعل پر کیسی ناقدانہ نظریں رکھتے ہیں اس کا اندازہ نہیں تھا اسے۔

"مگر انہوں نے تمہاری بے رخی دیکھ کر دوسرا نکاح پڑھوا لیا تو۔۔ بھئی مرد ہیں۔ یہ تو بھٹکنے والی کے نصیب کہ اندر سے کیسے نکلتے ہیں۔ انتقام تو لے سکتے ہیں ناں وہ۔"

"کچھ بھی کر لیں مگر بے انصافی نہ کریں' کبھی کبھی میرا آدھا ادھورا علم حیرت سے سوال کرتا ہے کہ نیلی چھتری والے کو اپنے ہی تخلیقی فن پارے اس مرد کی خصلت اور جبلی تقاضوں کا کیسا ادراک تھا جو اس نے انہیں چار نکاح جائز کیے' اکٹھے چار۔۔۔ پہلی بیوی کی کیا مجال کہ مرد کو محض اس لیے قابل نفرین ٹھہرائے مگر اولین شرط تمنا اور خواہش کی تکمیل کی نہیں' انصاف کی رکھی ہے۔ مردوں کو بڑا ظرف چاہیے۔ جنت کمانے کے لیے۔ دنیاداری کا کیا کیا ہے یہاں تو جذبوں کی بلیک میلنگ اور چیٹنگ سے ہزاروں عورتوں کو گرویدہ بنایا جا سکتا ہے۔ وہ کر لیں جو کرنا ہے' ایک ہی بار کریں گے ناں۔ اپنا امتحان بھی انسان ایک بار ہی لیتا ہے' خوش ہوتا ہے یا مایوس۔ سب کچھ نصیب کے کھاتے میں ڈال کر اطمینان کر لیتا ہے۔"

"اچھا میں بات کروں ان سے۔ کہتی ہوں آر پار کریں زندگی کو۔ کیا تماشا بنانے پر تلے بیٹھے ہو آپ دونوں کیوں؟"

"باوجود اس کے کہ میں تجدید نہیں چاہتی مگر تم اپنا شوق پورا کر لو۔"

"اچھا ہوا' تم نے حسرت کا لفظ استعمال نہیں کیا' تمہارے لہجے میں زندگی کی رعنائی کی مہک میں نے محسوس کر لی ہے۔ دیکھو فوراً" آجائیں گے۔"

"آتو جائیں گے مگر ٹیلا پن بھی ہمراہ لائیں گے۔"

"نہیں ناکام شوہر نہ رہنے دو۔"

"نہیں' میں ہوں ناں' ناکام بیوی۔ تم کوشش کر دیکھو۔ قسمت میں اگر ایک دکھ لکھا ہے تو اور صبر آزما لوں گی۔"

"مان لیجئے ناں امی! اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔"

فضیلہ نہ جانے کب سے برآمدے میں کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ حبہ کانپ اٹھی۔ خون کے رشتوں کی بے حسی نے اس پھول سی جان کو اتنا بے بس کر دیا تھا کہ وہ گھر لوٹنے کی خواہش کر بیٹھی۔ سال عید آرہی ہے۔ عید پر گھر میں ہونا چاہیے۔ عورت گھر بناتی ہے۔ سجا سنوارتی ہے ہر ذرے' ہر اینٹ میں وفا سموتی ہے۔ یوں بنیاد پڑا کرتی ہے محبت کے رشتے کی۔ ورنہ دھول اڑتی رہتی ہے' نفرت کے جہنم میں سب کچھ بھسم ہو جاتا ہے حتیٰ کہ پیار بھی۔

انسانی حقوق کا دعوا کرنے والی باہمت عورت کے اندر سے آواز آرہی تھی۔

اگلے روز ریان نے دھیرے دھیرے وہ زینہ عبور کیا جو حبہ اور فضیلہ کی جائے اماں کی جانب بڑھتا تھا۔

وہ دھیرے سے بولے۔ "چلو حبہ! گھر چلو' عید آرہی ہے۔"

حبہ نے ڈرتے ڈرتے اس بیگ کو تھاما جسے فضیلہ دو روز سے پیک کر کے بیٹھی تھی۔

وہ اپنا پڑاؤ سمیٹ کر لوٹتے وقت یوں رونے لگی' جیسے آج ہی وداع ہو کے سسرال آئی ہو۔

☆

صائمہ اکرم چوہدری

رضیہ بوٹی فرام ٹوبہ ٹیک سنگھ کو بلیو جینز' وائٹ شرٹ اور پھولوں والے اسکارف میں کیمپس آتا دیکھ کر ان چاروں کو تو جیسے سکتہ ہی ہو گیا تھا۔ ان چاروں کے منہ جو کھلے تو اس کے بعد بند ہونا بھول گئے۔ وہ سب ہونق چہروں کے ساتھ اسے یوں دیکھنے میں مگن تھیں کہ جیسے باراک اوباما نے اپنی سب نامعقول حرکتوں پر معافی مانگ لی ہو اور ڈرون حملے بند کرنے کا اعلان کر دیا ہو یا پھر فلم اسٹار میرا نے غلط انگلش نہ بولنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

ان چاروں کا تعلق اگرچہ پولیٹکل سائنس ڈیپارٹمنٹ سے تھا۔ لیکن وہ سب اس وقت انگلش ڈیپارٹمنٹ کے فن فنیئر پر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے بیٹھی ہوئی تھیں اور کوئی ایسا نہیں تھا' جس پر انھوں نے ٹی وی کے اینکرز کی طرح کمنٹری نہ کی ہو۔ وہ یہ کام بڑی دلچسپی' محنت اور ذوق و شوق کے ساتھ کرنے میں مگن تھیں کہ اسی وقت رضیہ بوٹا نے بالکل کسی ماڈل گرل کی طرح چلتے ہوئے اس فن فنیئر میں انٹری دی۔ اپنے شعبے کی رضیہ کو اس حلیے میں دیکھ کر وہ سب حقیقتاً "ایک لمحے کو حواس باختہ سی ہو گئی تھیں۔

رضیہ نے خود کو ماڈرن دکھائی دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا تھا۔ لیکن اس کے اسٹائل میں جھلکتا "پینڈوپن" چیخ چیخ کر اس کی اصلیت ظاہر کر رہا تھا۔

مکمل ناول

اس نے جینز کے نیچے کھسہ پہن رکھا تھا اور ناک میں چاندی کی تھنی نے سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔

"ارے! یہ بوٹی فرام ٹوبہ ٹیک سنگھ کو دیکھو یوں لگتا ہے کہ کوئی بھیڑ راستہ بھول کے بھینسوں کے ریوڑ میں آگئی ہو۔" سب سے پہلے راحیلہ کا سکتہ ٹوٹا تھا۔ اس نے ٹھٹھا لگا کر اس کا مذاق اڑایا تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی اس وقت ہرے رنگ کے سوٹ میں ہری مرچ سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

"توبہ توبہ۔۔۔ یہ قرب قیامت کی نشانی نہیں تو اور کیا ہے؟" راحیلہ کے ساتھ بیٹھی نادیہ کو بھی ہوش آگیا تھا۔ رضیہ کو پورے دو منٹ گھورنے کے بعد وہ دوبارہ طنزیہ لہجے میں گویا ہوئی۔

"اس محترمہ کا حلیہ دیکھو، کہیں سے بھی لگتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جو پہلے دن ڈپارٹمنٹ میں خاکی رنگ کے شیشوں والی چادر ٹینٹ کی طرح لپیٹ کر آئی تھی۔ جس کے چپڑے ہوئے تیل زدہ بالوں کا تماشا، عرف "پٹاخا" نے خوب مذاق اڑایا تھا۔" نادیہ نے ان تینوں کو یاد دلاتے ہوئے اپنا بیگ کھول کر مسکارا نکالا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا، کچھ لڑکیاں آزادی کا اتنا ناجائز فائدہ کیوں اٹھاتی ہیں؟ اپنے ماں، باپ کی عزت کو بٹا لگاتے ہوئے انہیں کچھ تو خیال کرنا چاہیے۔" حنا نے زکام زدہ آواز میں گفتگو میں حصہ لیا۔ وہ اس وقت خود اپنے دبئی میں مقیم پھوپھی زاد منگیتر کو سیل فون پر میسج کرنے میں مصروف تھی۔ لیکن دوسروں کو اخلاقیات کا لیکچر دینا نہیں بھولی تھی۔ اپنی رائے کا بے تکلفانہ اظہار کر کے وہ پھر سیل فون کی جانب متوجہ ہو گئی، جہاں اس کے منگیتر کا میسج آیا ہوا تھا۔

"تم لوگوں کو کیا تکلیف ہے، کوئی جینز پہنے یا کرتا یا پھر لہنگا۔۔۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ ایویں خوامخواہ کسی کی ذاتیات میں نہ گھسا کرو۔ زہر لگتی ہے مجھے تم لوگوں کی یہ عادت۔" سندس نے ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے بے زار لہجے میں کہا۔ اسے ویسے بھی حنا پر رات سے شدید غصہ تھا۔

سندس کی بات پر ان تینوں کو کرنٹ لگا تھا۔ انہوں نے سخت حیرت، بے یقینی اور قدرے پریشانی سے خفا خفا سندس کو دیکھا جو آج پہلی دفعہ سیاہ رنگ کے اسکارف کو اچھی طرح لپیٹے ہوئے تھی۔ رات وہ جس سانحے سے گزری تھی اس کی وجہ سے باقی سب کی اجتماعی رائے تھی کہ اس حادثے نے سندس کے نازک دماغ پر خاصا برا اثر ڈالا ہے۔ تب ہی وہ ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ ورنہ دوسروں کی ذاتیات میں گھسنے کا جتنا اسے چاؤ تھا، اتنا تو اس بندے کو خود اپنے بارے میں جاننے کا شوق نہیں ہوتا تھا۔

"صبر کر میری بچی! صبر کر۔ کھرکی کھیتی ہے، پھر اگ آئے گی۔ مانا کہ صدمہ بہت زیادہ ہے۔ مگر ایسا بھی کیا غم کہ چھوٹے سے دماغ پر اتنا اثر ہو جائے۔ جب تک تم چیچہ وطنی جاؤ گی، بال کافی بڑھ جائیں گے اور تم بے بے کے لتروں سے بچ جاؤ گی۔" نادیہ نے اس کے زخموں پر نمک ہی تو چھڑکا تھا۔ سندس کی موٹی موٹی آنکھوں میں ایک دفعہ پھر آنسو آ گئے۔ وہ رندھے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔

"اس کمینی نے مجھے ایسے خواب دکھائے، کہہ رہی تھی کہ مجھ سے کٹنگ کرا لو۔ ہم سفر ڈرامے کی خرد کی طرح لگو گی، میرا بھی اس لمحے شاید ذہنی توازن خراب ہو گیا تھا جو اس ظالم نائن کے آگے جا بیٹھی۔ منحوس عورت نے ایسے بے ہودہ طریقے سے بال کاٹے ہیں کہ بالوں کا کوئی قبلہ ہی نہیں رہا، جو چار بال رہ گئے ہیں بے بے نے مار مار کے مجھے گنجا کر دینا ہے۔" سندس خاصی جذباتی ہو رہی تھی۔ اسے اپنی دادی جنہیں سب بے بے کہتے تھے، کے متوقع غصے کا سوچ سوچ کر ہی ہول اٹھ رہے تھے۔

"تم ایسا کرو، اس ہفتے گھر ہی نہ جانا۔" حنا نے سیل فون سے سر اٹھا کر مفت مشورہ دیا تھا۔

"کیوں اگلے ہفتے یہ کوئی کھاد ڈالے گی، جس سے ہری بھری فصل دوبارہ تیار ہو جائے گی۔" نادیہ نے جل کر حنا کو دیکھا جس کا سارا دھیان ٹیکسٹ میسجز کی طرف تھا جو دھڑا دھڑ آ رہے تھے۔

"خدا کے واسطے یہ میسج کی ٹوں ٹوں تو بند کرو۔ بندہ کتنا واہیات لگتا ہے، جب بھری محفل میں اس کے دھڑا دھڑ میسج آ رہے ہوں۔" نادیہ نے حنا کی طبیعت ٹھیک ٹھاک صاف کی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے نادیہ تم کو؟" حنا نے بے زاری سے سر اٹھا کر نادیہ کو دیکھا۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے اس کے سیل فون کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تینوں اس کے سیل فون سے سخت بے زار تھیں۔ وہ تھوڑا سا سنبھل کر بیٹھی اور اطمینان سے بولی۔

"نہیں! سندس اپنے بالوں میں کوئی کھاد کیوں ڈالے گی۔ اگلے ہفتے تک ہم اس کے بالوں کے لیے کوئی وگ تیار کروا لیں گے۔" حنا نے اپنی طرف سے بڑا شاندار حل نکال کر سب کی طرف فخریہ نظروں سے دیکھا۔

"اپنے پاس رکھو تم اپنی بے ہودہ وگ۔ مجھے ضرورت نہیں۔ میں تم جیسی دوست نما دشمن کے مشوروں پر اب بالکل بھی عمل نہیں کروں گی۔" سندس کا غصہ کسی طور بھی کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کی سرخ ناک دیکھ کر سب کے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"ہاں، ہاں حنا! تم نے میری چاچے کی دھی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" نادیہ نے ایک آنکھ دبا کر حنا سے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ وہ سندس کی تایا زاد کزن تھی اور اسے معلوم تھا کہ ہاسٹل کے کمرے میں پہنچ کر سندس کا باقی غصہ اسی پر نکلے گا۔ ان دونوں کا تعلق چیچہ وطنی کے کسی گاؤں سے تھا۔

"رہنے دو تم بھی اپنی ہمدردیاں، اس وقت تم ہی اس پھاپھا کٹنی کو مشورے دے رہی تھیں کہ لیئر کٹنگ کر دو اب بے بے جب مجھے اپنے لتروں سے لیروں لیر کرے گی تب سب سے پہلے تم ہی ہمارے پورشن سے بھاگو گی۔" متوقع پھینٹی کا سوچ کر سندس کی آنکھوں میں ایک دفعہ پھر آنسو آ گئے تھے۔

اصل میں ان سب کے مشوروں پر وہ آکنا مکس ڈیپارٹمنٹ کی شمشاد بانو سے بال کٹوانے چلی گئی تھی، جس سے حنا کی اچھی خاصی جان پہچان تھی، لیکن سندس کا ذاتی خیال تھا کہ شمشاد نے شاید سیکھنے کے بعد پہلا ناکام تجربہ سندس کے لمبے بالوں پر ہی کیا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ اپنے خوب صورت بالوں سے محروم ہو گئی تھی۔ یہ وہی بال تھے جو اس کی بے بے نے ہر دوسرے دن تیل کا مساج کر کر کے لمبے کیے تھے۔ رات سے وہ ایک ہزار دفعہ شیشے میں اپنے بالوں کا برا حشر دیکھ کر ان سب کو بلند آواز میں کوس چکی تھی۔ جنہوں نے بیوٹی پارلرز کے پیسے بچانے کے چکروں میں شمشاد کے ہاتھوں اس کا کونڈا کروا دیا تھا۔

"دفع کرو! ہم کوئی نہ کوئی حل تلاش کر ہی لیں گے۔ تم جٹ ہملے کملے کو دیکھو، کیسے سرخ دھوتی اور سبز کرتے میں نرا شیدائی لگ رہا ہے، قسم اللہ پاک کی ایسے حلیے میں اگر یہ ہمارے پنڈ میں چلا جائے تو ہمارے پنڈ کے سارے کتے اس کا جلوس نکال دیں۔" نادیہ نے ابھی ابھی اپنی کلاس کے شہباز جٹ کو دیہاتی لباس میں اندر آتے دیکھ کر سب کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تھی۔ وہ اس وقت اپنی طرف سے دیہاتی کلچر کی نمائندگی کر رہا تھا۔

"توبہ ہے! کتنا شوخا لگ رہا ہے۔" سندس کو بھی اپنا غم کچھ لمحوں کے لیے بھول سا گیا۔ وہ اب ذوق و شوق سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"شوخا کہاں۔۔۔ پورا گبھرو جوان لگ رہا ہے۔ خیر سے ہماری برادری سے تعلق ہے اس کا۔" راحیلہ نے فوراً ہی اس کی حمایت کی تو تینوں نے گھور کر اسے دیکھا۔

"کیوں تمہاری برادری میں شوخے لوگوں کا داخلہ ممنوع ہے کیا۔۔۔؟ اور یہ صبح شام اپنی برادری کا رعب کسی اور پر جمایا کرو۔" حنا کا زکام سے برا حال تھا، لیکن پھر بھی بولنے سے باز نہیں آتی تھی۔

ان لوگوں کو یونیورسٹی میں آئے بمشکل ڈیڑھ ماہ ہی ہوا تھا۔ سندس اور نادیہ دونوں کزنز ہونے کے ساتھ ساتھ روم میٹ بھی تھیں۔ جبکہ راحیلہ اور حنا سے ان کی دوستی ہاسٹل میں آکر ہوئی تھی' کیونکہ ان کے کمرے آمنے سامنے تھے۔ راحیلہ کا تعلق وزیر آباد سے اور حنا کا چوکی ملیاں سے تھا۔

راحیلہ کے ساتھ دوستی کا قصہ بھی خاصا دلچسپ تھا۔ سندس اور نادیہ کو ہاسٹل میں آئے ہوئے بمشکل ایک ہفتہ ہی ہوا تھا' جب انہیں ایک رات کوریڈور سے چیخوں کی آوازیں آئیں۔ وہ دونوں بوکھلا کر باہر نکلیں تو پتا چلا کہ راحیلہ بی بی رات کو واش روم میں جانے کے لیے اٹھیں تو سامنے سے فارمیسی کی موٹی ساریہ سے ٹکر ہو گئی۔ آدھی رات کو ساریہ چہرے پر مڈ ماسک اور اپنے گھنگھریلے بالوں پر کالی مہندی لگائے واش روم سے اچانک نکلی تو سامنے سے آتی راحیلہ کے ساتھ ٹکرا گئی۔ جو اس کا حلیہ دیکھ کر حواس باختہ ہو گئی تھی۔ راحیلہ نے حلق پھاڑ کر جو چیخیں ماریں تو ڈرون حملوں کو بھی مات دے دی۔ اس کی چیخوں کی آواز سے آدھے ہاسٹل کی لڑکیاں آنکھیں ملتے ہوئے خوف زدہ چہروں کے ساتھ بمشکل اپنے کمروں سے نکلیں۔ ان سب کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا؟ کہیں زلزلہ آئے گا تو اس کے پیچھے اسی موٹی کا ہاتھ ہوگا۔" سندس نے بمشکل جمائی روکتے ہوئے دیکھ کر بے زاری سے کہا۔ چیخوں کی اصل وجہ معلوم ہونے کی وجہ سے وہ اب خاصی اکتاہٹ کا شکار تھی۔ کچھ نیند بھی بہت زیادہ آرہی تھی۔ بہت سی لڑکیاں ان پر تین حرف بھیج کر واپس اپنے کمروں میں چلی گئی تھیں۔

"آہستہ بولو! ورنہ اسی موٹو نے ایک ہاتھ مار کر تمہیں شہید کر دینا ہے۔" نادیہ نے سندس کو تنبیہی نظروں سے دیکھا۔ وہ اب دلچسپی سے سامنے کا منظر دیکھ رہی تھی۔ جہاں پر راحیلہ اور ساریہ میں ایک زوردار ایٹمی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ زبردست قسم کے حملے ہو رہے تھے۔

"یہ آدھی رات کو پیلی گاچنی (ملتانی مٹی) ملنے کا مشورہ آپ کو کس حکیم نے دیا تھا؟" راحیلہ کمر پر ہاتھ رکھے ساریہ کو للکارنے کی غلطی کر چکی تھی۔ راحیلہ کے لمبے سیاہ گھنے بال بالکل چڑیلوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر ڈر گئی تھیں۔

"اسی حکیم نے مشورہ دیا تھا جس نے آپ کو آدھی رات کو چڑیلوں کی طرح بال کھول کر واش روم جانے اور چیخیں مارنے کی ہدایت کی تھی' ستیاناس کر دیا آپ نے میرے ماسک کا۔" ساریہ نے اس کی ٹھیک ٹھاک طبیعت صاف کی۔

"مجھے چڑیل کہنے سے پہلے خود "دو" آئینے دیکھ لینے تھے' کیونکہ ایک آئینے میں تو آپ کا وجود آ نہیں سکتا اور جتنا آپ کے منہ کا حدود اربعہ ہے اور اس پر جتنی مٹی آپ نے تھوپ رکھی ہے' اتنی مٹی میں کسی غریب آدمی کا آدھائی مرلے کا گھر آرام سے بن سکتا تھا۔" راحیلہ کی زبان کے آگے بھی خندق تھی۔ اس کا اندازہ وہاں کھڑی قوم کو ایک لمحے میں ہو گیا تھا۔

"میرے منہ کا حدود اربعہ ناپنے سے پہلے اپنے چڑیلوں جیسے لمبے بال بھی دیکھ لینے تھے۔ اللہ معاف کرے ایک دفعہ تو میرا دل دہل کر رہ گیا کہ یہ کون سی ڈائن مجھے دیکھ کر چیخیں مار رہی ہے۔" ساریہ غصے سے ہاتھ لہرا کر بولی۔ سندس اور نادیہ نے بہت دلچسپی سے یہ منظر دیکھا اور سامنے پڑی کرسیوں پر بڑی فرصت سے بیٹھ گئیں۔

"آپ اگر خود کو ایک دفعہ غور سے دیکھ لیں تو مجھ سے زیادہ چیخیں ماریں اور آدھی رات کو میرا وقت ضائع کرنے کی بجائے عدنان سمیع کو فون کر کے پوچھیں کہ اس نے اپنا حدود اربعہ کیسے کم کیا ہے' تاکہ دھرتی کا بوجھ کم ہو سکے۔" راحیلہ بالکل' ذوالفقار مرزا کے آگ

تمہاری' اس موئی سے مغزماری کرتے ہوئے۔ یہ سامنے والا ہمارا ہی کمرہ ہے۔" چائے کی سخت شوقین نادیہ نے رات کے دو بجے راحیلہ کو انتہائی دوستانہ انداز سے پیش کش کی تھی۔

"الیکٹرک کیٹل ہے تمہارے پاس۔۔۔؟" راحیلہ کا انداز بھی خاصا بے تکلفانہ تھا۔ سندس ہکا بکا ان دونوں کی فری اسٹائل گفتگو سننے لگی۔ وہ دونوں ایسے باتیں کررہی تھیں جیسے بچپن کا یارانہ ہو۔

"ہاں جی! دودھ' پتی' چینی اور بسکٹ بھی۔۔۔" نادیہ نے اسے مزید حوصلہ دیا۔ اس دن اسے پتا چلا تھا کہ راحیلہ بی بی کا تعلق وزیر آباد میں کسی مالی جالی جٹ فیملی سے تھا۔ اس لیے بڑھکیں مارنے کی عادت اس کی خاندانی اور موروثی تھی۔ جس پر اس کو خاصا فخر بھی تھا۔ بس اس رات دو بجے ان کے کمرے میں پی جانے والی چائے سے ان کی دوستی کا آغاز ہوا تھا۔

حنا سے دوستی کا واقعہ بھی کسی دلچسپی سے خالی نہیں تھا۔ ان لوگوں کو ہاسٹل آئے بمشکل بارہ دن ہوئے تھے اور اس روز بھی نادیہ اور راحیلہ چائے کے بڑے بڑے مگ اٹھائے سامنے اسٹیج پر بیٹھی ساریہ کو دیکھ کر ہنس رہی تھیں جو بڑے جوگرز پہنے سامنے لان میں واک کرتے ہوئے باقاعدہ ہانپ رہی تھی۔ پانچ فٹ قد اور ایک سو ایک کلو وزن کے ساتھ وہ باقاعدہ پہلوان ہی لگتی تھی۔

"یار! مجھے لگتا ہے کہ اس ساریہ کے بوجھ سے آج لان میں کوئی نہ کوئی چشمہ پھوٹ آئے گا یا پھر جس گھاس پہ یہ چل رہی ہے' یہ ناپید ہوجائے گی۔" راحیلہ کو اس دن والی لڑائی بھولی نہیں تھی۔ اس لیے وہ ساریہ کے پیچھے "ہاتھ منہ" دھو کر ابھی تک پڑی ہوئی تھی۔

"شرم کرو! ایسے کسی کا مذاق نہیں اڑاتے۔" ان کے پاس بیٹھی سندس نے خواتین ڈائجسٹ سے نظریں اٹھا کر دونوں کو دیکھا۔ وہ ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہنس رہی تھیں۔

"ہم تو شرم کر ہی لیں گے' لیکن تم برائے مہربانی یہ اپنے ڈائجسٹ کیمپس مت لے کے جایا کرو۔ کل اپنا سی آر بھی کہہ رہا تھا کہ سندس' میڈم انیسہ کی کلاس میں کتنی توجہ سے کتاب پر نظریں جما کر بیٹھتی ہے۔ اب اس معصوم کو ہم کیا بتاتے کہ محترمہ نے رسالے پر کور چڑھا رکھا ہے اور اسی پر آنکھیں ٹکائے بیٹھی ہوتی ہے۔ جس دن پکڑی گئی اپنے ساتھ ہماری بھی طبیعت سیٹ کروائے گی۔" راحیلہ نے فروٹ کیک کھاتے ہوئے ڈرایا۔

"لو! یہ کون سا پہلی دفعہ پکڑی جائے گی۔ ماضی میں ایسے بہت سے شرمناک واقعات ہوچکے ہیں۔ اب اس نے شرمندہ ہونا چھوڑ دیا ہے۔ محترمہ کو ڈائجسٹ سے عشق ہے اور اس عشق کے لیے اس نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔" نادیہ نے راحیلہ کے ہاتھ سے بڑی صفائی کے ساتھ کیک پیس اڑاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"تم لوگوں کو کیا پتا' کتنے مزے کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ آج کل فرحت اشتیاق کا اتنا زبردست ناول چل رہا ہے۔" سندس جوش سے بولی۔

"خدا کے واسطے! کہانی مت سنانا۔" نادیہ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"یہ محترمہ فرحت اشتیاق وہی ہیں نا جن کے ہیرو کی پرسنالٹی' ذہانت اور حد درجہ کیئرنگ انداز کے بارے میں پڑھ کر کم از کم آدھے جہان کی لڑکیوں کو اپنے اپنے منگیتر زہر لگنے لگے ہیں؟" راحیلہ ڈائجسٹ نہیں پڑھتی تھی' لیکن اس کی معلومات اپ ٹو ڈیٹ رہتی تھیں۔

"ہاں' ہاں! تمہیں کس نے بتایا؟" سندس نے ڈائجسٹ بند کرتے ہوئے بہت دلچسپی سے پوچھا۔ فرحت کے ہیرو تو اسے دل و جان سے پسند تھے۔ اس کا اظہار وہ "وقتاً فوقتاً" کرتی بھی رہتی تھی۔

"ہوئے! یہ کون سا نمونہ آرہا ہے؟" نادیہ نے ان

دونوں کی توجہ سامنے گیٹ کی طرف کرائی' جہاں سے ایک لڑکی آنکھیں سرخ کیے' بڑا سا لوہے کا ٹرنک انتہائی بے زاری سے گھسیٹتے ہوئے اندر لا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر دنیا جہان کی کوفت تھی۔ دبلی پتلی اور مسکین سی شکل دیکھ کر راحیلہ اور نادیہ کی رگ شرارت پھڑک اٹھی۔

"تواں آئیاں آئے سوہنیا۔۔۔" راحیلہ نے شوخی سے لبریز لہجے میں اس مسکین سی لڑکی کو خاصی بلند آواز سے چھیڑا۔ لڑکی چلتے چلتے رکی۔ سخت خونخوار نظروں سے راحیلہ کو دیکھا۔ بکسا زمین پر رکھ کر اپنی نازک سی کمر پر ہاتھ رکھ کر بڑے اطمینان سے کھڑی ہوگئی۔

"کیوں' تسی صدیاں توں ایتھے ڈیرے جما کے بیٹھے ہوئے او۔۔۔؟" نازک سے سراپے سے بڑی کڑک آواز نکلی تھی۔ وہ تینوں ہڑبڑا گئیں۔۔۔ اندازے کی بڑی سخت قسم کی غلطی لاحق ہوئی تھی۔

"زیادہ ہڑ ہڑ دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں پہلے ہی بہت دکھی ہوں۔ شاباش! آکر بہن کے ساتھ یہ بکسا اٹھواؤ۔" اس کی بے تکلفی پر ان تینوں کو سکتہ ہی ہوگیا تھا۔ ان تینوں نے سخت تعجب کے عالم میں اس زبردستی کی بہن کو دیکھا تھا جو پھر انتہائی بے تکلفی سے کہہ رہی تھی۔

"یہ ناصر جمالی کم بخت نے مجھے ایم اے میں پھنسا دیا ہے۔ خود تو ایف اے بمشکل تھرڈ ڈویژن میں پاس کرکے دبئی میں بیٹھا ہے اور مجھے یہاں خوار ہونے کو بھیج دیا' حالانکہ میں اماں کے بغیر کہیں ایک دن نہیں رہی' صبح سے رو' رو کر برا حال ہے میرا۔"

"یہ ناصر جمالی کون ہے بہن جی؟" نادیہ سنبھل کر بولی' کیونکہ مدمقابل کی زبان کی لمبائی راحیلہ سے بھی زیادہ لگ رہی تھی۔

"میری پھپھی کا پتر ہے اور میرا منگیتر۔ پہلے پیچو کی ملیاں میں رہتا تھا' لیکن پچھلے دو سال سے دبئی میں ہے۔" وہ ٹرنک کے بوجھ سے دوہری ہو کر بولی۔

"لو! دیکھ لو۔ اس کی بھی منگنی ہوئی ہے۔ ادھر ہمیں کوئی گھاس ہی نہیں ڈالتا۔" راحیلہ نے عام سی شکل و صورت کی حامل حنا کو دیکھ کر انتہائی صدمے سے نادیہ کے کان میں سرگوشی کی۔

"چلو چلو شاباش! آجاؤ۔ اللہ تم لوگوں کو بھی خوب صورت منگیتر دے گا۔ میری دعا بہت جلد پوری ہوتی ہے' یہ اور بات ہے کہ میری پھپھی کا کہنا ہے کہ میری زبان خاصی کالی ہے۔ لیکن وہ تو ایک ظالم ساس کا جلاپا ہے۔ اس لیے میں اہمیت ہی نہیں دیتی۔" وہ انتہائی بے تکلفی سے پہلی ہی ملاقات میں اپنے "خاندانی راز" فاش کررہی تھی۔

"بس بہن! تم آج دعا کے بجائے ہمیں ہینڈسم سے منگیتر کی بددعا ہی دے دو' کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ تمہاری پھپھی کی بات میں کچھ نہ کچھ وزن ضرور ہوگا۔" راحیلہ بکسا اٹھانے کے لیے اٹھتے ہوئے بولی۔ اسی لالچ میں نادیہ بھی میدان میں آگئی۔ یہ اور بات کہ دو مہینے گزرنے کے بعد بھی اس "بکسے والی پیرنی" کی کوئی دعا تو دور کی بات' بددعا بھی پوری ہوتی انہوں نے نہیں دیکھی تھی' حالانکہ اسی لالچ میں وہ ان کے گروپ کا حصہ بن کر راحیلہ کی روم میٹ کو نکلوا کر اس کے کمرے میں حصہ بھی بٹا چکی تھی۔ اس دن وہ بھاری بھرکم ٹرنک انہوں نے کس طرح دوسری منزل تک پہنچایا تھا' یہ ایک الگ داستان تھی۔ پورے چار دن وہ ایک دوسرے کے بازوؤں کی مالشیں کرتی رہی تھیں۔ حنا صاحبہ کا یہ بکسا عمرو عیار کی زنبیل ثابت ہوا تھا۔ جس سے بوقت ضرورت ہر چیز برآمد ہوجاتی تھی۔ ایک دن اسے اپنے بکسے سے ہتھوڑی نکالتے ہوئے دیکھ کر نادیہ سخت خوف زدہ ہوگئی تھی۔

"یار! خدانخواستہ تمہارا تعلق "ہتھوڑا گروپ" سے تو نہیں' کسی زمانے میں اس گروپ نے لوگوں کی چیخیں نکلوادی تھیں۔"

"شکر کرو! میرا تعلق کسی خودکش بمبار گروپ سے نہیں۔ وہ ہتھوڑے سے زیادہ خطرناک ہے۔ ہتھوڑا کھانے کے بعد پھر بھی بچنے کا کوئی نہ کوئی چانس ہوتا ہے۔" حنا صاحبہ نے ہتھوڑی کے ساتھ سامنے دیوار پر میخ ٹھونکتے ہوئے مڑ کر کہا۔ سندس نے جو کہ آمنہ

ریاض کا ناول ''مرگ وفا'' پڑھنے کے بعد صبح سے چار دفعہ رو کر اب بھی انتہائی دکھی صورت بنائے راحیلہ کی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی ؟ انتہائی سنجیدہ ہو کر حنا سے پوچھا۔

''یہ اس دیوار پر تم کیا ٹانگو گی...؟''

''تصویر لگاؤں گی یہاں۔'' حنا نے ان تینوں کو بڑی لاپروائی سے بتا کر اپنے لوہے کے ٹرنک سے ایک اور میخ نکالی۔

''کس کا چوکھٹا یہاں سجانے لگی ہو؟'' راحیلہ نے دہل کر اسے دیکھا۔ وہ اس کی روم میٹ تھی۔ جبکہ نادیہ اور سندس کا سامنے والا کمرہ تھا۔ جس میں وہ بس رات ہی کو پائی جاتی تھیں۔ باقی سارا وقت ان چاروں کا اکٹھے ہی گزرتا تھا۔ اتفاق سے ان کا ڈپارٹمنٹ بھی ایک ہی تھا۔

''یہ بس تم لوگ دیکھتے رہنا۔ تم سب لوگوں کا منہ کھلا کا کھلا رہ جائے گا۔'' وہ انتہائی پراسرار طریقے سے مسکرائی۔ راحیلہ نے دہل کر نادیہ کو دیکھا۔

''یہ کہیں وینا ملک کی وہ متنازع تصویر تو نہیں لگانے لگی، جس پر وینا کا اصرار تھا کہ اس نے برقع پہن کر کھنچوائی تھی؟''

''دفع دور! مجھے وینا ملک میں کوئی دلچسپی نہیں زہر لگتی ہے وہ مجھے۔'' حنا نے میخ پر زور سے ہتھوڑی ماری تھی۔ جیسے وہ تصور میں وینا ملک کے سر پر مار رہی ہو۔

''پھر کہیں ڈولی بندرا کا فوٹو تو نہیں لگانے لگی ہو؟'' راحیلہ کو ابھی ابھی ایک خوف ناک خیال آیا تھا۔ حنا مسکراتے ہوئے خاموشی سے دیوار میں زور زور سے ٹھونکا ٹھونکی کرنے میں مصروف تھی۔ اس نے راحیلہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''دھیان سے یار! کہیں دیوار میں سوراخ نہ کر دینا۔ ساتھ اس موٹی ساریہ کا کمرہ ہے۔'' نادیہ اپنے چہرے پر اسکرب لگاتے ہوئے بولی۔ اسے اپنے چہرے کی ہر وقت فکر رہتی تھی۔

''فکر نہ کرو لوہ موٹی ایک سوراخ سے نظر نہیں آئے گی۔ اس کے لیے پوری دیوار گرانی پڑے گی۔'' راحیلہ نے چائے کے مگ میں پاپے ڈبو کر کھانے شروع کر دیے تھے۔ وہ کھانے پینے کی حد درجہ شوقین تھی، لیکن اس کے باوجود انتہائی متناسب جسم کی حامل تھی۔ ہر وقت کھاتے رہنا اس کا واحد پسندیدہ مشغلہ تھا۔ جس کا اندازہ ان سب کو بہت جلدی ہو گیا تھا' لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کو سخت حیرت تھی کہ اس کا وزن کیوں نہیں بڑھتا تھا۔

''یہ کون ہے...؟'' سندس نے حنا کو اپنے لوہے بکسے سے ایک خوف ناک سی تصویر نکال کر انتہائی عقیدت سے لگاتے دیکھا۔

''کون...؟'' نادیہ نے بھی اپنی کزن کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ اس کا منہ بھی کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اسکرب ملنا بھول گئی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو۔'' پاپے کھاتی راحیلہ نے تشویش سے سندس اور نادیہ کی حواس باختہ شکلیں دیکھیں۔ ان دونوں کی توجہ کا محور حنا کے ہاتھ میں پکڑی تصویر تھی۔ جس میں ایک بمشکل چار' پانچ انچ کا انتہائی دبلا پتلا لڑکا جس کے چہرے پر صرف ہڈیاں نمایاں تھیں اور ان ہڈیوں زدہ چہرے پر بھجور مار کہ موچھوں نے اس کے چہرے کو خاصا عجیب و غریب بنا دیا تھا۔ گلے میں دو سونے کی زنجیریں پہنے گولڈن کلر کے کرتے میں ملبوس شخص زبردستی سینہ پھلائے کھڑا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں چھپی مکاری دور ہی سے نظر آ رہی تھی۔ راحیلہ بھی دہشت زدہ ہو کر چائے پینا بھول گئی تھی۔

''استغفراللہ...'' راحیلہ کے منہ سے بے اختیار پھسلا تھا۔ حنا نے مڑ کر راحیلہ کو غصے سے دیکھا۔

''یہ کون ہے...؟'' سندس بمشکل بولی تھی۔

''میرا منگیتر' ناصر جمالی...'' حنا فخریہ انداز میں ان تینوں کو دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔ کمرے میں ایک بم ہی تو پھٹا تھا۔ ان تینوں کو لگا تھا کہ کمرے کی چھت ان کے سر پر آن گری ہو۔ چائے کا مگ میز پر رکھتے ہوئے راحیلہ سخت صدمے اور تشویش سے بولی۔

''یہ ہے تمہارا منگیتر؟'' اس نے حنا کی ''فخریہ پیش کش'' کو دہل کر دیکھا۔ پھر تھوڑا سا سنبھل کر سندس سے بولی۔ ''خدا کے واسطے سندس! اسے فرحت اشتیاق کی کوئی کہانی نہ پڑھانا۔ نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔''

''دیکھو حنا یار! میرے لیے تم ایسے منگیتر کی دعا بالکل نہ کرنا۔ ویسے بھی مجھے منگنی کے بجائے ڈائریکٹ شادی ہی پسند ہے۔'' نادیہ بوکھلا کر بولی۔

''ایسے منگیتر سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' حنا اپنی ''فخریہ پیش کش'' کو دیوار پر سجا کر اب تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لینے میں مگن تھی۔ اس کی پشت ان تینوں کی جانب تھی۔ اس لیے وہ ان کے چہرے پر پھیلے تاثرات سے بے خبر تھی۔

''بھئی! ایسے سے میری مراد یہ ہے کہ ایسا بندہ نہ ہو جو ملک سے باہر ہو۔ ہم سے جدائیوں کے عذاب نہیں سہے جاتے۔'' نادیہ نے عجلت میں بات سنبھالنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ جبکہ سندس اور نادیہ نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔ ان کے لیے اپنی ہنسی روکنا عذاب بن گیا تھا۔

''یار! جہاں دل سے دل جڑا ہوا ہو' وہاں زمنی فاصلے محسوس نہیں ہوتے۔'' حنا نے انتہائی محبت سے فلسفہ بولا تھا۔ وہ اب محبت پاش نظروں سے اپنے منگیتر کی تصویر کو دیکھ رہی تھی اور بلند آواز میں گنگنا بھی رہی تھی۔

''وے سونے دیا کنگنا' سودا اکو جیا...''

''سچ کہا ہے سیانوں نے ''محبت اندھی ہوتی ہے۔'' نادیہ بلند آواز میں بڑبڑائی۔ سندس نے بمشکل اپنی ہنسی کا گلا گھونٹا۔

''ویسے سندس! میرا منگیتر ویسا ہی ہے نا' فرحت اشتیاق کی کہانیوں کے ہیرو جیسا' ہے نا۔'' حنا کی بات پر سندس کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔

''ہاں' ہاں! ویسا ہی ہے' لیکن پلیز! تم ان کی کوئی کہانی نہ پڑھنا۔''

''حنا تصویر لگا کر اب اطمینان سے سب کو دیکھ رہی تھی۔

''یار! یہ تصویر یہاں لگانا ضروری ہے کیا؟'' نادیہ نے تھوڑا سا جھجک کر پوچھا تھا۔

''ہاں' ہاں یار! رہنے دو۔ اس تصویر کو دیوار پر مت لگاؤ۔'' سندس بھی اخلاقی مدد کے لیے میدان میں اتر آئی تھی۔

''کیوں' یہ تصویر یہاں کیوں نہیں لگ سکتی؟'' حنا نے کڑے تیوروں سے ان تینوں کو دیکھا۔ وہ تینوں ہی گڑبڑا گئیں اور ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگیں۔ نادیہ نے بوکھلا کر کہا۔

''یار! اتنا ہینڈسم بندہ ہے' خوامخواہ لڑکیاں اپنے روم میں آ آ کر نظر لگائیں گی' سنا ہے نظر تو پتھر کا کلیجہ بھی پھاڑ دیتی ہے۔''

''استغفراللہ' یا اللہ! میری معصوم کزن کو اس جھوٹ پر معاف کر دینا۔'' سندس نے دھیمی آواز میں دعا کرتے ہوئے فائزہ افتخار کا ''چھلاں دے رنگ کالے'' کھول کر اپنی مسکراہٹوں کا گلا گھونٹا تھا۔ جبکہ اس سفید جھوٹ پر راحیلہ کو چائے پیتے ہوئے اچھو لگا تھا۔

''ہاں یار! نادیہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہمارے پنڈ میں بھی ایک لڑکی کی ایسے سوہنے گبھرو جوان سے منگنی ہوئی تھی۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے۔ سارے پنڈ کو ساڑا پڑ گیا۔ لے کے نظر لگا دی۔'' سندس کو پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ وہ خود بھی اچھی رائٹر بن سکتی ہے۔

''ہاں یار! مجھے اس بات کا بہت دکھ ہے بے چاری شگو کا آج تک رشتہ نہیں ہو سکا۔'' نادیہ کی بات نے تو حنا کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیے تھے۔ سدا کی وہمی حنا نے فوراً'' دہل کر تصویر دیوار سے اتار کر دوبارہ اپنے لوہے کے ٹرنک میں رکھ دی۔ اس ٹرنک کے اوپر سفید رنگ کا کور بچھایا گیا تھا۔ جس پر بڑے بڑے سبز رنگ کے مور اکثر راحیلہ کو اپنا منہ چڑاتے ہوئے محسوس ہوئے تھے' لیکن تصویر کے اترتے ہی راحیلہ کو وہ مور پورے کمرے میں رقص کرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"یار! یہ ساجد مسخرے نے کیوں ڈبے جیسا منہ بنا رکھا ہے؟" لان میں بیٹھ کر بے تکلفی سے مولی کھاتے ہوئے راحیلہ نے سب کی توجہ سامنے شیشم کے درخت کے نیچے اکیلے اور اداس بیٹھے ساجد کی طرف کرائی۔ وہ لوگ ابھی ابھی کلاس لے کر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی تھیں۔

"کہیں اس کی بی اے کی ڈگری جعلی تو نہیں نکل آئی؟" حنا نے اپنے منگیتر کے ٹیکسٹ کا جواب دیتے ہوئے فوراً" خیال ظاہر کیا۔

"شکل سے تو ایسے لگ رہا ہے، جیسے اسے مولیوں کے کاروبار میں گھاٹا پڑ گیا ہو۔" اپنے ہونٹوں پر ایک دفعہ پھر لپ اسٹک لگاتے ہوئے نادیہ نے بھی تبصرہ کیا۔ نادیہ کو میک اپ کرنے کا ہوکا تھا۔ اسے جہاں موقع ملتا تھا، وہ ہار سنگھار میں مصروف ہو جاتی تھی۔

"مجھے تو یہ اس وقت آسیہ رزاقی کے ناولز کا کوئی ڈرپوک سا ہیرو لگ رہا ہے۔" سندس نے ماہا ملک کے ناول سے نظریں اٹھا کر تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔

"یہ آسیہ رزاقی کون ہیں؟" حنا کے منگیتر نے کوئی اچھا سا میسج بھیجا تھا۔ اس لیے اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

"سندس کے پڑوس میں رہتی ہیں۔" نادیہ نے جل کر جواب دیا۔ وہ اب اپنی بڑی بڑی آنکھوں پر مسکارا لگا رہی تھی۔

"کچھ خدا کا خوف کرو نادیہ!" سندس سخت برا مان گئی تھی۔

"خدا کا خوف تو تم کرو۔ سارا دن ان رسالوں اور کتابوں میں سر دیے بیٹھی رہتی ہو اور باقی کلاس فیلوز نے مشہور کر رکھا ہے کہ اس دفعہ سندس ٹاپ کرے گی اور وہ عمر چشما ٹوکو تو تمہارے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر باقاعدہ ڈیپریشن ہونے لگتا ہے۔ وہ آتے بہانے سے مجھ سے سن گن لینے کی کوشش کرتا ہے کہ سندس بی بی اتنا پڑھ کر کیا کریں گی۔" نادیہ کو بھی غصہ آ گیا۔

"تو تم اس کو بتا دو، وہ کون سا کورس کی کتابیں پڑھتی ہے۔" حنا نے تیزی سے میسج لکھتے ہوئے مفت مشورہ دیا۔

"اچھا...! اور وہ جو باقی آدھی دنیا پوچھتی ہے کہ حنا بی بی ہر وقت کس کو میسج کرتی رہتی ہیں، ان کو کیا بتاؤں؟" نادیہ نے میک اپ کا سامان غصے سے دوبارہ کھول لیا تھا۔

"ان کو بتا دو کہ اپنے منگیتر ناصر جمالی کو کرتی ہے۔" حنا نے فخریہ نظروں سے اپنی دوستوں کو دیکھا۔ وہ سب اپنے اپنے کاموں میں مگن تھیں۔

"یار! ایک بات تو بتاؤ، یہ تمہارا ناصر جمالی دبئی میں میسج کرنے کے علاوہ بھی کوئی کام کرتا ہے؟" نادیہ بڑی مہارت سے اپنے گالوں پر بلش آن لگا رہی تھی۔

"لو بتاؤ! وہ اچھا خاصا وہاں کام کرتا ہے۔ جب فری ہوتا ہے تب ہی مجھے ٹیکسٹ کرتا ہے۔" حنا نے سخت ناگواری سے نادیہ کے "اوپن بیوٹی پارلر" کو دیکھا۔ جو اردگرد کے اسٹوڈنٹس سے بے نیاز اپنے کام میں مگن تھی۔

"اوہ! اس کا مطلب ہے کہ وہ سارا دن فارغ ہی ہوتا ہے۔" نادیہ ٹیڑھی آنکھ سے اپنے بلش آن کو ذرا تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے لاپروائی سے بولی۔ اس کے اس جملے سے حنا کو آگ ہی تو لگ گئی۔ تب ہی اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اس قدر لیپا پوتی سے تمہیں وحشت نہیں ہوتی؟"

"مجھے اپنے بوتھے سے نہیں تمہارے ہاتھوں کی ان موٹی موٹی بدنما انگلیوں سے وحشت ہوتی ہے، جن کا تم سارا دن موبائل پر بے دریغ استعمال کرتی ہو، اپنے اس نکچھو کے لیے۔" نادیہ نے حساب برابر کیا۔

"کیا...؟ تم نے ناصر کو نکچھو کس خوشی میں کہا ہے؟" حنا نے اپنے بازو اوپر چڑھاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ اس کا چہرہ غصے کی زیادتی کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسے اپنے کھجور مار کہ منگیتر سے محبت نہیں عشق تھا۔

"شکر کرو، نکچھو باندر نہیں کہا۔" راحیلہ نے سرگوشی میں پاس بیٹھی سندس سے کہا، جو ہنسی روکنے کے چکر میں بے حال تھی۔ یہ حنا کے منگیتر کا خفیہ نام تھا جو وہ تینوں حنا کی غیر موجودگی میں بڑے دھڑلے سے استعمال کرتی تھیں۔ اس وقت حنا اور نادیہ کے درمیان جنگ شروع ہو چکی تھی۔

"ایکسکیوز می! یہ رضیہ بوٹا آپ کے ہاسٹل میں ہی رہتی ہیں کیا؟" ساجد مسخرا اچانک ہی ان کے گروپ کے پاس آ کر بولا۔ نادیہ نے بوکھلا کر بلش آن بیگ میں اور راحیلہ نے مولی فائل کے نیچے چھپا دی۔

"جی جی... ہمارے ہی ہاسٹل میں رہتی ہیں، کمرہ نمبر چار سو بیس میں۔" سندس بے ساختہ بولی تھی۔ تینوں نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا تو وہ گھبرا کر دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اب شاید اس نے اپنا کمرہ تبدیل کر لیا ہے۔" ساجد مسخرا اس کی بات پر دھیان نہ دیتے ہوئے اب کہہ رہا تھا۔

"آپ لوگ اسے سمجھاتی نہیں ہیں۔" وہ سخت الجھن اور پریشانی میں مبتلا لگ رہا تھا۔

"کیا سمجھائیں کہ لنڈے کی جینز پہننا چھوڑ دے؟" راحیلہ آہستگی سے بڑبڑائی۔ وہ تو شکر تھا کہ ساجد مسخرے نے سنا نہیں۔ آج اس کے ہر وقت ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار بنے چہرے پر پورے بارہ بجے ہوئے تھے۔ وہ لوگ اس کی پریشانی سمجھنے سے قاصر تھیں۔

"جی! کیا سمجھائیں؟ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم جو اسے سمجھائیں، وہ اس کی سمجھ میں آ بھی جائے۔" سندس نے اب کے قدرے فلسفیانہ انداز اختیار کر کے باقی سب کو متاثر کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

"دیکھیں جی! جس طرح کی حرکتیں وہ کیمپس میں کرتی پھر رہی ہے، وہ اس کو زیب نہیں دیتیں۔ لڑکیوں کو آپ لوگوں کی طرح پروقار ہونا چاہیے۔ اس کو پتا ہی نہیں ہے کہ لوگ پیٹھ پیچھے اس کا کتنا مذاق اڑاتے ہیں۔ عجیب قسم کی ڈریسنگ کرتی ہے اور اب تو اس کا ہر انداز ہی انتہائی کھلا ڈلا ہو گیا ہے۔" وہ حد درجہ تشویش بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ وہ تینوں جو اپنے لیے لفظ "پروقار" سن کر اب مکمل طور پر ساجد کی طرف متوجہ تھیں اور حیرت کی بات تھی کہ وہ انہیں اب اتنا مسخرا بھی نہیں لگ رہا تھا، جتنا وہ سمجھتی تھیں۔

"یہ ساری باتیں اپنی جگہ، لیکن آپ یہ بتائیں کہ آپ کیوں اس کی فکر میں دبلے ہو رہے ہیں؟" سندس کے لہجے کی معنی خیزی عروج پر تھی۔ اس قدر "عقل مندانہ" سوال پر وہ تینوں اب واقعی اس سے متاثر ہو گئی تھیں۔ جبکہ ساجد کے چہرے پر بڑا نرم اور مہربان سا تاثر بڑی تیزی سے ابھرا تھا۔

"اصل میں میرا تعلق بھی ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ہے۔ اس لیے مجھے اچھا نہیں لگتا کہ لوگ اس کا مذاق اڑائیں۔"

"لو جی! کھودا پہاڑ نکلا چوہا اور وہ بھی مرا ہوا۔" سندس جو کسی زوردار دھواں دھار عشق کی داستان کی منتظر تھی۔ اسے اس جواب سے خاصا دھچکا لگا تھا۔ تب ہی اس نے مایوس ہو کر ماہا ملک کا ناول "تم کون پیا" دوبارہ اپنی آنکھوں کے آگے کر لیا۔ اس کی اس قصے سے دلچسپی ہی ختم ہو گئی تھی۔

"ایسا ہے بھائی صاحب! آپ کی ساری باتیں درست سہی، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم نہ تو اس کی پھپھی کی بیٹیاں ہیں، نہ وہ ہمارے چاچے کی دھی ہے۔ ایسی صورت میں آج کل کون کسی کی سنتا ہے۔ وہ ہماری کلاس فیلو سہی اور ہاسٹل فیلو بھی۔ لیکن یہ اس کا ذاتی فعل ہے اور کوئی بھی اپنی ذاتیات میں مداخلت پسند نہیں کرتا۔" راحیلہ کے دوٹوک انداز پر ساجد مسخرے کے چہرے پر پھیلنے والی مایوسی بڑی فطری تھی۔

"ویسے آپ اسے خود کیوں نہیں سمجھاتے؟" سندس کے ایک اور عقل مندانہ سوال پر وہ تینوں ایک بار پھر ستائشی نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔ وہ اس وقت کسی اینکر پرسن کے اسٹائل میں کھڑی تھی۔

بس وہاں مائیک اور کیمرے کی کمی تھی۔

"جی! میں نے سمجھانا چاہا تھا۔" وہ تھوڑا سا اٹکا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے منے سے قطرے نکل آئے۔

"پھر...؟" تینوں نے سوالیہ انداز سے اسے دیکھا۔

"اس نے تو جی پوری کلاس میں ایسے ہنگامہ کر دیا' جیسے بجٹ کے اجلاس میں اپوزیشن کرتی ہے۔" اس کے معصومانہ انداز پر تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"بس بھائی صاحب! آپ بھی کان لپیٹ کر نکل جائیں۔ رضیہ بوٹا کا کوئی پتا نہیں۔ زیادہ غصہ آیا تو وائس چانسلر کے پاس پہنچ جائے' ایسا نہ ہو کہ آپ کو پانچ سال کے لیے یونیورسٹی والے نااہل قرار دے دیں اور آپ کو ڈگری ہی نہ ملے۔" راحیلہ نے اپنے لہجے کو حد درجہ سنگین بنایا تھا۔ جس کا ساجد پر خاصا اثر بھی ہوا تھا۔

"دفع کریں جی! ہمیں کیا پڑی ہے کہ پرائے معاملے میں ٹانگ اڑاتے پھریں۔ آپ لوگ بھی اس سے میرا ذکر نہ کیجیے گا۔" راحیلہ نے اس کی بات پر بڑے غور سے اس کی اونٹ جتنی لمبی ٹانگوں کو دیکھا جو کچھ دیر پہلے تو رضیہ بوٹا کے معاملے میں گوڈوں گوڈوں تک پھنسی ہوئی تھیں' لیکن اب ساجد نے "فوراً" ہی بڑی مہارت سے نکال لی تھیں۔

"آپ ٹینشن نہ لیں۔ ہم ایسی لڑکیاں نہیں ہیں کہ لگائی بجھائی کرتی پھریں۔" نادیہ نے اس کی تسلی کرائی۔ اس کو اپنے بلش آن کی زیادہ فکر تھی' جو اس نے ساجد کے آنے سے پہلے ابھی ایک ہی رخسار پر لگایا تھا۔ اب دوسری سائیڈ پر وہ ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

"ویسے آپ لوگ کل جی آر کے لیے ہونے والے الیکشن میں کس کو ووٹ دیں گی؟" ساجد کو جاتے جاتے اچانک یاد آیا۔ وہ چاروں چونکیں۔ ان کے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

"جی آر کا الیکشن کب ہو رہا ہے' ہمیں تو اس کا پتا ہی نہیں۔" وہ ایک دم شرمندہ ہوئیں تو ساجد مسخو برا مان گیا۔

"آپ لوگ کس دنیا میں رہتی ہیں۔ پچھلے تین دن سے شوشا چھوٹا ہوا ہے۔ بے چاری صغریٰ جم کو خوامخواہ جی۔ آر شپ سے سازشیں کر کے ہٹا دیا ہے رضیہ بوٹا نے۔"

"اچھا...؟ واقعی...؟" انہیں واقعی نہیں پتا تھا۔ ویسے بھی وہ چاروں اپنی ہی دنیا میں مگن رہتی تھیں۔

"اب کون کون کھڑا ہے الیکشن میں؟"

"رضیہ بوٹا اور سعدیہ چیمہ!" ساجد کی اطلاع پر سب نے ہی برا سا منہ بنایا تھا۔ سعدیہ چیمہ کے والد ٹرانسپورٹ کا بزنس تھا۔ جس کا وہ خاصے فخر سے ذکر کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے کلاس فیلوز نے اس کا نام ہی "چیمہ طیارہ" رکھ دیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اپنے اس خطاب پر پھولے نہیں سماتی تھی۔

"میں تو اپنا ووٹ کسی کو نہیں دوں گی' دونوں ہی نمونے ہیں۔" نادیہ کے منہ پھٹ انداز پر ساجد نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ساجد کی آنکھوں میں سو واٹ کے بلب جتنی روشنی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی روشنی پر تینوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اب خوامخواہ ہی ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار بنا ہوا تھا۔

"آپ تو ماشاء اللہ بہت ذہین ہیں۔ ہر وقت پڑھائی میں مصروف رہتی ہیں۔ کیا آپ اپنے نوٹس مجھے کاپی کرنے کو دیں گی؟" اس نے ایک دم ہی سندس کو مخاطب کیا تھا جو اس کی بات پر بوکھلا گئی تھی۔ راحیلہ' حنا اور نادیہ کے حلق سے برآمد ہونے والے قہقہوں سے ساجد سخت الجھن کا شکار ہو گیا۔

"میں اپنے نوٹس کسی کو نہیں دیتی۔" سندس نے اجنبیت اور بے رخی کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔

"ہاں! اگر کبھی بنائے تو..." نادیہ کی "کھی کھی" ابھی بھی جاری تھی۔ جبکہ ساجد خفت زدہ ہو کر "فوراً" کلاس روم کی طرف چل پڑا' جہاں میڈم انیسہ کا لیکچر تھا۔ ان چاروں نے بھی اس کی پیروی کی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ چاروں ہانپتی کانپتی حواس باختہ ہاسٹل میں پہنچی تھیں۔ ان چاروں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سب سے زیادہ بری حالت تو سندس کی تھی۔ جس کا اسکارف بھی اس افراتفری میں کیمپس میں ہی گر گیا تھا۔ جبکہ راحیلہ کو اپنے ہاتھ میں پکڑی پچی کیری کا غم بھی بھول گیا تھا جو راستے میں ہی کہیں گر گئی تھی۔ نادیہ کی آنکھوں میں ڈالا گیا کاجل پھیل کر اسے خاصا خوف ناک بنا رہا تھا۔ جبکہ حنا نے موبائل کا سو روپے کا کارڈ کہیں گرا دیا تھا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔

صبح موسم خاصا سہانا تھا۔ اونچے لمبے درخت ہواؤں کی شوریدہ سری کے آگے بے بس تھے۔ تیز ہوا کے ساتھ آنے والی بارش کی بوچھاڑ سے بچتے بچاتے وہ کیمپس پہنچی تھیں۔ پہلی تین کلاسز بڑے سکون سے ہوئیں۔ پھر بریک میں الیکشن کے لیے ووٹنگ شروع ہوئی۔ ابتدا میں تو معاملہ ٹھیک رہا' لیکن موٹے صفدر کو گنتی میں دھاندلی کرتے دیکھ کر سعدیہ چیمہ آپے سے باہر ہو گئی۔ اسے تو پہلے ہی شک تھا کہ موٹا صفدر' رضیہ بوٹا کے چکروں میں ہے۔ زبانی کلامی ہونے والی لڑائی ہاتھا پائی میں کب تبدیل ہوئی۔ ان لوگوں کو پتا ہی نہیں چلا تھا۔ وہ تو سامنے "چیمہ طیارہ" کے ہاتھوں میں رضیہ کے چار بالوں والی چٹیا دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں۔ ان دونوں کے حمایتی لڑکے بھی میدان میں کود پڑے تھے۔

"آپ لوگ ہاسٹل بھاگ جائیں' ورنہ ماری جائیں گی۔" شہباز جٹ نے چیخ کر کہا تھا۔ اس پہلے کملے کے منہ سے اتنا اچھا مشورہ سن کر ان سب نے چاروں طرف دیکھا۔ پورا کمرہ اسمبلی ہال کا منظر پیش کر رہا تھا۔ دھان پان سی رضیہ بوٹا نے ہٹی کٹی سی سعدیہ چیمہ کے جبڑے میں مکا مارا۔

"نادیہ بھاگو..." راحیلہ نے گویا صور پھونکا تھا۔ وہ چاروں گرتی پڑتی باہر نکلیں' تب تک کلاس کے لڑکے بھی آپس میں گتھم گتھا ہو چکے تھے۔ کس کی کیا چیز کہاں گری' کسی کو خبر نہیں تھی۔ سب کے چہرے ہلدی کی طرح پیلے ہو چکے تھے۔ وہ ابھی تک بے ترتیب سانسوں کو بحال نہیں کر پائی تھیں۔ ہانپتی کانپتی بمشکل ہاسٹل تک پہنچیں تو ان کی حالت خاصی خراب تھی۔

"یا اللہ اب کیا ہو گا؟" سندس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

"ہونا کیا ہے۔ دو' چار کو یونیورسٹی سے نکال دیا جائے گا۔" راحیلہ نے پانی کی بوتل منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

"توبہ ہے! وہ چیمہ طیارہ تو لگتا ہے آج رضیہ بوٹا کی دو' چار ہڈیاں تو توڑ ہی دے گی۔ کم بخت ایسے لڑ رہی تھی جیسے بلیک بیلٹ ہو۔"

"مجھے تو ابھی تک صفدر موٹے کا سرخ سرخ خون ہی نہیں بھول رہا۔" سندس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"صفدر موٹے کا ہی نہیں' سارے انسانوں کے خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔" راحیلہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ اس لیے اس نے ماحول کی سنگینی کو کم کرنے کے لیے قدرے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ سامنے ایک ہی چارپائی پر حنا' سندس' اور نادیہ ڈھیر ہوئی پڑی تھیں۔

"یہ تمہیں سکتہ کیوں ہوا ہے؟" راحیلہ نے فق چہرے کے ساتھ بالکل خاموش بیٹھی حنا کو دیکھا جو کسی گہرے صدمے کے زیر اثر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس نے راحیلہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں کچھ تھا کہ وہ تینوں اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"کیا ہوا ہے...؟" لفظ حنا کے لبوں پر ہی دم توڑ گئے۔

"کچھ نہیں ہوتا۔ خود ہی لڑ بھڑ کر ٹھیک ہو جائیں گے کم بخت۔ ہم خوامخواہ اپنا دل جلا رہے ہیں۔" راحیلہ نے اس کی فق شکل دیکھ کر تسلی دی۔ نادیہ بھی اس کے پاس آن بیٹھی۔ لگتا تھا کہ حنا نے اس واقعے کا اثر دل پر لے لیا تھا۔ وہ تھی بھی تو دھان پان سی وہ حد درجہ غمگین تھی اور بار بار ہاتھ مسل رہی تھی۔ آج پہلی دفعہ انہوں نے اس کے ہاتھوں میں سیل فون

نہیں دیکھا تھا۔

"یار بہت برا ہوا ہے' بہت برا۔۔۔" اس کے حلق میں پھندا سا پڑ گیا تھا۔ آنکھوں سے آنسو ایک قطار کی صورت میں پھسل رہے تھے۔

"زیادہ غم نہ کر' سو روپے کا کارڈ ہی تھا نا' میں لے دوں گی۔" نادیہ نے اپنی کاجل سے لتھڑی آنکھوں کو پھیلا کر سخاوت کا عظیم مظاہرہ کیا تھا۔ اسے اچانک ہی اس کے غم کی ایک وجہ سمجھ میں آئی تھی۔

"بات کارڈ کی نہیں ہے۔" حنا کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی۔

"تو پھر کیا مسئلہ ہے' کہیں تمہیں بھی کسی نے سوئس بینکوں کو خط لکھنے کا تو نہیں کہہ دیا؟" راحیلہ نے ماحول کو خوش گوار کرنے کی شعوری کوشش کی۔

"نہیں۔۔۔" اس نے روتے ہوئے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"کہیں خدانخواستہ تمہارا موبائل فون تو نہیں اس ہنگامے میں گم ہو گیا؟" نادیہ نے دہل کر اس کے خالی ہاتھوں کو دیکھا۔

حنا نے ایک دفعہ پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"تیرا ناصر جمالی تو نہیں کسی اور کو بھگا کر لے گیا؟" راحیلہ نے اس کا کندھا زور سے ہلایا۔

وہ مستقل دائیں بائیں سر ہلا رہی تھی۔

"خدا کے واسطے بتا دے' کیا ہوا؟" سندس نے اس کے آگے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ اس سے تجسس بالکل برداشت نہیں ہوتا تھا۔

"جب جھگڑا ہو رہا تھا کلاس میں الیکشن کا۔" وہ تھوڑا سا اٹک کر بولی' لیکن گلے میں آنسوؤں کا پھندہ سا لگ گیا تھا۔

"ہاں' ہاں! پھر کیا ہوا؟" راحیلہ اتاؤلی ہوئی۔

"میں اس وقت جمالی کو میسج کر رہی تھی۔" حنا کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔

"تو؟ وہ تو تم ہمیشہ کرتی ہو۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے؟" نادیہ بے زار ہو کر شیشہ دیکھنے لگی۔

"بات اصل میں یہ ہے کہ ایک رومانٹک سا ٹیکسٹ جو مجھے جمالی کو کرنا تھا' وہ لڑائی کے دوران حواس باختہ ہو کر اپنے ابے کے نمبر پر کر دیا۔" حنا نے بلی تھیلے سے باہر نکال ہی دی۔

"کیا۔۔۔؟" ان تینوں کو دھچکا لگا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حنا کو ایسے دیکھنے لگی' جیسے کسی بھوت کو دیکھ رہی ہوں۔ وہ اپنے ابا کے غصے کے واقعات اکثر و بیشتر سناتی تھی۔ اس کے ابا سخت روایتی زمیندار تھے۔ اس کی تعلیم کے سخت خلاف تھے۔ وہ تو اس کی منگیتر کی ضد کی وجہ سے وہ یونیورسٹی میں تھی۔ جو ان کو نہ چاہتے ہوئے بھی پوری کرنی پڑی تھی۔

"او بیڑا اتر جائے تیرا۔۔۔" راحیلہ کے منہ سے بے ساختہ پھسلا تھا۔

"بیڑا اب ترے گا نہیں' غرق ہو گا اور بھی وہ فلمی ٹائپ کے ابا جی کے ہاتھوں۔" نادیہ نے ہاتھ میں پکڑا شیشہ چارپائی پر اچھال دیا۔

"کیا لکھا تھا ٹیکسٹ میں؟" سندس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔ وہ سب تھوڑی دیر پہلے ہونے والی لڑائی بھول گئیں۔ حنا نے روتے ہوئے سیل فون ان کے آگے کیا۔ وہ تینوں ایک جھٹکے سے اس پر جھکیں اور تیزی سے میسج پڑھنے لگیں۔

"جمالی! پلیز جلد واپس آ جاؤ ورنہ میرے ولن ابا میرا اور تمہارا رشتہ توڑ دیں گے۔ میں تمہارے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی۔" یہ میسج نہیں میمو کیس اسکینڈل جیسا بم تھا۔ جس نے ان سب کو ہکا بکا کر دیا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے حنا کے ابا جی کا ہاتھ سیل فون میں سے نکلے گا اور ان سب کی بچی (گردن) مروڑ دی جائے گی۔

"یار! تمہارے ساتھ تو مہر بخاری اور مبشر لقمان جیسی ذلالت ہوئی ہے۔۔۔ اف! اب کیا ہو گا؟" نادیہ کی آنکھوں کا کاجل مزید پھیل گیا تھا۔ حنا نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ وہ چاروں بھی بے بسی سے اپنے گروپ کی "واحد منگنی شدہ" لڑکی کو دیکھ رہی تھیں۔ جو عنقریب ان ہی کی لسٹ میں شامل ہونے والی تھی یعنی "غیر منگنی شدہ۔"

☆ ☆ ☆

"اب یہ تم انیس سو ستر کی دہائی جیسی ہیروئن کی طرح غمگین ہونا چھوڑ دو' کچھ نہیں کہتے ابا جی۔ دو دن سے تم نے یہ فلمی منہ جیسا منہ بنا رکھا ہے۔ قسم سے عالیہ بخاری کے "دیوار شب" کی جویا جیسی لگ رہی ہو۔" سندس نے ہاتھ میں پکڑا ڈائجسٹ رکھ کر حنا کو دلاسا دیا۔ جو ٹیلی فون کی ہر گھنٹی کے ساتھ ہی پیلی ہو جاتی تھی۔

"اور کیا' ہمارا ابھی دل دہلا رکھا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ ابا جی بھی مصطفیٰ قریشی کی طرح کہیں سے چھلانگ مار کر ٹپک پڑیں گے۔" "ایہہ شادی نئیں ہو سکدی اے" نادیہ نے منہ بنا کر اپنا پرس کھول کر کاجل نکالتے ہوئے کہا۔ "قسم سے دو دن ہو گئے کوئی میک اپ بھی نہیں کیا۔ آج تو میں خود اپنا بے سوادہ منہ دیکھ کر ڈر گئی تھی۔"

"اور کیا' میرا بھی فکر کے مارے کھانا پینا چھوٹا ہوا تھا۔ آج میس سے آلو چوری کر کے کافی سارے فرنچ فرائز بنا کر کھاؤں گی۔" راحیلہ نے بھی اپنے عزائم بتائے۔

"دھیان سے چوری کرنا' میس والے انکل کل بھی مشکوک نظروں سے گھور رہے تھے۔" نادیہ نے خبردار کیا۔

"لو کل! تو ہم نے حنا کے غم میں کچھ بھی چوری نہیں کیا۔ پھر یہ گنڈاسے جیسی مونچھوں والے انکل کس خوشی میں گھور رہے تھے۔" راحیلہ نے تیوری چڑھائی۔

"خوشی کا تو مجھے پتا نہیں۔ سائیکلوجی کی مشہور زمانہ بی بی سی میڈم رشنا صاحبہ فرما رہی تھیں کہ یہ گنڈاسے جیسی مونچھوں والے انکل ابھی ابھی تازہ تازہ تیسری شادی کر کے آئے ہیں۔" راحیلہ نے نمکو والا لفافہ اپنے آگے رکھ لیا تھا۔

"دُر فٹے منہ۔۔۔ اس کی بھی شادی ہو گئی اور وہ بھی تیسری۔ اِدھر دور دور تک کسی پہلی شادی کا بھی امکان نظر نہیں آ رہا۔ قرب قیامت کی نشانیاں نہیں تو کیا ہیں؟" نادیہ نے ہاتھ میں پکڑا شیشہ سامنے رکھے بستر پر پھینکا۔

"لو ٹینشن کس بات کی ہے۔ تم اگر کہتی ہو تو میں اس گنڈاسہ برانڈ سے آج ہی پہلی فرصت میں بات کر لیتی ہوں۔ شروع میں کیسی شرم۔۔۔ اور ویسے بھی اسلام میں تو چار کی گنجائش ہے' ابھی ایک ویکنسی خالی ہے۔" راحیلہ کے چہرے پر پھیلی خرانٹ سی مسکراہٹ نادیہ کو تڑپا ہی تو گئی تھی۔ سندس بھی تنزیلہ ریاض کا ناول پڑھتے پڑھتے بے ساختہ ہنس پڑی۔ حتیٰ کہ ایک معدوم سی مسکراہٹ حنا کے چہرے پر بھی پھیلی تھی۔

"اللہ کرے! تمہارے دانتوں میں کیڑا لگے۔ تم مرغ مسلم کھاؤ تو تمہیں کدو اور ٹینڈوں کا ٹیسٹ آئے۔" نادیہ غصے سے بددعاؤں پر اتر آئی تھی۔

"کوئی مسئلہ ہی نہیں۔" راحیلہ نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"اللہ کرے! امتحانوں سے ایک دن پہلے تمہارے سارے نوٹس کو دیمک لگ جائے۔" نادیہ کو اور جوش آیا۔

"یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ تم لوگ کس مرض کی دوا ہو۔ ان شاء اللہ تمہاری ہی کتابوں پر ہاتھ صاف کروں گی۔" راحیلہ نے اپنا مخصوص چھت پھاڑ قہقہہ لگایا۔

"اللہ کرے! تمہیں ساجد مسخرے کے ساتھ محبت ہو جائے۔" نادیہ کا یہ وار خاصا تیز تھا۔

"بیڑا غرق ہو تیرا۔" راحیلہ کا قہقہہ راستے میں ہی دم توڑ گیا۔ وہ تڑپ اٹھی۔ "یہ جو تمہارا چوسنی جتنا منہ ہے نا' اس سے کبھی ڈھنگ کی بات بھی نکال لیا کر۔"

"کیوں ساجد مسخرے بے چارے کو کاٹنے لگے ہیں کیا؟ اچھا ہے نا' سارا دن اسٹیج ڈراموں کی سنا سنا کر تمہاری "وکھیاں" (پسلیاں) توڑا کرے گا۔" نادیہ نے اپنے گالوں پر بڑی مہارت سے بلش آن لگاتے ہوئے کہا۔

"دل کر رہا ہے کہ ایک زوردار چانٹا لگا کر تمہارا منہ

سرخ کردوں، تاکہ بلش آن کا خرچا تو بچے۔" راحیلہ کو اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ زہر لگ رہی تھی۔

"تم اپنا یہ شوق کہیں اور آزمانا۔ ابھی مجھے فائنل ایر کو دیئے والے فنکشن کی فکر ہے۔ قسم سے کوئی بھی ڈھنگ کا سوٹ نہیں۔۔۔ اوپر سے چہرہ بھی رف ہوتا جارہا ہے۔ پتا نہیں کیا بنے گا۔" نادیہ نے ایک دفعہ پھر شیشہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر تفکر اور پریشانی نمایاں تھی۔

"سارا دن تو اس مختصر سے حدود اربعہ والے بوتھے پر لیپا پوتی کرکے پیسٹری بنی رہتی ہو ایسے میں چہرے پر نحوست نہیں برسے گی تو اور کیا ہوگا۔" راحیلہ نے چھکا لگایا تھا۔ نادیہ کا چہرہ بغیر کسی بلش آن کے ہی سرخ ہوگیا۔

"چلو میرا تو "مختصر" سہی، لیکن مجھے تو یہ سوچ سوچ کر ہول اٹھ رہے ہیں جس دن تم نے اپنے چار مربع جتنے چہرے پر کچھ لگانے کی کوشش کی تو کم سے کم بھی تین عدد فیس پاؤڈر تو ضرور ہی قربان ہوں گے۔" نادیہ نے فوراً" ہی اسے کلین بولڈ کیا تھا۔

"ارے! جاؤ جاؤ۔ میرا حسن ان تھرڈ کلاس میک اپ کی چیزوں کا محتاج نہیں۔ خیر سے کھاتے پیتے جٹ گھرانے سے تعلق ہے میرا۔ لالیاں تو ویسے ہی میرے رخساروں سے جھلکتی ہیں۔ اسٹابری جیسے ہونٹ ہیں میرے۔" راحیلہ نے کافی بڑی بڑھک ماری تھی۔ سندس نے ہاتھ میں پکڑا ڈائجسٹ بے ساختہ رکھ کے راحیلہ کو دیکھا تھا۔ حنا کو بھی کچھ لمحے کے لیے اپنا غم بھول گیا تھا جبکہ سب سے بُری حالت نادیہ کی تھی جو دن دہاڑے کے اس جھوٹ پر صدمے سے ایک طرف لڑھک گئی تھی۔

"دیکھا۔۔۔ کہا تھا ناں کہ مجھے غور سے نہ دیکھنا ۔میرے حسن کی تاب نہ لاسکوگی۔" راحیلہ نے فخریہ نگاہوں سے سندس اور حنا کو دیکھا۔

"یہ حسن کی تاب سے نہیں، اتنے بڑے جھوٹ کو سن کر صدمے سے گری ہے۔" سندس نے فوراً" اس کی غلط فہمی دور کی۔

اسی وقت ان کے کمرے کا دروازہ زور سے کھڑکایا گیا۔ سندس نے ناگواری سے دروازہ کھولا تو سامنے چوکیدار اپنے دانتوں کی نمائش کررہا تھا۔ اس کے پیلے دانت راحیلہ کو سخت برے لگتے تھے۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ یونیورسٹی چھوڑنے سے پہلے ان میں سے ایک آدھ تو ضرور توڑے گی۔

"فرمایئے۔۔۔؟" سندس نے ذرا سختی سے پوچھا۔

"باہر حنا بی بی کے والد صاحب آئے ہیں۔" چوکیدار نے اطلاع نہیں دی تھی، بلکہ صور پھونکا تھا۔

کمرے میں ایک لمحے میں سناٹا چھا گیا۔ نادیہ کا مسکارا آنکھ میں چلا گیا، راحیلہ کے ہاتھوں سے نمکو کا لفافہ گر گیا جبکہ سب سے بری حالت تو حنا کی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے پھانسی کی سزا سنادی ہو گئی۔

"لو! ہمارے گروپ کی واحد منگنی شدہ لڑکی کی منگنی بھی آج ٹوٹ گئی۔ اف! کیا بنے گا۔" سندس سخت صدمے سے بولی۔ حنا کی تو ٹانگوں سے جان نکل گئی تھی۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا ہوگیا تھا۔

"منگنی کی تو خیر ہے۔ دعا کرو! بچی کی ٹانگیں ٹوٹنے سے بچ جائیں۔" راحیلہ کے لہجے میں بھی دکھ اور تاسف کی فراوانی تھی۔ اس کی بات پر حنا نے آخری دفعہ اپنی صحیح سلامت ٹانگوں کو دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

ایک گھنٹے کے بعد حنا کی واپسی ہوئی تو اس کی نہ صرف ٹانگیں بلکہ باقی جسمانی اعضاء بھی سلامت تھے۔ وہ بڑے بڑے اسٹیل کے ڈول دونوں ہاتھوں میں اٹھائے، سر پر ایک بڑی گٹھڑی رکھے جھومتی جھامتی کمرے میں آئی تھی۔ پچھلے ایک گھنٹے میں سندس نے دو دفعہ سورۃ یٰسین، نادیہ نے ایک ہزار مرتبہ درود شریف کی اور راحیلہ نے بے شمار سورتیں پڑھ کر تصور میں حنا کا چہرہ لاکر دم کردیا تھا۔ آخر کو ان کی دوست تھی۔ حنا کے خوشی سے دمکتے چمکتے چہرے کو دیکھ کر ان تینوں کو جھٹکا ہی تو لگا تھا۔

"بلے بلے وے ٹور پنجابن دی۔" حنا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی گٹھڑی بیڈ پر پھینکتے ہوئے ایک ٹھمکا سا لگایا تھا۔

"یا اللہ خیر! کہیں بچی کے دماغ پر تو اثر نہیں ہوگیا۔" راحیلہ نے سخت مشکوک نظروں سے جھومتی ہوئی حنا کو دیکھا تھا۔ جو اس وقت وجد کے عالم میں دکھائی دے رہی تھی۔ اب اس نے گانے کے بول بھی بدل دیے تھے۔

"وے سونے دیاں کنگنا' سودا اکو جیا۔" حنا نے ایک اور تان لگائی تھی۔ وہ اب کمر پر ہاتھ رکھے بالکل انجمن کے اسٹائل میں گھوم رہی تھی۔

"لگتا ہے کہ اس کے ابے نے منگنی توڑدی اور اس کا ذہن گہرے صدمے کے زیر اثر ہے۔" نادیہ نے بلند آواز میں اندازہ لگایا تھا۔

"او بہن... بیٹھ جا چپ کرکے۔ زیادہ نور جہاں بننے کی لوڑ نہیں' یہ بتا ابا ہی آیا تھا یا پھر تمہارا اجمالی "ابے" کے روپ میں ہاسٹل انتظامیہ کو دھوکا دے کر آگیا تھا۔" راحیلہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی بٹھایا۔ وہ تینوں اب اس کو سخت مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"میری بہنو۔ میری سہیلیو۔ میری سکھیو۔" حنا کی شوخیاں عروج پر تھیں۔ ان تینوں کو اپنا شک یقین میں بدلتا ہوا محسوس ہوا۔

"تھا یقین کہ آئیں گی یہ راتاں کبھی' تم سے ہووے گی ملاقاتاں کبھی۔" حنا اس وقت واقعی ان کو ہوش و حواس سے بے گانہ محسوس ہو رہی تھی۔

"میری بچی بیٹھ جا۔ مانا کہ غم بہت گہرا ہے' لیکن اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" راحیلہ نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"میری خوب صورت' حسین' راج دلاری' گوٹا کناری' پیاری پیاری سہیلیوں کی دعائیں قبول ہوگئیں۔" حنا کے گانوں کا اسٹاک شاید اب ختم ہوگیا تھا۔ تب ہی وہ بولی تھی۔

"بس بس زیادہ مسکے نہ لگاؤ اور اصل بات پھوٹو' ہمارا یہاں دم کر کر کے دم نکلا جا رہا تھا اور تم اتنا خوش خوش واپس آئی ہو۔ آخر وہاں ایسا کیا ہوا ہے؟" نادیہ تپی بیٹھی تھی۔

"ہونا کیا تھا' جس دن یہاں الیکشن کا دنگا فساد چل رہا تھا' اسی دن ابا جی کسی کام سے شہر گئے ہوئے تھے۔ صبح دس بجے سبزی منڈی میں کسی اچکے نے ان کی جیب کاٹ لی۔ پچاس ہزار کے ساتھ ساتھ ابا جی کا موبائل بھی گیا۔ چار دن سے سم بند ہے اور ابا جی نے نیا نمبر لے لیا۔" حنا کھلکھلا کر ہنسی۔ اس کی واقعی اللہ تعالیٰ نے سن لی تھی۔

"شرم نہیں آتی باپ کے نقصان پر دانت نکال رہی ہو۔" نادیہ نے اسے غیرت دلانے کی ناکام کوشش کی۔

"لو! اگر یہ نقصان نہ ہوتا تو جو میرا نقصان ہونا تھا' وہ تم لوگ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ ابے نے ملتان سے چیچو کی ملیاں تک جوتے مارتے ہوئے لے کر جانا تھا۔" حنا کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں' کیونکہ چوری کی وجہ سے ابا جی اس کے "شرانگیز نیکسٹ" کو پڑھنے سے محروم رہ گئے تھے۔

"حیا کرو! وہ اچکا سوچتا ہوگا کہ اس شخص کی بیٹی کتنی گھٹیا ہے جو ایسے میسج کرتی ہے۔" راحیلہ نے ایک نیا نکتہ اٹھایا تھا۔ نادیہ اور سندس اس عقل مندانہ بات پر عش عش کر اٹھیں۔

"ہاں! اسے تو الہام ہوا ہوگا کہ یہ میسج اس بندے کی بیٹی نے کیا ہوگا۔ کیا ٹکے ٹکے کی باتیں کر رہی ہو تم لوگ۔" حنا کی گمشدہ زبان پوری قوت سے واپس آگئی تھی۔

"اللہ کرے اس اچکے کو اس احسان فراموش کے ابے کا نیا نمبر مل جائے اور وہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس کا شرانگیز نیکسٹ انہیں فارورڈ کردے۔" راحیلہ نے جھولی پھیلا کر بددعا دی۔

"شرم نہیں آتی ایسی بددعائیں دیتے ہوئے۔ ایک میں ہوں کہ اماں کو فون کر کے تم لوگوں کے لیے دیسی گھی' ساگ' اچار' گڑ' مکھن اور لسی منگوائی اور تم لوگ مجھے ہی کوس رہے ہو۔" حنا برا مان گئی۔

"اپنے پنڈ کی یہ سوغاتیں سنبھال کر رکھو' ہم کون سا امریکہ میں رہتے ہیں۔ یہی کچھ کھا کھا کر پلے بڑھے ہیں۔" راحیلہ بے نیازی سے کہہ کر اپنا نمکو کا لفافہ نکال کر بیٹھ گئی۔ سندس نے بھی ڈائجسٹ اٹھا کر عنیزہ سید کا ناول کھول لیا تھا۔ جس نے آج کل اس کی رات کی نیندیں اڑائی ہوئی تھیں۔ نادیہ اپنے چہرے پر کلینزنگ کرنے بیٹھ گئی۔

"تم لوگ تو "شریکوں" کی طرح طعنے دے رہی ہو۔ اب اتنی منحوس شکلیں بھی نہ بناؤ۔ کل ہالی ڈے ان میں لنچ کھا لینا۔" حنا کی بات پر تینوں کے چہرے کے تاثرات بڑی سرعت سے بدلے تھے۔

"واقعی...؟" وہ تینوں اچھل گئیں۔

"ویسے تو ہمارا ایسا کوئی موڈ نہیں' لیکن تم اگر اصرار کرتی ہو تو چلے چلتے ہیں۔" راحیلہ کے شاہانہ انداز پر سب کی ہی ہنسی چھوٹ گئی۔

اگلے دن انہوں نے پہلے کینٹ میں اچھا خاصا لنچ کیا اور پھر دل کھول کر فنکشن کے لیے شاپنگ کی۔ شام کو وہ تھکی ہاری واپس ہاسٹل پہنچیں تو سامنے ہی وارڈن سے ملاقات ہوگئی جو ان کے چھت پھاڑ قہقہوں کی آواز سے باہر آئی تھیں۔ اس کے بعد پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی' لیکن رات کو وہ چاروں پھر اپنا پسندیدہ گانا اونچی آواز میں گانے میں مگن تھیں۔

دی سونے دیا کنگنا' سودا اکو جیا۔

☼ ☼ ☼

"یار! کتنے دکھ کی بات ہے کہ سارے جہاں کی بے سوادی لڑکیوں کی منگنیاں اور شادیاں ہوئی جا رہی ہیں۔ ایک ہماری بیری پر کسی نے بھول کر بھی ایک وٹا نہیں مارا۔" اس دن کیمپس میں سعدیہ چیمہ کی عدنان فسادی کے ساتھ منگنی کی خبر نے ان سب کو اداس کر رکھا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ عدنان فسادی نے اس چیمہ طیارہ میں دیکھا کیا؟" ڈپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے نادیہ نے جل کر کہا۔

"دیکھنا کیا تھا۔ عدنان نے سوچا ہوگا کہ چلو گھر کے اندر چیمہ طیارہ اور باہر خود ہی لوگوں سے لڑ بھڑ آیا کرے گا۔" حنا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں! میں نے بھی سنا ہے کہ عدنان کا خاندان لڑنے بھڑنے کا خاصا شوقین ہے۔ اس کی اماں اپنے علاقے کی کونسلر ہیں۔" راحیلہ اندر کی خبر نہ جانے کہاں سے نکال لائی تھی۔ اب مزے سے سب کو بتا رہی تھی۔

"آہا... کونسلر ساس... واہ مزا آگیا' یقین کرو میرا آدھا دکھ تو اس خبر کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ اب پتا چلے گا بی بی سعدیہ چیمہ کو۔" نادیہ نے باقاعدہ چٹخارہ لیا تھا۔

"تم لوگ کسی بھول میں نہ رہنا' سعدیہ چیمہ بھی کون سا کسی سے کم ہے۔ آمنہ ریاض کے "انبساط دل" کی عینا کی طرح چالاک اور عیار ہے۔" سندس نے کہا تو وہ ہنس پڑیں۔

"تم یہ بتاؤ کہ تمہیں ہر موقع پر کوئی نہ کوئی ہیروئن اور ہیرو کیسے یاد آجاتے ہیں؟" حنا نے سخت تعجب سے سندس کو دیکھا۔ اس کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"مجھے تو اس وقت سے خوف آتا ہے۔ جب سندس بی بی کی کسی "بے ادب" بندے سے شادی ہوگئی اور اس نے اس کے ناولز' افسانے اور کہانیاں پڑھنے پر بین لگادیا۔" حنا کے خوش گوار انداز پر سندس کے چہرے کا رنگ تیزی سے اڑا تھا۔

"اللہ نہ کرے! ایسی بددعا تو نہ دو' یہ کتابیں تو میرا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ میں تو کسی باذوق بندے سے شادی کروں گی۔" سندس نے بڑی سرعت سے کہا۔

"کیوں' تم کیا اس بندے کا پہلے اردو ادب کا ٹیسٹ لوگی اور اس کے بعد اسے پاس کروگی۔" راحیلہ نے اسے ہنستے ہوئے چھیڑا۔

"اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔۔۔ اور ویسے بھی اس موقع پر میں اپنی چاچے کی دھی کی پوری مدد کروں گی۔ اس بندے کا فیڈرل کمیشن والوں کی طرح پورا انٹرویو لوں گی۔" نادیہ تبھی اس کی اخلاقی مدد کے لیے میدان میں اتر آئی۔ سندس نے انتہائی ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ہائے! کوئی میری بھی مدد کردے' مجھے بچپن سے لو میرج کرنے کا بے تحاشا شوق ہے۔" راحیلہ نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے سامنے آم کے درخت پر لگی کیریوں کو لالچی نظروں سے دیکھا۔

"ناں بابا! تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ تم لوگوں کے بہت الٹے سیدھے رواج ہیں۔ پہلے بندے سے پوچھو کہ وہ کس برادری کا ہے؟ اگر وہ تم لوگوں کی جٹ برادری کا ہوا تو پھر اس کے بعد اس سے محبت کرو۔ محبت نہ ہوئی' کوئی باقاعدہ منصوبہ بندی ہوگئی۔" نادیہ نے پاؤں پھیلاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"یار کیا کیا جائے۔۔۔ ہم جٹوں کی مت ہی الٹی ہوتی ہے۔ ہمارا خاندانی نظام ایسا ہی ہے۔ اہم لوگ اپنی ہی برادری میں الٹی سیدھی محبتیں کرلیتے ہیں۔ اب میری بڑی بہن جس نے انگلش میں ایم فل کررکھا ہے' چونکہ باہر کوئی اپنی برادری کا رشتہ نہیں اس لیے پھپھی کے میٹرک فیل پتر کے ساتھ اس کا ویاہ کردیا گیا۔ اب وہ ہم سب کو یہ کہہ کر بے وقوف بناتی ہے کہ اس اس جاہل کبوتر باز سے بہت محبت ہے۔" راحیلہ نے استہزائیہ انداز میں اپنا مذاق اڑایا۔

"پھر تم جٹ ہملے کملے سے ہی زبردستی محبت کرلو پوری فیکلٹی میں ایک وہ ہی جٹ ہے۔ ایم اے پاس ہے' گبھرو جوان بھی ہے۔ ورنہ خاندان میں کوئی کبوتر باز تمہارا بھی انتظار کررہا ہوگا۔" نادیہ نے اسے ہنستے ہوئے مفت مشورہ دیا۔

راحیلہ نے چونک کر اسے دیکھا اور زبردستی مسکرائی۔ اس نے بڑے جارحانہ انداز میں ایک پتھر سامنے لگے آم کے درخت پر مارا۔ نشانہ اب بالکل ٹھیک لگا۔ ایک موٹی سی کیری درخت کے نیچے سے گزرتے شہباز جٹ کے سر پر پوری رفتار سے لگی۔ وہ اس اچانک حملے پر بوکھلا کر بیٹھ گیا۔

"اوہ مائی گاڈ۔۔۔ یہ جٹ کملا بھلا کہاں سے ٹپک پڑا اچانک؟" راحیلہ بڑی عجلت میں کھڑی ہوئی۔ اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ شہباز جٹ نے مکمل ہوش و حواس میں سنے تھے۔ اس نے مڑ کر بڑی زخمی نگاہوں سے راحیلہ کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر حد درجہ بوکھلاہٹ شرمندگی اور پریشانی تھی۔ جبکہ باقی تینوں موقع واردات سے فرار ہوچکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"تیرے واسطے میرا عشق صوفیانہ۔۔۔ میرا عشق صوفیانہ۔۔۔" شہباز جٹ فائنل ایئر کے فنکشن میں اسٹیج پر کھڑا سامنے بیٹھی رضیہ بوٹا کو دیکھ کر لہک لہک کر گا رہا تھا۔ رضیہ کے ساتھ بیٹھی راحیلہ بے چینی سے بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ اس کو نہ جانے کیوں غصہ آرہا تھا۔

"یار! یہ تمہاری برادری کا اچھا خاصا بندہ تھا لیکن اس نے بھی آج ناک کٹوادی۔" راحیلہ کے بائیں جانب بیٹھی نادیہ نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ وہ چاروں اسٹیج کے بالکل سامنے بیٹھی تھیں۔

"کم بخت رجو نے بھی تو آج ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا ہے۔ سرخ رنگ کے سوٹ میں خطرہ "چار سو چالیس وولٹ" لگ رہی ہے۔ لگتا ہے کہ آج کسی نہ کسی کو کرنٹ ضرور مارے گی۔" راحیلہ نے بھی زہر آلود لہجے میں سرگوشی کی۔

"وہ تو شروع سے ہی پورے کیمپس میں بجلیاں گراتی پھر رہی ہے' لیکن اس جٹ ہملے کملے کے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہوگیا ہے۔ اچھا خاصا گبھرو جوان منڈا ہے' جبکہ رجو بالکل چھپکلی سی۔۔۔" نادیہ کا غصہ بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ آج ان چاروں نے بھی اپنے بہترین سوٹ پہنے تھے اوپر سے نادیہ نے سب کے اسموکی آئیز میک اپ پر پورا ایک گھنٹہ لگایا تھا۔ پھر بھی ہر ایک کو لگ رہا تھا کہ اس نے اپنا میک اپ شان دار

کیا ہے۔ جبکہ باقیوں کے معاملات میں "ڈنڈی" نہیں "ڈنڈا" مارا ہے۔ وہ بے چاری سارے راستے ان کو اپنے خلوص اور ایمان داری کی صفائیاں دیتی آئی تھی۔ اب فنکشن میں وہ سب کچھ بھلائے یک جان ہوئی بیٹھی تھیں۔ اس فنکشن کی کمپیئرنگ رضیہ بوٹا اور شہباز جٹ نے کی تھی۔ رضیہ کی ادائیں دیکھ دیکھ کر کلاس کی لڑکیوں کا خون کھول رہا تھا۔ رضیہ نے آج سرخ لانگ اسکرٹ کے ساتھ وائٹ ٹاپ پہن رکھا تھا۔ جس کے بارے میں ان چاروں کا خیال تھا کہ وہ یہ ڈریس نہ ہی پہنتی تو اچھا تھا۔ ویسے بھی وہ کچھ بھی پہن لیتی ان چاروں کو ہمیشہ کی طرح زہر ہی لگنی تھی۔

"وہ عشق "صوفیانہ" کی گردان کررہا ہے اور یہ بی بی عشق "ماڈرانہ" کی تفسیر بنی ہوئی ہیں۔" نادیہ نے شہباز کو ایک پھر تان لگاتے دیکھ کر غصے سے کہا۔

"کچھ بھی ہے جٹ ہملے کملے کی آواز متاثر کن ہے۔" حنا نے اسے کھلے دل سے سراہا۔

"ہونہہ! آواز ہی اچھی ہے۔ چوائس تو تھرڈ کلاس ہے۔" راحیلہ نے کینہ توز نگاہوں سے اسٹیج کی طرف جاتی رضیہ کو دیکھا۔ اور شاید یہ اس کی نظروں کا ہی قصور تھا کہ رضیہ بوٹا جو ہائی پنسل ہیل پہن کر اتراتی ہوئی اسٹیج کی سیڑھیوں سے کسی ماڈل گرل کی بھونڈی نقل کی کوشش میں لہرا لہرا کر اتر رہی تھی کہ اچانک ہیل جوتے سے علیحدہ ہوگئی۔ اس اچانک ہونے والے حادثے کے نتیجے میں رضیہ بوٹا ابھی کسی نشئی کی طرح گرنے لگی تھی کہ پاس کھڑے مولوی سبحان نے اس موقعے پر کسی ہیرو کی طرح ہی انٹری دی تھی۔ مولوی سبحان ان کی کلاس کا واحد لڑکا تھا' جس نے شرعی داڑھی کے ساتھ ساتھ ٹخنوں سے اونچی سفید شلوار کے ساتھ رنگ برنگے کرتے پہن رکھے ہوتے تھے۔ وہ اکثر پوری کلاس کو آنے والی قیامت سے ڈرانے کی کوشش میں محو نظر آتا تھا' لیکن اس وقت اپنی بانہوں میں آنے والی "قیامت" کو دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر بہت سے لوگوں کے دلوں پہ چھریاں' چاقو اور کلہاڑیاں پوری رفتار سے چل گئیں۔

"استغفراللہ!" مولوی سبحان نے کسی نازک پھولوں کی ٹہنی کی طرح رضیہ کو کھڑا کیا تھا۔ جس کا منہ شرمندگی سے ٹماٹر کی طرح سرخ ہورہا تھا۔

"مولانا صاحب! ذرا دھیان سے۔ قیامت زیادہ دور نہیں۔" ساجد مسخرے نے بلند آواز میں طنز کیا تھا۔ مولوی سبحان بالکل لڑکیوں کی طرح شرما گیا تھا۔ اس ایک لمحے میں اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کی زندگی میں واقعی "قیامت" آہی گئی تھی۔ وہ قیامت جو اس وقت جٹ ہملے کملے کا بازو پکڑے بمشکل چلنے کی انتہائی بھدی ایکٹنگ کرتے ہوئے باہر جارہی تھی۔ اب باقی پروگرام کی کمپیئرنگ سعدیہ چیمہ اور عدنان فسادی کررہے تھے۔

"کم بخت کمپیئرنگ ایسے کررہے ہیں جیسے "جھوٹ" بول رہے ہوں۔" نادیہ نے راحیلہ کے کان میں سرگوشی کی وہ اس وقت انتہائی بےزاری کے عالم میں بیٹھی تھی۔

"زہر لگ رہے ہیں دونوں۔۔۔ اس سعدیہ چیمہ کو پہلی فرصت میں اپنے دانتوں پر بریسز لگوا لینے چاہئیں۔ ہنستے ہوئے بالکل رانا ٹنگا کی طرح لگتی ہے۔" راحیلہ جل کر بولی۔

"یہ تم اتنا جل بھن کیوں رہی ہو؟ اس وقت تمہاری "اسموکی آئیز" بالکل بل بتوڑی کی طرح لگ رہی ہیں۔ چہرے پر کوئی خوبصورت سی اسمائیل لے کر آؤ۔" نادیہ نے بڑے خوش گوار انداز میں اسے مشورہ دیا جو کہ خاصا مہنگا پڑا تھا۔

"لعنت ہو تمہارے میک اپ پہ۔۔۔ پتا نہیں ہمیں کون سی بھتنیاں بنا کر رکھ دیا ہے۔ قسم لے لو' اگر پوری کلاس کے چالیس لڑکوں میں سے کسی ایک نے بھی نگاہ غلط انداز سے دیکھا ہو۔ ڈوب کے مرجانا چاہیے ہمیں۔ مانگ تانگ کے کپڑے پہنے۔ خجل خوار ہو کر میچنگ کی۔ پورا ایک ہفتہ رنگ گورا کرنے والی کریم مل مل کر جوتے بر لگائی لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ تھو! تم سب اور مرد ہاسٹل کی طرف۔۔۔" وہ اچانک ہی کھڑی ہوگئی۔

نادیہ‘ سندس اور حنانے بوکھلا کے اس کے چہرے پر پھیلے خطرناک عزائم کو دیکھا اور وہاں کوئی ”ٹک“ نہ پاکر فوراً“ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سامنے ساجد منحوس اس وقت اسٹیج انتہائی بے سرے انداز میں ”چھنو کی آنکھ میں ایک نشہ ہے۔“ گارہا تھا۔

”ارے! آپ لوگ کہاں جارہے ہیں؟ ابھی ڈنر شروع ہونے والا ہے۔ میں نے اسپیشل آرڈر پر روسٹ چکن بنوایا ہے۔“ جٹ ہملا کملا اس وقت ڈپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھا رضیہ کے جوتے کی ہیل کو ایلفی کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کررہا تھا۔ ان کو دیکھ کر بڑے جوش سے بولا۔

”جی آپ کو اس ”جوتے“ سے فرصت مل جائے تو ہمارے حصے کا روسٹ بھی خود کھالیجیے گا۔ یا پھر کسی یتیم خانے میں بھجوادیجیے گا۔“ راحیلہ نے کمر پر ہاتھ رکھ کر انتہائی جلے بھنے انداز سے کہا۔ اس کے لہجے میں چھپی تپش پر شہباز جٹ بڑے طریقے سے جھینپ گیا۔

”بس جی! وہ رضیہ اپ سیٹ تھی کہ جوتا ٹوٹ گیا۔ میں نے سوچا کہ جوڑ دوں۔“ اس نے فوراً“ بوکھلا کر صفائی دی۔

”آپ یہاں بیٹھے جوتا جوڑ رہے ہیں اور اندر مولوی سبحان‘ رضیہ بوٹا کے ساتھ دوستی گانٹھ رہا ہے۔ دفع کریں اور رجو سے کہیں کہ سر سلامت ہونا چاہیے ... جوتے بہت۔“ راحیلہ نے اس دفعہ خاصا زور دار حملہ کیا تھا۔ جٹ ہملے کملے کا اس ”بمباری“ پر منہ کھلا تو بند ہونا ہی بھول گیا۔ جب کہ ان تینوں نے بھی پاؤں پٹختی راحیلہ کی پیروی کی جو ہاسٹل کی طرف گامزن تھی۔

ہاسٹل پہنچ کر بھی اس کا مزاج سخت برہم رہا تھا۔ وہ کسی سے بھی بات کیے بغیر موٹی سی چادر اٹھا کر جو لیٹی تو پھر صبح ہی اٹھی تھی۔

”یہ کل رات تمہیں کس کیڑے نے کاٹ لیا تھا؟“ نادیہ نے اسے پراٹھے کے اوپر اچار رکھ کر بے تکلفی سے کھاتے دیکھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں بس جٹ ہملے پر غصہ آگیا تھا۔ کمینے نے ہماری برادری کی ناک ہی کٹوادی۔ ہماری برادری کے لڑکے یوں شوہدوں کی طرح لڑکیوں کے پیچھے نہیں گھومتے۔ اس کی حرکتوں پر میرا دماغ گھوم گیا تھا۔“ راحیلہ کی شان بے نیازی کے ساتھ دی جانے والی وضاحت پر نادیہ کا خون کھول اٹھا تھا۔

”در فٹے منہ۔ تمہاری اس گھٹیا قسم کی برادری والی غیرت کا۔ جسے اس فنکشن میں ہی جاگنا تھا۔ تم نے صرف اس وجہ سے رات کے ڈنر کا بائیکاٹ کردیا۔ اللہ پوچھے تمہیں۔ ساری رات خواب میں بھی ککڑ‘ مرغے اور روسٹ نظر آتے رہے۔“ نادیہ کو بے تحاشا غصہ آگیا تھا۔ کچھ رات کو واپسی پر میس میں کھانے کو مونگ کی بے سوادی دال ملی تھی‘ جسے کھا کر ان سب کے چہروں پر مزید بارہ بج گئے تھے۔ وہ تینوں آدھی رات تک راحیلہ کو ”خراج تحسین“ پیش کرتی رہی تھیں۔

”ہاں! تو غیرت تو غیرت ہوتی ہے۔ کسی بھی وقت جاگ سکتی ہے۔ تم لوگ خود سوچو! اس پورے ہاسٹل میں کون مجھ سے زیادہ کھانے پینے کا شوقین ہوگا۔ آدھے ہاسٹل کو تو حسرت ہے کہ کبھی میرا منہ بند دیکھیں۔ ساری دنیا میرے کھانے پینے سے جلتی ہے۔ میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہی کھانا پینا اور موج اڑانا ہے۔ ان تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ذرا خود اپنی کبھی نہ استعمال ہونے والی عقلوں پر زور ڈالو تو تمہیں خود میرے جذبات سمجھ میں آجائیں گے کہ کوئی بات تو ایسی تھی کہ میں نے اچھے خاصے ڈنر پر لات ماردی۔“ راحیلہ کی بات میں وزن تو تھا تب ہی وہ تینوں چپ کی چپ رہ گئیں۔

”راحیلہ! کہیں تمہیں جٹ ہملے کملے سے محبت تو نہیں ہوگئی؟“ سندس اچانک بولی۔ اس کی بات پر راحیلہ کے چہرے کا رنگ فق ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ کر چائے کی پیالی میں جاگرا تھا۔ حنا نے جو اپنے منگیتر کو صبح صبح گڈ مارننگ کا میسج بھیج رہی تھی‘ سخت حیرت سے راحیلہ کا زرد چہرہ دیکھا تھا۔ نادیہ نے مسکارے کا برش آنکھوں پر پھیرنے کے

بجائے بوکھلاہٹ میں ہونٹوں پر پھیر لیا تھا۔

”راحیلہ۔ بیڑا ترجائے تیرا“ نادیہ نے اپنے کالے ہونٹوں کو دیکھ کر غصے سے کہا۔ وہ تینوں ہی راحیلہ کے چہرے پر پھیلے تاثرات پر ہکا بکا تھیں۔

”میں تبھی کہوں کہ اس کمینی نے روسٹ کیسے چھوڑ دیا۔“ نادیہ کو ابھی ابھی سارا معاملہ سمجھ میں آیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں اس بنگالی بابا کے پاس پہلی فرصت میں ہی جانا چاہیے۔ جس کا دعوا ہے کہ چند گھنٹوں میں محبوب آپ کے قدموں میں ...“ حنا نے سیل فون ایک طرف رکھتے ہوئے فوراً“ مشورہ دیا۔ جب کہ راحیلہ کو پتا نہیں کیا ہوا تھا‘ وہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن صبح صبح شہباز جٹ کو ڈپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر براجمان دیکھ کر وہ چاروں حیران رہ گئیں۔ شہباز جٹ کی آنکھیں رت جگے کی عکاسی کررہی تھیں۔ وہ اداس بلبل بنا‘ ٹانگیں پھیلائے سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی فائل پاس ہی زمین پر لاپروائی سے پڑی ہوئی تھی۔ اس وقت وہاں اکا دکا اسٹوڈنٹ ہی گھوم رہے تھے۔ پہلی کلاس میں حاضری معمول سے خاصی کم ہوتی تھی اور شہباز جٹ کا تو یہ ریکارڈ تھا کہ اس نے آج تک پہلی کلاس نہیں لی تھی۔

”کہیں اس نے مسجد کے لیے چندہ اکٹھا کرنا تو نہیں شروع کردیا‘ جو ایسے راستے میں بیٹھا ہوا ہے۔“ نادیہ نے نسبتاً“ دھیمی آواز میں کہا۔

”مجھے تو لگتا ہے کہ اس نے رات راحیلہ کو خواب میں دیکھ لیا ہے کوئی ڈراما کرتے ہوئے۔“ حنا کے تبصرے پر راحیلہ کا چہرہ خفت کے مارے سرخ ہوگیا۔

”اس وقت تو یہ مجھے آمنہ ریاض کے ناول ”مرگ وفا“ کا آذر لگ رہا ہے۔“ سندس بھی کون سا کسی سے کم تھی۔

وہ چاروں چلتے چلتے اس کے پاس پہنچیں تو وہ فوراً“ اٹھ کھڑا ہوا۔ ان چاروں نے ہڑبڑا کر جٹ کو دیکھا۔ وہ اپنے پاس رکھا ایک بڑا سفید رنگ کا شاپر راحیلہ کی جانب بڑھا رہا تھا۔ سیاہ رنگ کے سوٹ میں راحیلہ آج خاصی سوگوار لگ رہی تھی اور آج خلاف توقع اس کے ہاتھ میں کوئی کھانے پینے کی چیز بھی نہیں تھی۔

”یہ لیں ...“ وہ انتہائی سنجیدگی سے بولا۔ اس کے چہرے پر پھیلی اداسی دور ہی سے نظر آرہی تھی۔

شہباز جٹ کے لفافے کو دیکھ کر راحیلہ کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔

”مجھے لگتا ہے کہ یہ رضیہ بوٹا کا ٹوٹا ہوا جوتا ہے۔“ نادیہ کی بات پر سندس بے ساختہ ہنسی تھی۔ شہباز نے حیران نظروں سے سندس کو دیکھا۔ اسے نادیہ کی بات سنائی نہیں دی تھی۔ اس لیے وہ سوالیہ انداز سے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ کیا ہے جی ...“ نادیہ نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔ آج تو اس نے اپنی آنکھوں کا خصوصی میک اپ بھی رکھا تھا۔ ورنہ راحیلہ آنکھیں جھکائے اٹھارہویں صدی کی ہیروئن کی طرح پلکیں پٹپٹا رہی تھی۔ وہ خلاف معمول اور خلاف عادت بالکل چپ تھی۔

”یہ رات کے فنکشن کا کھانا ہے۔ میں نے رات آپ لوگوں کا حصہ علیحدہ کرا کے رکھ دیا تھا۔ مجھے اچھا نہیں لگا تھا کہ آپ لوگ بغیر کھائے پیے چلی گئیں ... خصوصاً“ راحیلہ جی ...“ شہباز کی بات پر ان سب کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ انہوں نے بے ساختہ راحیلہ کو دیکھا جو اس وقت پہاڑی پر چڑھی ہوئی لگ رہی تھی۔ ایک نخریلی ہیروئن کی طرح بے نیازی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”کیوں‘ راحیلہ جی آسمان سے اتری ہیں یا ہم سے کوئی پرانی دشمنی ہے؟“ نادیہ نے کھنکتی ہوئی آواز میں جملہ کسا۔ جٹ ہملے کملے کے چہرے پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل میں میں نے ان کو

اکثر کچھ نہ کچھ کھاتے ہوئے ہی دیکھا ہے' جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کھانے پینے کی خاصی شوقین ہیں' اس لیے میں نے ان کے ساتھ ساتھ آپ لوگوں کا بھی حصہ رکھ لیا۔" جٹ کی سادہ انداز میں کی جانے والی بات پر ان تینوں کے منہ سے نکلنے والا قہقہہ خاصا بے ساختہ تھا جبکہ راحیلہ کا چہرہ بالکل سپاٹ ہو گیا۔

"اچھا! آپ رضیہ کے باڈی گارڈ ہونے اور جوتے گانٹھنے کے علاوہ ---- کسی "نادر" کی سرگرمیوں پر نظر بھی رکھتے ہیں' قسم اللہ پاک کی ہمیں بالکل اندازہ نہیں تھا۔" نادیہ نے بالکل فلم اسٹار نشو کی طرح آہ بھری تھی۔

سندس نے کہنی مار کر نادیہ کو تہذیب کے دائرے میں رہنے کی تنبیہہ کی تھی' جسے اس نے ہمیشہ کی طرح چٹکیوں میں اڑا دیا۔ جبکہ شہباز جٹ برامد بن کر کہہ رہا تھا۔

"جی' جناب! ہم اپنی "برادری" کے لوگوں کا خصوصی خیال رکھتے ہیں۔ ہم لوگوں نے یونیورسٹی میں جٹ ایسوسی ایشن کے نام سے ایک تنظیم بنائی ہے جس کا میں جنرل سیکرٹری ہوں۔ مس راحیلہ! آپ اس میں شمولیت اختیار کریں گی؟" شہباز جٹ کی بات پر ان تینوں نے بمشکل اپنی ہنسی چھپائی' جبکہ راحیلہ ہنوز سنجیدہ تھی۔

"لو! ادھر بھی "برادری ازم" کا بخار چڑھا ہوا ہے۔" حنا نے طنزیہ لہجے میں نسبتاً" دھیمے انداز سے کہہ کر اپنا سیل فون بیگ سے نکال لیا تھا جس پر ناصر جمالی کے پانچ میسج آچکے تھے۔

"آپ کو کس نے کہا کہ مس راحیلہ کا تعلق بھی آپ ہی کی برادری سے ہے؟" سندس نے اپنی طرف سے خاصا عقل مندانہ سوال کیا تھا۔

"لو جی! یہ کون سا کوئی مشکل کام ہے۔" شہباز جٹ خواہ مخواہ ہی ہنسا۔ "اتنی بہادر "جی دار" لڑکیاں صرف ہماری برادری میں ہوتی ہیں۔ آج تک جس نے بھی مس راحیلہ کے منہ لگنے کی کوشش کی' اس نے اپنا منہ تڑوایا ہے۔ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ایسی ٹارزن لڑکی یقیناً" جٹ ہی ہو سکتی ہے۔" شہباز جٹ نے اپنا سینہ پھلاتے ہوئے خاصی وزنی دلیل دی تھی۔ جسے ان سب سے پہلے راحیلہ بی بی نے ہی چٹکیوں میں اڑایا تھا۔

"جی ہاں مسٹر شہباز صاحب! آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا۔ لیکن افسوس کہ ہماری برادری کے لڑکے بھی خاصے بہادر اور غیرت مند ہوتے ہیں۔ یوں سڑکوں پر بیٹھ بیٹھ کر لڑکیوں کے جوتوں پر اہلفیاں نہیں چپکاتے۔ آپ پہلی فرصت میں اپنی جٹ ایسوسی ایشن سے استعفا دے دیں۔" راحیلہ بولی نہیں پھنکاری تھی۔ ایک تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ کندھے جھٹک کر کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔

"ہش شاواش۔" نادیہ کے منہ سے بلبلے کی مومو کی طرح بے ساختہ پھسلا تھا۔ جبکہ جٹ کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ تینوں بھی اس کے پیچھے لپکیں۔ نادیہ کو جاتے جاتے اچانک یاد آیا' آج ہاسٹل کے میس میں شلجم پکنے کی باری ہے۔ اسی سوچ کے ساتھ وہ پیچھے پلٹی اور شہباز جٹ کے ہاتھ سے لفافہ جھپٹ لیا جو وہ روبوٹ کی طرح پکڑے کھڑا تھا۔

"مجھے دیں جی آپ لوگوں کے برادری کے جھگڑے تو چلتے رہیں گے۔ اب کھانے پینے کے ساتھ کیا ناراضی۔" اس کے اس بہادرانہ کارنامے پر سندس اور حنا عش عش کر رہی تھیں اور انہوں نے اسے بے ساختہ تھپکی دی تھی۔

"دل کر رہا ہے کہ میس کے سارے شلجم ٹنڈے اور کدو تمہارے اس کارنامے پر تمہارے سر سے وار کر پھینک دوں۔" سندس کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی تھی۔

"کاش! آسیہ رزاقی کی ہیروئن بھی ایسی بہادر بن جائے۔" اسے اچانک ہی آسیہ رزاقی کی مسکین اور روتی دھوتی ہیروئن کے دکھ یاد آگئے تھے۔

انٹرنیشنل ریلیشنز کی کلاس میں نادیہ نے ان سب کی نظروں سے چھپ چھپا کے ایک لیگ پیس لفافے سے اڑا کر کھا بھی لیا تھا۔ ساری رات خواب میں نظر

آنے والے گلزاب حقیقت کا روپ دھار کر اس کے ہاتھ میں تھے۔ اس لیے دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

"یار! آپس کی بات ہے کہ بندہ ہاسٹل آکر کتنا ندیدا بن جاتا ہے ناں؟ گھر جاکر ہر چیز پر مر بھکوں کی طرح ٹوٹنا ہے۔ جیسے ہم اب اس کھانے پر حملہ آور ہیں۔" حنا اپنا سیل فون ایک طرف رکھے روسٹ سے بھرپور انصاف کر رہی تھی۔ اسی وقت نادیہ کی نظر راحیلہ پر پڑی۔

"ویسے راحیلہ... اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو یہ کوئی "تیسرا" چیسٹ پیس ہے جو تم اڑا رہی ہو اور اس وقت اس مسکین جٹ بھلے کملے کے سامنے تو ایسے اکڑ کر کھڑی تھیں کہ ایک لمحے کو تو مجھے بھی لگا کہ ایسی "غیرت مند" دوست ہماری ہو ہی نہیں سکتی۔" نادیہ ہاسٹل میں اپنے کمرے کی میز پر آلتی پالتی مارے رائتے والے لفافے میں سوراخ کرکے بڑی مہارت سے پی رہی تھی۔

"مجھے خود یقین نہیں آرہا۔ تم لوگوں کو کیسے آئے۔" راحیلہ ڈھٹائی سے ہنسی۔ اس کی بات پر سب نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"ویسے تو تم کھانے پینے کی چیزوں پر مرتی ہو لیکن اس وقت تمہیں کیا دورہ پڑا تھا؟" حنا کا لہجہ اچھی خاصی ترشی لیے ہوئے تھا۔

"یار مجھے تو خود پتا نہیں چلا کہ میں غصے میں کیسے وہ شاپر چھوڑ کر آگے بڑھ گئی، لیکن تھوڑا آگے جاکر ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ میں دل میں دعائیں کر رہی تھی کہ اللہ پاک تم لوگوں کو اتنی عقل دے دے کہ کھانے کا لفافہ ضرور پکڑ لو۔ میں نے پیچھے مڑ کر جب نادیہ کے ہاتھ میں لفافہ دیکھا تو قسم سے ٹھنڈ پڑ گئی۔ ہمارے گروپ میں میرے بعد صرف نادیہ ہی تو عقل مند اور بہادر ہے ورنہ سندس اور حنا تو بس بکریاں ہی ہیں۔" راحیلہ نے شاپر سے ایک اور کباب نکالتے ہوئے گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا۔

"لعنت ہو ایسی نام نہاد غیرت پر..." حنا بھڑک کر بولی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا پیس پلیٹ میں پٹخ کر راحیلہ کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔

"میں اور سندس بکریاں ہی ٹھیک ہیں، ہمیں تم جیسا ماڑی نیت رکھنے والا کاغذی شیر نہیں بننا۔" اسے راحیلہ کی بات پر ٹھیک ٹھاک غصہ آگیا تھا۔ سندس نے بھی تاسف بھری نظروں سے راحیلہ کو دیکھا جو اس وقت ہر قسم کی ناراضی بھلائے مرغے کی گردن کی ہڈی بڑے اطمینان کے ساتھ چبا رہی تھی۔

"توبہ ہے! کتنی نازک مزاج ہو تم لوگ... مذاق کر رہی ہوں یار..." راحیلہ نے نادیہ کے دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے فوراً" صفائی دی تو حنا کے چہرے کے تاثرات میں کچھ تبدیلی آئی۔

"دفع کرو حنا! تم کیوں اپنا دل جلاتی ہو۔ آرام سے کھاؤ۔ سوچو! اس راحیلہ کی بچی کی طرح ہماری بھی نام نہاد غیرت اگر اس وقت جاگ جاتی تو اس وقت شلجم کھا کے اپنی قسمتوں کو رو رہے ہوتے۔" سندس کے محبت بھرے انداز پر حنا کو کچھ حوصلہ ہوا تو اس نے پلیٹ دوبارہ اٹھالی تھی۔ لیکن اس کے چہرے پر خفگی کے سائے ابھی بھی برقرار تھے۔

"ویسے آپس کی بات ہے کہ تمہیں واقعی جٹ بھلے کملے پر غصہ آیا تھا یا پھر یوں ہی اسٹارپلس کا کوئی ڈراما کر رہی تھیں؟" نادیہ نے تھوڑا سا جھک کر شرارت سے راحیلہ سے پوچھا۔

"ویسے آپس ہی کی بات ہے کہ فنکشن والے دن تو واقعی مجھے ٹھیک ٹھاک غصہ آیا تھا لیکن اس کے بعد اگلے دن بس نری ڈراما بازی ہی تھی۔" راحیلہ نے سندس کی پلیٹ سے آدھا کباب اچکتے ہوئے حقیقت جتائی تھی جسے سن کر وہ تینوں ہکا بکا رہ گئیں۔

"اس ڈرامے کا خیر سے مقصد کیا تھا؟" حنا نے ماتھے پر بل ڈال کر جھنجلا کر پوچھا۔

"ایویں...!" راحیلہ کے جواب پر ان تینوں کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی تھی۔ ان سب کے چہروں پر پھیلے سنگین قسم کے تاثرات سے گھبرا کر راحیلہ فوراً" گویا ہوئی۔

"پاگلو...! تم لوگ تو بس نری بدھو ہو۔ تمہیں کیا پتا

لڑکے ایسے اسٹائل سے کتنے امپریس ہوتے ہیں۔ دیکھ لینا اب جٹ بھلا کملا انا (اندھا) ہو کر میرے پیچھے آئے گا۔" راحیلہ کی خوش فہمیاں عروج پر تھیں۔

"توبہ! تم تو میرے اندازے سے بھی زیادہ گھٹیا ثابت ہوئی ہو۔ پیچھے کرو یہ سارا کھانا۔ میری تو صدمے کے مارے بھوک ہی اڑ گئی ہے۔" نادیہ چھلانگ مار کر میز سے نیچے اتر کر ان سب کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"تمہاری صدمے سے نہیں، پیٹ بھر جانے کے بعد بھوک ختم ہوئی ہے۔ دو چکن پیس، ایک پوری بڑی بریانی کی پلیٹ اور تین کباب کھانے کے بعد بھی کس کافر کی بھوک باقی رہتی ہے۔" راحیلہ مسکرائی۔

"اگر جٹ تمہارے پیچھے کملا ہو گیا تو پھر رضیہ بوٹا کا کیا بنے گا؟" سندس کو ایک اور غم نے گھیر لیا تھا۔

"وہ ہی جو فرحت اشتیاق کی ہر ہیروئن کا بنتا ہے یعنی کہ ایک انتہائی محبت کرنے والا شریک سفر مل جائے گا۔" راحیلہ نے فخریہ نظروں سے اپنی دوستوں کو دیکھا۔ جو سخت حیرت سے اسے ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہو۔

"یہ محبت کرنے والا شخص کیا آسمان سے ٹپکے گا یا زمین سے برآمد ہو گا؟" حنا نے طنزیہ نظروں سے راحیلہ کا چمکتا دمکتا چہرہ دیکھا تھا۔

"وہ محبت کرنے والا شخص ہماری کلاس میں سے ہی نکلے گا، اور وہ ہے مولوی سجان صاحب..." راحیلہ نے لاپروائی سے ہاتھ جھاڑے اور ایک لمبی سی توبہ شکن انگڑائی لی۔

"کیا...؟" ان سب کے منہ سے ایک اجتماعی چیخ بلند ہوئی۔

"جی جناب! میں نے رات ہی مولوی سجان کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ رضیہ بوٹا کو تم سے عشق ہو گیا ہے اور وہ تم سے اظہار کرنے میں شرما رہی ہے۔ اس لیے اسے ٹائم دو اور لالچی رضیہ کو باتوں باتوں میں سجان کے پانچ مربعوں کی داستان بھی سنا دی تھی۔ دیکھا نہیں تھا سجان صاحب آج کیسے رجو کے پیچھے پیچھے تھے اور اسی وجہ سے تو جٹ بھلا کملا اس سے بدگمان اداس بلبل بنا ہوا تھا۔" راحیلہ نے آخر کار ساری داستان سنا ہی دی۔

"تمہیں شرم نہ آئی یہ سب کرتے ہوئے؟" سندس نے تاسف بھرے انداز سے کہا تھا جبکہ راحیلہ نے اس کی بات پر ایک قہقہہ لگایا تھا۔

"رجو کون سا شہباز جٹ کے ساتھ سنجیدہ تھی، ورنہ سجان کے مربعوں کے لالچ میں اس کے ساتھ بیٹھ کر کینٹین پر نان چھولے نہ کھا رہی ہوتی۔"

"ویسے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کتنے مضحکہ خیز لگتے ہوں گے۔ ایک طرف لنڈے کی جینز والی رضیہ بوٹا اور دوسری طرف مولانا صاحب۔" نادیہ کو ایک اور نکتہ یاد آیا۔ اس نے اپنے تخیل میں دونوں کو ایک ساتھ دیکھا تو اس کے بعد اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"واہ راحیلہ! قسم سے سواد آگیا۔ یقین کرو! تمہاری گھٹیا قسم کی طبیعت کے بارے میں جان کر دلی خوشی ہوئی۔" نادیہ کھلے دل سے اسے سراہ رہی تھی۔ راحیلہ کے چہرے پر اس وقت واقعی ایک کمینی سی مسکراہٹ تھی جو سندس اور حنا کا دل جلانے کو کافی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اللہ کرے! اس ساجد مسخرے کے دانتوں میں کیڑا لگ جائے یا اس کے کم از کم دو اگلے دانت تو ضرور ٹوٹ جائیں۔" نادیہ نے انتہائی طیش کے عالم میں اپنی سب سے پسندیدہ بددعا دی تھی۔ وہ چاروں اس وقت اپنے ڈپارٹمنٹ کے آگے بنے ہوئے لان میں سر جوڑے ہوئے بیٹھی ہوئی تھیں۔ نادیہ کے ہاتھوں میں ایک کارڈ تھا جسے وہ ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ اس کا فشار خون خطرناک حد تک بڑھا ہوا تھا، جس کی وجہ سے اشتعال میں مستقل اضافہ ہو رہا تھا۔

"جاکر بتا دینا اسے کہ اپنی ٹانگوں کا بیمہ کروالے چھوڑوں گی نہیں اسے۔" نادیہ نے ایک اور غائبانہ دھمکی دی تھی جبکہ باقی تینوں کے چہروں پر دبی دبی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کی حالت کو انجوائے کر رہی تھیں۔

"سمجھتا کیا ہے خود کو... نواب آصف الدولہ؟ منہ توڑ دوں گی اس کا۔" نادیہ کا چہرہ غصے کی زیادتی سے لال ہو رہا تھا۔

"بس کر میری بچی! یہ لے ٹھنڈی ٹھار کولڈ ڈرنک پی۔ زیادہ غصہ صحت کے لیے اچھا نہیں۔" سندس بھاگ کر اس کے لیے بوتل لے آئی تھی۔

"ویسے یار! ساجد مسخرے کی چوائس دیکھو' کیا سرخ رنگ کے دل والا گھٹیا سا کارڈ ڈھونڈ کر لایا ہے' جس کے عین درمیان تیر خنجر کی طرح گڑا ہوا ہے۔ اوپر سے بے چارے نے لگتا ہے کہ ہماری اموں کے زمانے کے ڈائجسٹوں سے چن چن کر اظہار محبت کے لیے شعر لکھ کر بھیجے ہیں۔" "ساری باتیں چھوڑو' اس کی محبت دیکھو کہ رنگ برنگے مارکرز کے ساتھ تمہارا اور اپنا نام کتنی محنت اور خوب صورتی سے لکھا تھا۔" راحیلہ نے ایک دفعہ پھر دل جلانے والا اپنا مخصوص چھت پھاڑ قہقہہ لگایا' جسے سن کر نادیہ خاصی مشتعل ہو گئی۔ حنا اور سندس نے بمشکل اسے قابو کیا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ آج پہلی کلاس میں وہ لوگ اپنا اسائنمنٹ جمع کرانے پروفیسر خالق صاحب کے کمرے میں گئیں تو پیچھے سے ساجد نے نادیہ کی فائل میں ایک کارڈ چپکے سے رکھ دیا۔ جس میں شاعری کی زبان میں اس سے اظہار محبت کیا گیا تھا۔ وہ نادیہ نے بریک کے وقت دیکھا اور تب سے اس کو سخت طیش آیا ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنے اس کلاس فیلو کو جا کر گولی مار دے۔ وہ تینوں اسے بہلا پھسلا کر کینٹین کے پاس والے لان میں لے آئی تھیں۔ جہاں وہ پچھلے ایک گھنٹے سے ساجد کو بآواز بلند کوس رہی تھی۔

"یار! تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ چلو' کسی نے تو پورے سال میں پہلی دفعہ گھاس ڈالی۔" راحیلہ نے شرارت سے کہا۔

"ایسی بے سری گھاس تمہیں ہی مبارک ہو۔ زہر لگتی ہے مجھے اس کی بتیسی۔ جب دیکھو "ہی ہی" کرتا پھر رہا ہوتا ہے۔ ہنستا ہوا گدھا۔" نادیہ سخت چڑ کر بولی تھی۔

"لو! اچھا خاصا خوش مزاج بندہ ہے' ورنہ ہماری برادری میں تو مردوں کو ہم عید کے عید ہی مسکراتے ہوئے دیکھتے ہیں۔" راحیلہ کو اپنی برادری کے مردوں کی عادات ازبر تھیں اور اکثر ہی یاد آجاتی تھیں۔ اپنی ان برادری والی باتوں پر اسے باقی تینوں سے جھاڑ پڑتی رہتی تھی۔

"ہاں یار! راحیلہ کہہ تو ٹھیک رہی ہے اور پھر دیکھو کہ آج کل رشتوں کا کتنا قحط پڑا ہوا ہے۔ اب اگر میری جمالی کے ساتھ منگنی نہ ہوتی تو کس نے مجھے منہ لگانا تھا۔" حنا کو پتا ہی نہیں چلا وہ روانی میں اپنی ہی بے عزتی کر گئی تھی۔

"فکر نہ کرو' اگر جمالی کی تمہارے ساتھ منگنی نہ ہوتی تو اسے بھی پھر کسی اور نے منہ نہیں لگانا تھا۔" راحیلہ کی صاف گوئی پر حنا نے تلملا کر اسے دیکھا۔

"راحیلہ! تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو' شکر کرو کہ شہباز جٹ تمہاری تھرڈ کلاس اوور ایکٹنگ اور ڈرامے سے متاثر ہو گیا' ورنہ تم کون سا حور پری تھیں اور تمہیں بھی کسی نے نہیں منہ لگانا تھا۔"

"ہاں! تو میں نے کب حور پری ہونے کا دعوا کیا ہے؟" راحیلہ نے کمال بے نیازی سے کہہ کر اپنے بیگ سے سینڈوچ نکال لیا تھا۔ اب مزے سے کھا رہی تھی۔

"ایک تو تم دونوں ہر جگہ... چونچ لڑانے بیٹھ جاتی ہو۔" سندس حد درجہ بے زار تھی۔ اسے آج کل عمر چشما اپنے چشمے کے پیچھے سے باقاعدہ تاڑ رہا تھا اور وہ یہ بات کسی سے بھی شیئر نہیں کر سکتی تھی' کیونکہ انہوں نے اس کا ریکارڈ لگا دینا تھا۔ اس کی بولتی آنکھوں سے چھپنے کے چکر میں وہ اکثر کوئی نہ کوئی

ڈائجسٹ اپنے منہ کے آگے کر کے حفاظتی بند باندھ لیتی تھی۔ اس وقت بھی عمر پھولوں کی باڑھ کے پیچھے بیٹھا مستقل مزاجی سے اس پر آنکھیں ٹکائے بیٹھا تھا۔

"موٹی بھینس کھا کھا کے کسی دن پھٹ جائے گی یا پھر فارمیسی کی سارہ کی طرح بن جائے گی۔ دیکھ لینا! خاندان کا کوئی لڑکا اس کے لیے قربانی دینے کو تیار نہیں ہوگا۔" حنا کا غصہ کسی طور بھی کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ اوپر سے صبح سے جمالی کا کوئی میسج نہ آنے کی وجہ سے بھی اس کا موڈ خاصا خراب تھا۔

"او بہن! میرے خاندان میں تمہارے منگیتر جیسا کوئی نمونہ بھی نہیں۔ دوسرے ہمارا خاندان ذات پات کے جھنجھٹ میں پھنسا ہوا ہے۔ لڑکیوں کو گھر میں بٹھا بٹھا کر بوڑھا کر لیتے ہیں' لیکن ذات برادری سے باہر نہیں نکلتے۔ مجھے تو ایم اے کرنے کے بعد اپنے حالات بھی خاصے مخدوش دکھائی دے رہے تھے اس لیے ذرا ہاتھ پاؤں مار لیے' لیکن اپنی انا اور خود داری مجھے بھی بہت عزیز ہے۔ اگر بندے دا پتر بن کر رشتہ مانگنے گھر آئے تو ٹھیک ورنہ کیمپس میں میں اس کا وقت رنگین کرنے تھوڑی آئی ہوں۔" راحیلہ خاصے تلخ انداز سے گویا ہوئی۔ اس کی بات پر وہ سب ایک لمحے کو خاموش ہو گئیں۔

"ہاں! کہا تو تم نے ٹھیک ہے' لیکن وہ بھلا کملا تو ابھی تک اپنے بے بے کے ہاتھ کے پراٹھے اور قیمہ بھرے کریلوں والے ٹفن ہی بھر بھر کر لا رہا ہے' منہ سے تو کچھ نہیں پھوٹ رہا۔" حنا کا لہجہ ہنوز طنزیہ اور آنکھوں میں اچھی خاصی کاٹ تھی۔

"اس نے مجھے کل ہی بتایا ہے کہ اس دفعہ جب میں ویک اینڈ پر گھر جاؤں گی تو اس کی بے بے ہمارے گھر آئیں گی۔" راحیلہ نے انکشاف کیا۔ جسے سن کر سب کو ایک بار پھر جھٹکا لگا تھا۔

"ہائیں کیا واقعی؟" نادیہ کو بھی ایک لمحے کو اپنا سارا غم بھول گیا تھا۔ راحیلہ کے چہرے پر بڑی دلکش سی مسکراہٹ تھی۔ سندس بھی عالیہ بخاری کے ناول "دیوارِ شب" سے نظریں اٹھا کر اشتیاق سے اسے گھورنے لگی۔

"ہاں جناب! فائنل ایر تک پہنچتے پہنچتے ہم دونوں کے حقوق ایک دوسرے کے نام پر محفوظ ہو چکے ہوں گے۔" راحیلہ کی آنکھوں میں ڈھیر ساری روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ ان تینوں کو پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ وہ اچھی خاصی خوبصورت تھی۔

"یہ سب میرے اس دن کے فنکشن میں کیے جانے والے میک اپ کا کمال ہے۔ اسموکی آئز میں کم بخت لگ بھی تو کتنی پیاری رہی تھی۔" نادیہ نے انتہائی محبت سے اپنی دوست کو دیکھا جس کے ساتھ اس کی سب سے زیادہ بنتی تھی۔

"دفع دور۔ ایسا میک اپ تو میں کبھی بھی نہ کراؤں۔ شہباز کہہ رہا تھا کہ اس فنکشن میں تمہاری آنکھیں بہت خونی لگ رہی تھیں۔" راحیلہ نے منہ بناتے ہوئے اندر کی بات بتائی تو حنا اور سندس بے ساختہ ہنس پڑیں جبکہ نادیہ کو بے تحاشا غصہ آیا تھا۔

"یہ تم نے کب سے اس بھلے کملے کو صرف "شہباز" کہنا شروع کر دیا ہے۔ ذرا بھی سوٹ نہیں کرتا اس پر اور سارا دن تو تم ہمارے سر پر سوار رہتی ہو۔ یہ سارے گھٹیا قسم کے ڈائیلاگ وہ کمینہ جٹ کس وقت تم سے بولتا ہے؟" اس نے اپنی طرف سے حساب برابر کیا تھا۔

"وہ تو میری سیل فون پر کبھی کبھار بات ہو جاتی ہے اور خبردار! تم میں سے کسی نے اسے بھلا کملا کہا تو..." راحیلہ نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔

"کیوں' اب کیا اس کے سرخاب کے پر نکل آئے ہیں؟" نادیہ نے طنزیہ نظروں سے گھورا اور مزید گویا ہوئی۔ "اور بھلا کملا ہی تو ہے جو تم جیسی پھاپھا کٹنی کے قابو میں آگیا اور وہ بے چاری رضیہ بوٹا آج کل سر پر دوپٹا لیے سبحان مولوی کے ساتھ پھرتی ہے۔ کتنی زیادتی کی تم نے اس کے ساتھ۔" نادیہ نے اسے غیرت دلائی۔

"تو اس میں زیادتی کی کیا بات ہے' پہلے نمونہ بن

کر پورے کیمپس میں پھرتی تھی۔ اچھا نہیں ہوا اس کا دین اور دنیا دونوں میری وجہ سے سنور گئے؟" راحیلہ کے پٹاخ سے بولنے پر نادیہ بھی نہ چاہتے ہوئے ہنس پڑی تھی۔
"بات تو سچ ہے، مگر بات ہے رسوائی کی۔" اس نے گنگناتے ہوئے اپنا بیگ کھول کر شیشہ نکالا۔ اپنی شکل دیکھ کر اسے کرنٹ لگا۔
"کتنے برے ہو تم لوگ۔ مجھے بتایا ہی نہیں کہ میری لپ اسٹک اتر گئی ہے۔"
"تمہیں لپ اسٹک لگا کر کرنا ہی کیا ہے۔ ان ہونٹوں سے تھوڑی گالیاں ہی دینی تھیں ناں اس بے چارے ساجد کو۔" حنا نے اپنے منگیتر کو ٹیکسٹ میسج کرتے ہوئے چھیڑا۔
"دھیان سے، کہیں پھر ابے کو میسج نہ کر دینا۔ اس کے بعد پھر تمہیں سیاپا پڑ جائے گا۔" راحیلہ نے اپنے بیگ سے بھنے ہوئے چنے نکال لیے۔
"فکر ہی نہ کرو، میں نے ابے کا نمبر ہی اس سیل فون سے ڈیلیٹ کر دیا ہے۔" حنا کی بات پر نادیہ تڑخ کر بولی۔
"توبہ توبہ! قرب قیامت کی نشانیاں ہیں۔ منگیتر سے دن رات آنکھ مٹکے کرنے کے لیے۔ باپ کا نمبر ہی موبائل سے اڑا دیا۔ توبہ! ایسی اولاد سے تو بندہ بے اولاد ہی اچھا۔"
"تو! ابے بے چارے نے کہاں جانا ہے۔ وہ تو فون کروایا نہ کروا، ہی رہے گا، لیکن آج کل کے لڑکوں کا کیا بھروسا، منگیتر ایسے ہی ہاتھ سے نکل جائے، اس لیے دن رات رابطے میں رہتی ہوں۔" حنا نے اپنی طرف سے خاصی وضاحت دی تھی۔
"بی بی! فکر نہ کرو۔ منگیتر کہیں نہیں جاتے۔ ان کو کوئی "ڈنگر" ہی "منہ لگانے" کی غلطی نہیں کرے گا، اس لیے بے فکر رہو۔" راحیلہ نے ایک دفعہ پھر بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ دے دیا تھا۔ اس کے بعد جو طوفان آیا، وہ کینٹین والے لڑکے کی آمد کے ساتھ ہی ختم ہوا تھا۔ وہ ہاتھ میں دو بڑی بڑی گول گپوں کی پلیٹیں لیے کھڑا بڑی دلچسپی سے یہ لڑائی دیکھ رہا تھا۔
نادیہ اور سندس نے فوراً" پلیٹیں پکڑ کر اسے وہاں سے بھگایا۔ ان کا خیال تھا کہ راحیلہ نے اس کا آرڈر دیا ہو گا۔ جب وہ دونوں لڑنے میں مصروف تھیں، لیکن جیسے ہی نادیہ اور سندس کو ایک پلیٹ خالی کرتے دیکھا تو وہ بھی بھول بھال کر دوسری پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔
"واہ! بھرے ہوئے گول گپوں کا اپنا سواد ہے۔" راحیلہ نے کھٹے پانی کا گلاس ہی منہ سے لگا لیا۔
"مزا آ گیا۔ کس نے منگوائے تھے؟" راحیلہ نے حنا کے دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔
"کیا مطلب، کس نے منگوائے تھے؟ تم نے آرڈر نہیں دیا تھا، جب بھنے ہوئے چنے لینے کینٹین پر گئی تھیں؟" نادیہ نے سخت حیرت سے دریافت کیا۔
"ہرگز نہیں۔" راحیلہ نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اب پھر اپنا چنوں والا لفافہ کھول کر آرام سے بیٹھ گئی۔ اس کے انکار پر نادیہ نے اشارے سے کینٹین بوائے کو بلا کر پوچھا تو وہ اپنے پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔
"جی! یہ گول گپے تو وہ سامنے والے صاحب نے بھجوائے تھے۔" اس کے ہاتھ کے اشارے کے تعاقب میں ان چاروں نے دیکھا تو سامنے ہی ساجد مسخوا اپنی مشہور زمانہ مسکراہٹ کے ساتھ ان کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔
"اوہ نو...!" نادیہ نے سخت صدمے سے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا، جبکہ اس کے تاثرات سے بے نیاز راحیلہ بڑے فخر سے کہہ رہی تھی۔
"میں نہ کہتی تھی کہ ساجد مسخوا اب اتنا بھی برا نہیں۔" گول گپوں کا سواد ابھی بھی زبان پر تھا، اس لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی تعریف کر گئی تھی۔
"یہ لو پیسے اور جا کر اس کے لمبے منہ پر مارو۔" نادیہ نے ایک نوٹ نکال کر کینٹین بوائے کو پکڑایا اور پھر بیس روپے مزید نکال کر زبردستی اسے تھمائے جو اس

حکم پر سخت تعجب کے عالم میں چاروں کو دیکھ رہا تھا۔
"یہ بیس روپے تمہارا انعام ہیں، شاباش جاؤ۔" نادیہ نے اسے ہلا شیری دی اور پھر وہ چاروں سامنے "بٹ فوٹو اسٹیٹ" کی طرف چل پڑیں جہاں سے انہیں نوٹس فوٹو کاپی کرانے تھے۔ امتحان سر پر آ رہے تھے اور ان کی کوئی تیاری نہیں تھی۔ نادیہ اور سندس کو بے بے کے جوتے آج کل دن رات خوابوں میں نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان کی ایف اے پاس بے بے کو سب پتا ہے کہ فرسٹ ڈویژن کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اس لیے اب سنجیدگی سے پڑھائی کی طرف متوجہ ہونا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ لوگ ایک ہفتے کی چھٹیوں کے بعد ہاسٹل آئیں تو راحیلہ کے ساتھ ساتھ نادیہ کے ہاتھ میں بھی منگنی کی انگوٹھی دیکھ کر باقی لوگ حقیقی معنوں میں ششدر رہ گئیں۔ راحیلہ نے تو باقاعدہ تکیہ اٹھا کر اس کی ٹھیک ٹھاک ٹھکائی کی تھی۔ جبکہ حنا بھی تعجب کے عالم میں بار بار سندس سے پوچھ رہی تھی جو نادیہ کی فرسٹ کزن ہونے کی وجہ سے ہر بات سے باخبر تھی، لیکن اس وقت اپنے چہرے پر ایک "پراسرار" سی مسکراہٹ سجائے بیٹھی تھی۔
"کتنی میسنی اور گھنی ہو تم لوگ۔ کانوں کان خبر تک نہ ہونے دی۔ ایک ہم بھانڈ ہیں کہ نیوز والوں کی طرح لمحہ لمحہ کوریج کی کہ "اب شہباز جٹ کی بے بے گھر آ گئی ہیں۔ بیٹھ گئی ہیں، لیٹ گئی ہیں، اب انہوں نے اپنے پوپلے سے منہ کے ساتھ رشتے کی بات کی اور اب دیسی گھی کے لڈو مجھے کھلا رہی ہیں۔" لیکن تم لوگ..." راحیلہ لڑاکا انداز میں کمر پر ہاتھ رکھ کر ان دونوں کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔
"ہمارے ہاں ایسا کچھ ہوا ہی نہیں تو کیا بتاتے؟ بس ساجد بھائی گھر آئے۔ اسے منگنی کی انگوٹھی پہنائی اور چل دیے۔" سندس نے ایک سانس میں بتایا تو حنا اور راحیلہ کا سانس حلق میں ہی اٹک گیا۔

"اف! اس ساجد مسخرے کی اتنی ہمت؟ شکل سے تو اتنا گاؤدی لگتا تھا اور حرکتیں دیکھو اس کی۔" راحیلہ تڑپ کر بولی تھی اور پھر کھا جانے والی نظروں سے نادیہ کو دیکھا۔ وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔

"اور تم کتنی کٹنی ہو۔ شرم تو نہ آئی اس مسخرے کے ہاتھوں انگوٹھی پہنتے ہوئے۔"

"خبردار! تم نے میرے بھائی کو مسخرو کہا۔" سندس نے ہاتھ میں پکڑا خواتین ڈائجسٹ بیڈ پر رکھ کر انتہائی سنجیدگی سے کہا تو راحیلہ کو ایک لمحے کو تو سکتہ ہی ہو گیا۔

"سبحان اللہ اس ڈائجسٹ کے کیڑے کو تو دیکھو کیسے اس مسخرے کو ایک منٹ میں بھائی بھی بنا لیا۔" راحیلہ نے غصے سے سندس کو گھورا۔ پھر کچھ یاد آنے پر بولی۔

"اب مزا آئے گا جب شہباز کو جٹ بھلا کملا کہو گی تو میں تمہارے ساجد کو مسخرو کہوں گی اب پڑے گا نا۔۔۔"

"میرے ساجد بھائی اور جٹ بھلے کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ کہاں میرا بھائی، فرحت اشتیاق کے ناولوں کے ہیرو کی طرح خوب صورت ڈیشنگ اور پڑھا لکھا اور کہاں تمہارا شہباز، ثمرہ بخاری کے ہیرو کی طرح شوخا۔ بس صحت ہی بنا رکھی ہے ہاں! رنگ بھی کچھ گورا ہے۔" سندس کی زبان آج کچھ زیادہ ہی چل رہی تھی۔

"یا اللہ! یہ اپنے ساجد نے کیا پلاسٹک سرجری کے ذریعے اپنی ریضرٹنگ کرالی ہے۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے تک تو ویسا ہی لمبو اور نیلا پیلا تھا۔" راحیلہ اچھی خاصی مشکوک ہوئی۔ نادیہ اور حنا مسکرا کر ان کی نوک جھونک سن رہی تھیں۔

"تم نے کہاں ساجد بھائی کو دیکھا ہے؟" سندس کو ایک دم ہی غصہ آ گیا تھا۔

"پچھلے ایک سال سے دیکھ رہے ہیں۔ اب کیا وہ زمین سے نیا اگ آیا ہے؟" راحیلہ نے دوبدو جواب دے کر حنا کی پلیٹ سے ریوڑیاں اٹھا کر منہ میں ڈالیں

"مجھے لگتا ہے کہ تمہیں کوئی شدید قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہے۔" سندس نے فوراً اپنا سیل فون کھول کر نادیہ کی منگنی کی تصویر نکالی۔

"یہ لو! دیکھو، مرو، اب بتاؤ، میرا بھائی کسی ہیرو سے کم ہے کیا؟"

تصویر دیکھتے ہی راحیلہ کو سو وولٹ کا جھٹکا لگا۔ سامنے ہی بلیک ٹو پیس میں ایک ڈیشنگ سا بندہ مسکراتے ہوئے نادیہ کو انگوٹھی پہنا رہا تھا۔ حنا بھی لپک کر تصویر دیکھنے آئی تھی۔ اسے بھی شاک لگا تھا۔

"یہ تو ساجد مسخرو نہیں ہے۔" راحیلہ کے منہ سے بمشکل نکلا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت، تعجب اور تذبذب کے آثار نمایاں تھے۔ وہ منہ میں ڈالی ریوڑیاں چبانا بھول گئی تھی۔ سندس نے فخریہ نظروں سے دونوں کو دیکھا جو ابھی بھی بے یقینی کے عالم میں تصویر کو اوپر نیچے اور دائیں بائیں کر کے دیکھ رہی تھیں۔

"تو ہم نے کب کہا کہ نادیہ کی منگنی ساجد مسخرے کے ساتھ ہوئی ہے؟" سندس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

"پھر یہ کون ہے؟" حنا نے اپنے پتلے سے ابرو چڑھا کر پہلے سندس اور پھر نادیہ کو دیکھا۔

"یہ میرا سگا بھائی ہے جو دبئی میں ایک کاسمیٹکس کمپنی میں مارکیٹنگ آفیسر ہے اور تمہیں پتا تو ہے کہ اپنی نادیہ کو کاسمیٹکس کی اشیا سے کتنی محبت ہے۔ بس اسی محبت کی وجہ سے میں نے سوچا کہ خوامخواہ ساری زندگی کسی غریب کا نقصان کروائے گی۔ چلو! بھائی کو تو مفت سیمپل ملتے ہیں۔ اس سے اس کا گزارا ہو جایا کرے گا۔" سندس کے لہجے میں شرارت کا عنصر نمایاں تھا۔

"کمینی! تمہارا بھائی اتنا ہینڈسم تھا تو مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" راحیلہ کا غم کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

"اس لیے کہ سندس کا بھائی خوش قسمتی سے تمہاری "جٹ برادری" سے نہیں تھا۔ خیر! سے ہم

مغل ہوتے ہیں مغل۔" نادیہ نے خاصا اترا کر اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ اس وقت بلیو کلر کے سوٹ میں وہ خاصی دمک رہی تھی۔

"آج مجھے پہلی دفعہ مغل حکومت کے زوال کے اسباب سمجھ میں آئے ہیں۔" راحیلہ نے اپنی طرف سے حساب برابر کیا تھا۔

"اس بے چارے ججو مسخرے کا کیا بنے گا؟ اس کے دانت تو اب ہمیشہ کے لیے اندر چلے جائیں گے۔ اب کوئی اسے مسکراتا ہوا نہیں دیکھے گا۔ بے چارہ نمانا۔" راحیلہ کی سوئی ساجد میں ہی اٹکی ہوئی تھی۔ اس کی بات پر نادیہ جل کر بولی۔

"جانے دو یار! یہ آج کل کے لڑکوں کی محبتیں بھی پانی کے بلبلے کی طرح ہوتی ہیں اور یہ گلی گلی میں تیر اور دل والے کارڈز لے کر گھومنے والے بس اپنے وقت کو رنگین کرنے کے لیے لڑکیوں کی قوم کو بے وقوف بناتے ہیں۔ جس کو عزت کے ساتھ اپنے گھر لے کر جانا ہو وہ گلی گلی اشتہار نہیں لگاتے۔ اس لڑکی کو قابل احترام جانتے ہیں اور اس کے لیے پراپر راستہ اختیار کرتے ہیں۔ جیسا کہ شہباز جٹ بھلے کملے نے اختیار کیا۔ دیکھ لو! پورے ڈپارٹمنٹ میں کسی کو بھی نہیں پتا، جبکہ رضیہ بوٹا کے حصے میں کیا آیا؟ وہ سجان بھی کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوا اسے چھوڑ گیا۔"

"ہاں یار! اس بے چاری کے ساتھ تو بہت برا ہوا۔ اس نے اپنی طرف سے تو ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا کہ کہیں ڈور پھنس ہی جائے، لیکن ہر لڑکے نے اس کے ساتھ اپنا وقت ہی رنگین کیا اور اس کے حصے میں صرف ذلت اور رسوائی ہی آئی۔" حنا نے انتہائی افسردگی سے کہا۔

"اسی لیے تو مجھے عمیرہ احمد کی پروقار، سادہ اور مضبوط کردار کی ہیروئن بہت پسند ہے۔" سندس نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا تو ان سب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ سب کی سب اس کی بات سے سو فیصد متفق تھیں۔

"پھر بہنو! اسی بات پر ہو جائے ایک دفعہ پھر۔" نادیہ نے آنکھ دبا کر شوخی سے اشارہ کیا تو اگلے ہی لمحے وہ چاروں حلق پھاڑ کر گا رہی تھیں۔

"وے سونے دیا کنگناں۔" پورا کوریڈور ان کے قہقہوں کی آواز سے گونج اٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

راحیلہ، حنا اور نادیہ کو بینک چوک کی طرف جاتے دیکھ کر عمر چشما ٹو کے دل میں ڈھیروں پھول کھل گئے۔ وہ کئی دنوں سے موقع کی تاک میں تھا۔ امتحانات قریب تھے اور ان سب کو کچھ دنوں تک فارغ کر دیا جانا تھا۔ وہ اس سے پہلے پہلے اپنے دل کی بات اس پڑھاکو سی لڑکی سے کرنا چاہتا تھا، جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ اس کی طرح وہ بھی پہلی تین پوزیشنز میں سے ایک تو ضرور ہی لے گی۔ آج قدرت نے اسے وہ موقع فراہم کر ہی دیا تھا۔ لان میں بوگن ویلیا کی بڑی سی بیل کے نیچے ان چاروں کے بیگ اور فائلیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان بیٹھی سندس "عمیرہ احمد" کے ناول "امر بیل" کا اختتامی حصہ پڑھ رہی تھی۔ اسے اپنے اردگرد کی دنیا کا کوئی ہوش نہیں تھا۔

ناول کے ہیرو عمر کی موت نے اسے خاصا افسردہ کر دیا تھا۔ اس کے پاس استعمال شدہ ٹشوز کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ وہ آخری صفحات پڑھتے ہوئے اپنے آنسو نہیں روک پائی تھی۔

"آپ کیوں رو رہی ہیں؟" عمر چشما ٹو نے اپنی عینک اتار کر سندس کو غور سے دیکھتے ہوئے انتہائی فکر مندی سے کہا۔

اس کے اچانک آ کر بولنے پر سندس ہڑبڑا سی گئی۔ اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر سامنے کھڑے دبلے پتلے سے عمر کو دیکھا، جس کا شمار ان کی کلاس کے انتہائی شریف لڑکوں میں ہوتا تھا۔ اس کو آج تک کسی نے لڑکیوں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

"کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے کیا؟" سندس نے اپنی آنکھوں کو ایک دفعہ پھر صاف

کرتے ہوئے قدرے نرم انداز سے دریافت کیا۔ کچھ اس وقت عمر جہانگیر کی موت نے دل کو خاصا نرم کر رکھا تھا۔ عمر چشما ٹو نے انتہائی فکر مندی کے عالم میں اس نازک سی لڑکی کو دیکھا۔ اس کے نقوش اسے اکثر دل میں اترتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

نازک سا سراپا، پانچ فٹ چار انچ قد، بڑی بڑی غزالی آنکھیں گلابی رنگت اور گھنی پلکوں کے ساتھ وہ اس کے دل میں اچانک ہی اپنے قدم مضبوطی سے جما گئی تھی۔ عمر نے اسے اکثر ارد گرد کی دنیا سے بے نیاز کتابوں میں ہی مگن دیکھا تھا۔ اسے وہ پروقار اور کم گو سی لڑکی پہلی نظر میں اچھی لگی تھی۔

"آپ کو کوئی کام ہے مجھ سے...؟" سندس اس کی جذبے لٹاتی آنکھوں سے گھبرا کر بولی۔ اس نے گود میں رکھا ناول بھی بند کر دیا تھا۔

"دیکھیں سندس! پلیز آپ مجھے اپنے سارے غم دے دیں اور ان خوبصورت آنکھوں کو دوبارہ نم مت کیجیے گا۔" عمر کے انتہائی محبت بھرے انداز پر سندس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر غصے سے اسے دیکھا۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ کون سے غم؟ کہاں کے غم... آپ کس خوشی میں لوگوں کے غم خریدتے پھر رہے ہیں؟ کوئی غموں کی دکان کھولیں گے کیا؟" سندس نے کڑی نظروں سے اسے گھورا تھا۔ اس کی صاف شفاف آنکھوں میں پھیلا گلابی پن عمر چشما ٹو کے دل کو ایک دفعہ پھر دھڑکا گیا۔

"پھر آپ رو کیوں رہی ہیں؟ کیا کسی کے ساتھ جھگڑا ہو گیا ہے؟" اس نے بھی آج ڈھٹائی کے سارے ریکارڈ توڑ دیے تھے۔

"میں تو عمر کی ڈیتھ کی وجہ سے رو رہی ہوں۔" اس نے معصومیت سے کہا۔ سندس کے منہ سے اپنا نام سن کر عمر چشما ٹو پر شادی مرگ طاری کی سی کیفیت ہو گئی۔ اس نے پوری بات پر غور ہی نہیں کیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے سندس؟ کیا آپ نے خواب میں مجھے مرتا دیکھ لیا تھا؟ آپ اسی لیے افسردہ ہیں؟" عمر کے چہرے پر پھیلے اشتیاق کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دیکھ کر سندس ایک لمحے کو ٹھٹکی۔ اس کے اپنے دل میں عجیب سی اتھل پتھل شروع ہو گئی تھی۔

"یقین کریں سندس! مجھے اپنی محبت کی طاقت پر پورا یقین تھا۔ میں ہر نماز میں آپ کو اللہ سے مانگتا، اسی لیے تو اللہ نے میرا خیال آپ کے ذہن میں ڈال دیا۔ آج آپ میرے غم میں رو رہی ہیں اور میرے لیے یہ کسی تمغہ امتیاز سے کم نہیں۔ میں ساری زندگی اب آپ کی ان خوب صورت آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دوں گا۔ میں نے گھر میں اپنی اماں سے بات کر لی ہے۔ وہ آپ کے گھر رشتے کی بات کرنے آئیں گی۔" عمر چشما ٹو انتہائی جوش و خروش سے بات کر رہا تھا۔ سندس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ سخت حیرت سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"اماں کہہ رہی تھیں کہ تمہارے ابا گھر میں ایک بڑی سی لائبریری بنوا رہے ہیں جیسے ہی اس کی کنسٹرکشن مکمل ہو گئی تو وہ دونوں مل کر آپ کے گھر آئیں گے۔" اس نے اپنا چشمہ اتار کر صاف کرتے ہوئے سادگی سے بتایا۔

"لائبریری...؟" سندس کی آنکھیں چمکیں۔

"کیسی لائبریری؟" اسے گھر میں لائبریری بنانے کا جنون تھا اور بے بے اس شوق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھیں۔

"جی! ہمارے گھر میں پہلے سے ہی دو کمروں پر مشتمل ایک لائبریری ہے۔ میری اماں اور ابا دونوں ہی مطالعے کے حد درجہ شوقین ہیں۔ اب کتابیں اور ڈائجسٹ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ لائبریری کو وسعت دے رہے ہیں۔" عمر نے چشمہ اتار کر گھاس پر رکھا تو سندس نے دیکھا کہ وہ اتنا برا بھی نہیں تھا، جتنا اس موٹے موٹے شیشوں والے چشمے کی وجہ سے لگ رہا تھا۔

"کیا آپ خود بھی ڈائجسٹ پڑھتے ہیں؟" سندس کو پہلی دفعہ اس میں دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔

"تو! مجھے تو ابا "کتابی کیڑا" کہتے ہیں۔ کوئی اخبار، کتاب اور ڈائجسٹ میرے ہاتھوں محفوظ نہیں رہتا۔ آج کل "خواتین ڈائجسٹ" میں ایک بہت عنیزہ سید زبردست ناول لکھ رہی ہیں، آپ کو موقع ملے تو ضرور پڑھیے گا۔" عمر کی بات پر سندس کی آنکھوں میں جگنو چمکے۔ اسے لگا کہ اس کی قسمت کا ستارہ اچانک ہی اس سے آن ٹکرایا تھا۔ اس کے دل میں پھلجھڑیاں اور پٹاخے پھوٹ رہے تھے۔ دل کی دھڑکنوں نے ایک علیحدہ اودھم مچا رکھا تھا۔ رخساروں پر پھیلتی سرخی کو عمر چشما ٹو نے عینک اتار کر بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ جبکہ وہ فرط اشتیاق سے اسے بتا رہی تھی۔

"قسم سے آپ چشمہ اتار کر بالکل رائٹر عمیرہ احمد کے ناول "پیر کامل" کے عمر جہانگیر لگتے ہیں۔" اپنی بات کر کے اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ شکر تھا کہ منہ پھٹ راحیلہ اور نادیہ آس پاس نہیں تھیں۔ انہوں نے بھی یہ ناول پڑھ رکھا تھا۔ وہ اگر اس وقت ہوتیں تو اس "کانگڑی" سے عمر جہانگیر کو دیکھ کر صدمے سے بے ہوش تو ضرور ہی ہو جاتیں۔

"لیکن میں آپ کے ساتھ ویسا نہیں کروں گا جیسا عمر نے علیزہ کے ساتھ کیا تھا۔ میں آپ کو "پیر کامل" کے ہیرو کی طرح ہمیشہ خوش و خرم رکھوں گا اور ساری زندگی آپ کی قدر کروں گا۔" عمر چشما ٹو کی بات پر سندس کے دل کی کھیتی ایک دم لہلہا اٹھی تھی۔ اسے پہلی دفعہ عمر چشما ٹو کی بولتی ہوئی آنکھیں بری نہیں لگی تھیں۔

جبکہ ان سے کچھ فاصلے پر موجود اس کی تینوں دوستوں نے عمر چشما ٹو کا آخری ڈائیلاگ سن لیا تھا۔ ان تینوں کو زوردار جھٹکا لگا تھا۔ انہوں نے بوگن ویلیا کی بیل کو ہلا کر ان دونوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔

ڈھیر سارے گلابی ننھے منے پھولوں کی بارش سے وہ دونوں بوکھلا گئے۔ سندس نے بھی گھبرا کر اپنا سائیڈ پر پڑا چشمہ لگا کر اپنی تینوں دوستوں کو دیکھا۔ آج پہلی دفعہ سندس نے اپنا موٹے شیشوں والا چشمہ کیمپس میں پورے اعتماد کے ساتھ لگایا تھا۔ اس عینک میں اسے دنیا پہلے سے زیادہ خوب صورت لگی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے عمر کو دیکھا۔ وہ ابھی بھی انتہائی محبت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اسے ہنستا دیکھ کر وہ تینوں بھی بے ساختہ مسکراتے ہوئے قدرے دھیمی آواز میں شوخی سے لبریز لہجے میں شروع ہوئی تھیں۔

"وے سونے دیا کنگنا، سودا اکو جیا..."

سعدیہ غزل

"آہا... ہا... ہا...!"

کیا میٹھا سا، رسیلا سا عنوان ہے... گلاب جامن...! جو میٹھے کے شیدائی ہیں۔ ان کے منہ میں تو یقیناً" پڑھ کر ہی پانی آگیا ہوگا۔

... اور... جو میٹھے کے شیدائی نہیں ہیں ان سے محض ہمدردی ہی کی جاسکتی ہے۔

... اور ذیابیطس کے مریضوں سے معذرت...!

مگر ٹھہریئے... اس سے پہلے کہ میں کسی سے بھی معذرت یا ہمدردی کروں۔ پہلے اپنا تو کچھ بندوبست کرلوں۔ کیونکہ میرے منہ میں بھی آنے لگا ہے۔

اہم پانی...! ظاہر ہے تذکرہ گلاب جامن کا جو ٹھہرا۔

اور "لوگوں" کے کہنے کے مطابق میرے ہاتھ کی بنائی ہوئی گلاب جامن...!

خیر... لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ میں پوری باورچن ہوں۔ جدید اصطلاح میں کہہ لیجیے میں ایک بہترین "شیف" ہوں۔

ارے نہیں بھئی لو، جو کھانے پکانے کے پروگرامز میں خواتین و حضرات آتے ہیں۔ ان سے میرا دور دور کا بھی علاقہ نہیں۔ میں تو ایک سیدھی سادی گھریلو قسم کی خاتون ہوں۔ کوکنگ میرا پیشہ نہیں' شوق ہے اور میری اکلوتی تفریح بھی۔

آپ لوگ مجھے پاگل سمجھ رہے ہوں گے اور سوچ رہے ہوں گے' آگ کے پاس کھڑے ہو کر تندور بنے باورچی خانے میں سخت گرمیوں کے عالم میں یہ انوکھی خاتون ہیں جو تفریح کرسکتی ہیں تو جناب! مجھے آپ کے سامنے وہی گھسا پٹا ہوا جملہ دہرانا پڑے گا۔ "شوق کا کوئی مول نہیں۔"

اور مجھے یہ شوق اب سے نہیں' نہ جانے کب سے ہے۔ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے میں نے روزمرہ کے بننے والے عام کھانوں میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ ایک ہی سا کھانا بناتے بناتے طبیعت اکتا گئی' سو ان کھانوں میں جدت طرازی شروع کردی۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرے ہاتھ کے بنائے ہوئے کھانے کی لذت کسی کوکنگ آئل یا گھی کی محتاج نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ویسے ہی میرے ہاتھ میں ذائقہ دے رکھا ہے سو میری جدت طرازی میرے گھر والوں کو بھی پسند آنے لگی۔ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے امی نے مجھے کوکنگ کے مختلف کورسز کرنے کی اجازت دے دی۔ یوں میں کالج جانے کی عمر تک تقریباً ہر دیسی اور بدیسی کھانا پکانے میں طاق ہوچکی تھی۔

میرے اس شوق کا فائدہ سب سے زیادہ میرے گھر والوں کو ہوا تھا جنہیں بیٹھے بٹھائے انواع و اقسام کے کھانے' کھانے کو ملتے تھے۔ میرے ابو اور بہن بھائی امی کے ہاتھ کے بنائے ہوئے کھانوں کا ذائقہ بھول رہے تھے اور اتفاق سے اگر کسی مجبوری کے باعث میری چھوٹی بہن کو کھانا پکانا پڑجاتا تھا تو دونوں بھائیوں کے منہ بن جاتے تھے۔

مجھے کھانا کھلا کر بھی بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اب لوگ سوچ رہے ہوں گے "بی بی! اس منگائی کے

میں کوئی کسی کو شربت یا چائے تو دور کی بات' پانی کے ایک گلاس کو ہی پوچھ لے تو بڑی بات ہے۔ تم کھانا کھلانے کی بات کررہی ہو؟؟"

جی ہاں... آپ یہ سوچنے میں بالکل حق بجانب ہیں۔ مگر بحیثیت مسلمان ہمارا یہ یقین ہونا چاہیے کہ ہر انسان اپنا رزق اللہ تعالیٰ کے پاس سے لکھوا کر لاتا ہے۔ اب وہ رزق اسے کہاں سے ملے گا وسیلۂ رزق کون بنے گا؟ یہ کوئی بھی نہیں جانتا۔

سو اگر کسی کا رزق میرے یہاں کا لکھا ہے اور میں کسی کے لیے وسیلۂ رزق بنی ہوں تو اس میں میرا کیا کمال ہے۔

ویسے بھی میں نے یہ بات نوٹ کی ہے' جب ہم کسی کے لیے وسیلہ رزق بنتے ہیں تو ہمارے رزق میں برکت اللہ تعالیٰ خود ہی دے دیتا ہے۔ آج کل لوگوں کو بلکہ ہر گھر میں تنگی رزق کی شکایت ہے۔ تو اس کا حل سیدھا سا ہے۔ اپنے دستر خوان کو وسیع کردیجیے۔ پھر دیکھیے! اللہ تعالیٰ رزق میں وسعت خود بخود دے دے گا۔

خیر! تو جناب بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں کہہ رہی تھی کھانا پکا کر کھلانے کی خوشی اپنی جگہ اور تعریفیں سمیٹنے کا مزا اپنی جگہ۔

جب تک میری شادی نہیں ہوئی تھی تو گھر کی دعوتوں کے علاوہ گھریلو پیمانے پر ہونے والی تقریبات تک کے لیے میں نے کھانے پکائے ہیں۔ پچاس پچپن لوگوں کا کھانا تیار کرلینا تو میرے لیے بڑی معمولی سی بات تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں ہر قسم کا کھانا لذیذ بناتی ہوں۔ مگر میٹھے میں گلاب جامن بنانا میری اسپیشلٹی ہے' تاہم لوگ خواہ میرے ہاتھ کے بنے کھانوں کی کتنی ہی تعریفیں کیوں نہ کریں۔ مجھے خود اپنے ہاتھ کا بنا کھانا کبھی پسند نہیں آتا۔ لوگوں کی تعریف سے میرا آدھا پیٹ تو بھر جاتا ہے۔ مگر پورا پیٹ نہیں بھرتا اور مجھے یہ بھی کبھی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کیوں ہے۔

تذکرہ شادی سے پہلے تک کا ہے۔ کیونکہ شادی کے بعد مجھے اپنی صحیح اوقات کا پتا چلا۔

میرے میاں نصیر احمد۔۔۔

نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ گھبرائیے مت۔۔۔ میں "میاں نامہ" شروع نہیں کرنے جارہی' مگر تھوڑی بیک گراؤنڈ نالج تو ہونی ضروری ہے نا۔

ان دنوں نصیر احمد کی چھوٹی بہن جو شادی شدہ ہیں اور ناروے میں رہتی ہیں۔ ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے پاکستان آئی ہوئی تھیں اور اپنے بھائی کے لیے لڑکیاں دیکھنے کی مہم پر نکلی ہوئی تھیں۔ اتفاق سے قرعہ فال میرے نام نکلا۔ پھر تو "چٹ منگنی' پٹ بیاہ" والا معاملہ ہوا۔

شادی کے ہفتے بھر بعد نند تو واپس ناروے چلی گئیں' ساتھ ہی شادی والے گھر کی رونقیں بھی سمیٹ کرلے گئیں۔ نصیر احمد نے آفس جوائن کرلیا اور میں ڈھنڈار سے گھر میں ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے اکیلی رہ گئی۔ شروع شروع میں تو بڑا بوکھلائی۔

جی نہیں۔۔۔ آپ سمجھے نہیں۔ گھر کی ذمہ داریاں اتنی جلدی پڑنے پہ میں نہیں بوکھلائی' بلکہ نصیر کے اتنے بڑے گھر میں اکیلے پن کے احساس سے بوکھلا گئی۔ کہاں میں بھرے پرے خاندان سے آئی تھی روزانہ ملنے جلنے والوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا اور کہاں نصیر احمد کے یہاں بھولے بھٹکے سے کوئی قدم بھی نہیں رکھتا تھا۔ اگر اتفاقاً"کوئی نازل ہو بھی جاتا تھا تو نصیر احمد کی پیشانی پر پڑے بلوں سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ مہمان کی بے وقت آمد انہیں ناگوار گزری ہے۔ چند ہی دنوں میں مجھے پتا چل گیا کہ نصیر احمد کو ملنے ملانے سے کوئی رغبت نہیں ہے۔ مہمان نوازی کرنا انہیں پسند نہیں ہے۔ اس کی وجہ بھی سیدھی اور سامنے کی تھی۔

نصیر احمد صرف دو ہی بہن بھائی تھے۔ والد کا پہلے ہی انتقال ہوچکا تھا۔ والدہ کا انتقال بھی کچھ سال قبل ہی ہوا تھا۔ عزیز رشتے دار سب دور پرے کے تھے اور دور دراز علاقوں میں رہتے تھے۔ سگے رشتہ داروں میں صرف ایک ماموں تھے وہ بھی تیس پینتیس سال سے برطانیہ میں مقیم تھے۔ اس عرصے میں بمشکل چند بار ہی پاکستان آسکے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے تو اپنے اکلوتے بھانجے کی شادی تک میں شرکت نہیں کی تھی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ کیسی ناشکری عورت ہے۔ آج کل تو لڑکیاں تمنا کرتی ہیں کہ ایسے ہی گھروں میں شادیاں ہوں' جہاں سسرالی عزیزوں کے جھنجھٹ نہ ہوں اور اگر ہوں بھی تو ایسا کچھ انتظام ہو کہ لڑکے کو لے کر علیحدہ ہوجائیں۔ گھر بھر پر ان کی بلا شرکت غیرے حکمرانی ہو۔

آپ کا سوچنا بجا سہی۔ مگر میرے خیال میں' یہ سب رشتے نہ ہوں تو خاندان کا تصور ہی ادھورا ہے۔ بہرحال یہ میرا اپنا نقطہ نظر ہے' ہر ایک کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ ٹوٹے بکھرے خاندانوں کی روایت مغرب کی عطا کردہ ہے۔ ہماری مشرقی اقدار تو جڑ کر رہنا سکھاتی ہیں اور مجھے اپنی مشرقی اقدار سے چپک کر رہنے میں مزا آتا ہے۔

اوہ۔۔۔ باتوں باتوں میں بات کہیں سے کہیں نکل گئی۔ تو میں کیا کہہ رہی تھی۔۔۔؟

یہی کہ جناب! میکے کی طرح سسرال میں بھی تعریفیں سمیٹنے کا خواب "خواب" ہی رہ گیا۔ مگر شوق کا کیا کرتی بھلا؟ سو میاں کو ہی کھلا کر پورا کرتا تھا۔

پھر اس دن پہلی بار میں نے کھانے پر تھوڑا اہتمام کیا۔ بڑے دل سے میں نے "ان" کے لیے نرگسی کوفتے' یخنی پلاؤ' آلو ہری پیاز اور مونگ کی بھنی دال تیار کی اور میٹھے میں میری اسپیشلٹی تھی۔ جی ہاں۔۔۔ گلاب جامن۔

نصیر کے آنے سے پہلے میں کھانا لگاچکی تھی۔

"کیا۔۔۔ کسی کو آنا تھا آج۔۔۔؟" نصیر نے ٹیبل پر مختلف ڈشز دیکھ کر سرسری سے انداز میں سوال کیا۔

"نہیں۔" میرا موڈ بے حد خوش گوار تھا۔ لہٰذا خوش مزاجی سے جواب دیا۔

"پھر یہ اتنا ڈھیر سارا کھانا کس کے لیے بنایا ہے؟" داہنی ابرو اٹھا کر مجھے دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"آپ کے لیے۔" میں کھلکھلائی

"میرے لیے۔۔۔؟!" نصیر نے استعجاب سے شہادت کی انگلی کا رخ اپنی جانب کیا۔ "مجھے انسان سمجھا ہے یا جن۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔ سمجھا تو انسان ہی ہے۔" میں جواب تک نصیر کے انداز کو بے پروائی سے لے رہی تھی۔ اس بار لہجے کی بے پناہ سنجیدگی کا احساس ہوا' سو آہستگی سے جواب دیا۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے' یہ سب میں اکیلے ٹھونسوں گا؟" انہوں نے ٹیبل کی گولائی میں ہاتھ لہرایا۔

"میں بھی تو ہوں۔" کمزور سے لہجے میں' میں نے کہا۔

"چلو مان لیا۔" کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھتے ہوئے انہوں نے آرام سے کہا۔ "مگر دو لوگوں کے لیے چار ڈشز؟"

"یہ متوازن مینیو ہے۔" میں نے قدرے برا مناتے ہوئے کہا۔ "دیکھیے! ٹیبل پر گوشت' دال' چاول' سبزی سب کچھ تو ہے۔" نصیر کرسی پر بالکل سیدھا ہو کر بیٹھ گئے۔

"متوازن مینیو کے نام پر اتنی اشیائے خورد و نوش کا ضیاع کیا تم نے۔۔۔"

"نہیں! ضیاع کیوں؟" میں نے پست لہجے میں کہا۔ "استعمال ہو ہی جائیں گی۔"

"ہاں! پتا نہیں کتنے دنوں تک یہی چار ڈشز کھانی پڑیں گی۔" وہ چڑچڑائے۔ "اللہ مجھ پر رحم کرے۔ تم تو ہفتے بھر کا راشن' دو ہی دن میں ختم کردیا کروگی۔"

اتنی عزت افزائی پر میں خفیف سی ہوگئی۔ کہاں تعریفیں سمیٹنے کی متمنی تھی۔ کہاں صلواتیں پڑ رہی تھیں۔ میری شکل رونے والی ہوگئی۔

"اچھا! ذرا دیکھوں تو کیا شاہکار بنا ڈالے۔" شاید نصیر کو میری شکل پر ترس آگیا تھا۔ لہٰذا احسان عظیم کرنے والے انداز میں کہا۔ "اُف۔۔۔ یہ کیا بنا ڈالا۔" نرگسی کوفتوں کی ڈش کا ڈھکن اٹھاتے ہوئے انہوں نے سر پیٹا۔ "اس ڈش کی تک مجھے سمجھ میں نہیں آتی۔ دو چیزوں کا ضیاع ہے۔ گوشت کی بربادی الگ اور انڈوں کی تباہی الگ۔" میں نے اس بار کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے سنتی رہی۔

"اور دال میں تم نے کس حساب سے تیل ڈالا ہے؟ اتنا تیل کھانے لگا تو کولیسٹرول لیول وہاں پہنچے گا۔" انہوں نے چھت کی جانب اشارہ کیا۔ "چاولوں کو دیکھو! سفید پڑے ہیں اور سبزی میں آلو کچے۔"

توبہ۔۔۔ اعتراض در اعتراض۔ آپ لوگ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ میرا شوہر ہے یا اعتراضات کا جیومیٹری باکس۔۔۔! جو چاہے کہہ لیں مگر میں اپنے شوہر کو کچھ کہہ کر خود کو جہنمی کیسے بنا سکتی ہوں۔

یہ اور بات کہ اس وقت اپنی شان دار عزت افزائی پر آنکھوں میں آنسو بھر بھر آرہے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ نصیر نے مزید کچھ کہے بغیر کھانا کھانا بلکہ یوں کہہ لیجیے "زہر مار" کرنا شروع کردیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے' تمہارے سلیقے' ہاتھ کے ذائقے کی جتنی تعریفیں سنی تھیں' سب بے کار تھیں۔" کچھ کھائے بغیر بخیے ادھیڑنے کے بعد پہلا نوالہ لے کر انہوں نے ایک بار پھر میری "عزت افزائی" کی۔

"تمہیں کھانا بنانا نہیں آتا۔"

ابھی میں بے بسی سے ان کی جانب دیکھ ہی رہی تھی کہ ان کے اگلے جملے نے مجھے چکرا کر رکھ دیا۔

"کاش! میری اماں زندہ ہوتیں تو تم کو بتاتا' ہاتھ میں ذائقہ ہونا کسے کہتے ہیں۔ میری اماں نہایت لذیذ کھانا بناتی تھیں۔"

میں نے پوری آنکھیں کھول کر ان کی اماں کی تعریفیں سننے کے دوران یہ نوٹ نہیں کیا تھا کہ ساری ڈشز تیزی سے آدھی ہوتی جارہی تھیں۔

محنت اکارت جانے کے دھچکے کے بعد یہ دوسرا دھچکا تھا اور کچھ زیادہ ہی شدید تھا۔ جبکہ نصیر میری کیفیت سے بے خبر اب گلاب جامنوں کی جانب متوجہ ہوگئے تھے۔

گاڑھے شیرے میں ڈوبی' نرم' خستہ' تازہ ایک سے سائز کی گول گول سنہری گلاب جامنیں۔۔۔!

"اوہ۔۔۔ یہ بھلا کوئی گلاب جامن ہے؟" پہلی گلاب جامن سالم نگل جانے کے بعد انہوں نے تعجب کا اظہار کیا۔ "میری اماں مرحومہ کے ہاتھ کی گلاب جامن کھائی ہوتی۔" نصیر نے چٹخارہ لیا۔ "مجھے تو اس کا ذائقہ بھولتا نہیں۔" وہ ایک کے بعد دوسری پھر تیسری' چوتھی گلاب جامن اٹھاتے رہے۔

"تم اسے گلاب جامن کہتی ہو۔ لو بھلا۔۔۔ وہ گلاب جامن ہی کیا جس میں گٹھلی ہو۔" بے رحمانہ تبصرہ کرنے کے بعد وہ ہاتھ دھونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں جو گم صم سی کھڑی تھی۔ ان کے جانے کے بعد یکایک ہوش میں آئی۔ بقیہ رہ جانے والی گلاب جامنوں کو میں نے باقاعدہ کھول کھول کر گٹھلیوں کی موجودگی کے لیے ٹٹولا۔ مگر وہاں گٹھلی کیا۔۔۔ گٹھلی کا بچہ بھی نہیں تھا۔ مگر میرا خود پر اعتماد متزلزل ہوچکا تھا۔

"ممکن ہے' نصیر کے پاس جو گلاب جامنیں گئی ہوں' ان میں گٹھلی ہو۔" میں نے خاصی مایوسی سے سوچا۔

پھر تو مجھ پر ایسی بددلی طاری ہوئی کہ میں نے باقی ماندہ کھانا پلیٹوں میں سجا کر پڑوس اور محلے کے چوکیدار کو بھیج دیا۔

"سچ صفیہ! ہر ڈش مزے دار تھی۔" میری پڑوسن جمیلہ خاتون برتن واپس کرنے آئیں تو کہا۔

"میرے شوہر نے تو اس قدر تعریف کی کہ مجھے تم سے حسد ہونے لگا۔ انہوں نے تو یہ تک کہہ دیا کہ میں تم سے کُکنگ کلاسز لے لوں۔"

اصولی طور سے تو مجھے جمیلہ خاتون کی تعریف پر خوش ہوجانا چاہیے تھا۔ مگر ان کے تعریفی کلمات سے مجھے مزا نہیں دیا۔ الٹا میں سوچنے لگی کہ میرے "شیف" ہونے کا فائدہ کیا تھا' جب میرے ہاتھ کا ذائقہ میرے شوہر کو ان کی ماں کے ہاتھوں کی لذت بھلانے میں ناکام تھا۔

پھر تو یہ سلسلہ مستقل ہوگیا۔

نصیر کھانا کھانے بیٹھتے نہیں تھے کہ اماں مرحومہ کی شان میں قصیدے پہلے شروع ہوجاتے تھے اور مجھے ظاہر ہے' اپنے علاوہ کسی اور کی تعریفیں سننے کی عادت کب تھی۔ مگر اماں مرحومہ کی تعریفیں بوریت سے بھرپور ہوتی جارہی تھیں۔ وہ تو شکر ہے عبدالواسع میری گود میں آگیا۔ ورنہ میں تو بوریت سے مرجاتی بس۔ عبدالواسع میری گود میں کیا آیا' میں نے اپنے سارے کھانے کی ترکیبوں کے تجربات اس پر کرڈالے۔

نہیں۔۔۔ مطلب ظاہر ہے' پیدا ہوتے ہی نہیں۔ مگر آہستہ آہستہ میں نے اسے اپنے ہاتھ کے کھانوں کا اس قدر عادی بنا دیا کہ وہ گھر کے کھانوں کے علاوہ باہر کا کچھ بھی کھانا پسند ہی نہیں کرتا تھا۔ یہ بھی قسمت کی تھی کہ قدرت مجھ پر دوبارہ مہربان نہیں ہوئی۔ البتہ عبدالواسع کی صورت میں میرا ایک حمایتی آگیا تھا۔

اگر نصیر اپنی اماں کے ہاتھ کے پکے کھانوں کی تعریف میں سر دھنتے تو عبدالواسع ہر نوالے پر میرے لیے "واہ۔۔۔ واہ" کرتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"امی! آج میری میرے ہم جماعت سے لڑائی ہوگئی۔" اس دن عبدالواسع اسکول سے گھر واپس آیا تو بتایا۔

"کس بات پر؟" میں چونکی' کیونکہ وہ تو بہت صلح جو اور امن پسند بچہ تھا۔

"بس۔۔۔" وہ لاپروائی سے کندھے اچکاتا ہوا کہہ رہا تھا۔ "وہ کہہ رہا تھا' اس کی ممی بہت اچھا کھانا بناتی ہیں۔ میں نے کہہ دیا' میری امی سے زیادہ اچھا نہیں بناتی ہوں گی۔ بس اس بات پر لڑائی ہوگئی۔"

"کیا۔۔۔؟ اتنی چھوٹی سی بات پر لڑائی ہوگئی؟" میں نے بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔

"عبدالواسع ماشاء اللہ اب تم آٹھویں جماعت میں آگئے ہو۔ بڑے ہوگئے ہو بیٹا! اتنی چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر لڑائی نہیں کرتے۔"

"مگر اس نے کیوں کہا کہ اس کی ممی اچھا کھانا بناتی ہیں۔"

"کہہ دیا تو کیا ہوگیا۔ اس کی امی اچھا کھانا بناتی ہوں گی۔"

"اچھا امی! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" عبدالواسع نے شرمندگی مگر نہایت فرماں برداری سے کہا۔

"تو پھر تمہاری جب اس لڑکے سے لڑائی ہوئی تو کسی نے صلح صفائی نہیں کروائی؟" میں نے عبدالواسع کو مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے موضوع تبدیل کردیا۔

"کروائی نا۔" اس نے فوراً کہا۔ "میری کلاس کے ایک لڑکے نے کہا۔ ایسا کرتے ہیں' دونوں کی امیوں کے درمیان کھانا پکانے کا مقابلہ کروا لیتے ہیں۔ جو تم اپنی امی سے پکوا کر لاؤ' وہی چیز یہ بھی لائے۔ دونوں کی امیوں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانے کے بعد ہم دیکھیں گے کہ کس کی بات میں سچائی ہے۔"

میں جو اس کی بات بڑی توجہ سے سن رہی تھی۔ سر جھٹک کر مسکرائی۔ توبہ۔۔۔ آج کل کے بچے کتنے تیز ہیں۔ مقابلے کا طریقہ بھی نکالا ہے تو اپنے حسب منشاء!

"بنانا کیا ہے؟" میں نے سیدھا مطلب کا سوال کیا۔

"چکن ویجی ٹیبل رول۔" اس نے جوشیلے انداز میں جواب دیا۔

"اچھا! بن جائیں گے۔" میں نے سر ہلایا۔

"ارے۔۔۔"

"ٹھیک ہے! پھر جلدی سے سارا سامان لا کر دو۔" میں نے جلدی سے اسے لسٹ پکڑائی۔

"اچھا ہے! تھوڑے اضافی بنالوں گی۔"

عبدالواسع لسٹ لے کر خوشی خوشی روانہ ہوگیا۔ میں نے اسی رات رول تیار کیے اور صبح عبدالواسع کے اسکول روانہ ہونے سے پہلے تل کے اس کے لنچ میں پیک کردیے۔

جب اس کی اسکول سے واپسی ہوئی تو منہ لٹکا ہوا۔

"کیا ہوا۔۔۔؟" میں اس کی صورت دیکھ کر ٹھٹکی۔

"امی۔۔۔! کیا رول اور ہیں۔۔۔؟" اس نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

"کیوں۔۔۔؟" میں حیران ہوئی۔ "کیا پھر لے کر جانے ہیں؟"

"نہیں! سب کو رول اتنے پسند آئے کہ ایک بھی نہیں بچا۔" اس نے شکوہ کرنے کے سے انداز میں کہا۔ "میں نے ایک بھی نہیں کھایا۔"

"اوہ۔۔۔ اتنی سی بات۔" میں بے اختیار مسکرائی۔

"ابھی اپنے بیٹے کے لیے تل دیتی ہوں۔"

"بس تو پھر تل کر دیں۔" عبدالواسع کا چہرہ ایک دم کھل گیا۔ "میں نہا کر ابھی آتا ہوں۔" وہ خوشی خوشی کہتا غسل خانے روانہ ہوگیا۔

"پتا ہے امی! وہ لڑکا آپ کے ہاتھ کے بنائے رول کی تعریف تو کررہا تھا۔" بڑے شوق اور رغبت سے رول کھاتے ہوئے اس نے کہا۔ "مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ رہا تھا کہ میری امی کے ہاتھ کے رول بھی اچھے ہوتے ہیں۔"

دروازے پر بیل ہوئی۔ عبدالواسع دیکھنے کے لیے اٹھا اور تھوڑی ہی دیر بعد جب اس کی واپسی ہوئی تو ساتھ میں میری پڑوسن جمیلہ خاتون بھی تھیں۔

"کھیر بنائی تھی۔ سوچا تمہیں دے آؤں۔" مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا۔ پھر ٹیبل پر ایک نظر ڈالی۔

"اوہو! یہ مزے آرہے ہیں۔"

"آپ بھی آجائیے۔" میں نے مسکراتے ہوئے دعوت دی۔

"تمہارے اتنے اچھے کیسے بن جاتے ہیں؟" ایک رول اٹھا کر کھاتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "جبکہ میں بھی تمہاری بتائی ہوئی ترکیب سے رول بنا رہی ہوتی ہوں۔ مگر یہ بات نہیں آتی۔"

میں نے تحمل سے ان کی بات سن کر ٹھنڈی سانس لی۔ اکثر ان کو مجھ سے یہی شکایت رہتی تھی۔ اس وقت بھی ان کا لہجہ الزام دیتا ہوا سا تھا۔

"میں نے پرسوں بیسن کے سیو بنائے تھے۔ وہ بھی تمہارے جیسے کرک نہیں ہیں۔" ان کا ایک اور اعتراض حاضر تھا۔ "حالانکہ تم نے جو جو چیزیں، جتنی مقدار میں ڈالنے کے لیے کہی تھیں، میں نے اتنی ہی ڈالی تھیں۔"

"سوڈا تو نہیں ڈالا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"بالکل نہیں۔"

"تلنے کے لیے آنچ ٹھیک دی تھی؟"

"جو تم نے بتائی تھی۔" فوراً جواب ملا۔

"پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" میں نے حیرت ظاہر کی۔

"بس آنٹی... ہاتھ ہاتھ کی بات ہوتی ہے۔" عبدالواسع نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"شریر..." اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے جمیلہ خاتون مسکرائیں۔ عبدالواسع بھی مسکراتا ہوا اٹھ گیا۔

"اب میں یہی کروں گی کہ تمہارے ساتھ کھڑی ہو کر دیکھوں گی تم سیو اور رول کس طرح بناتی ہو۔" جمیلہ خاتون کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ "تم جس دن بناؤ مجھے بتا دینا۔"

"بالکل... بالکل! میں آپ کو بتا دوں گی۔" میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "فی الحال آپ یہ رول کھائیں۔"

انہوں نے میری دعوت پر ایک رول تذبذب کے عالم میں اٹھایا، پھر واپس رکھ دیا۔ "اوہ! ٹھنڈے ہو گئے۔"

"ابھی گرم کر دیتی ہوں۔" میں نے مستعدی کا مظاہرہ کیا۔

"ارے! یہ کیا؟" انہوں نے استعجاب سے کہا۔ "توے پر گرم کر رہی ہو؟ تم لوگوں کے یہاں مائیکرو ویو اوون نہیں ہے؟"

"نہیں۔" میں نے سکون سے کہا۔ "میں مائیکرو ویو اوون کے حق میں کبھی نہیں رہی۔"

"کیوں...؟" ان کی آواز میں استعجاب ہی نہیں بلکہ احتجاج بھی تھا۔ "اتنا فائدہ مند تو ہے۔ منٹوں کا کام لمحوں میں ہو جاتا ہے۔"

"مائیکرو ویو کے کام کے ہونے پر تو مجھے اختلاف بھی نہیں ہے۔" میں نے رسانیت سے جواب دیا۔ "مسئلہ سارا ٹیکنالوجی کے دیرپا مضر اثرات کا ہے۔"

"دیرپا مضر اثرات...!" جمیلہ خاتون نے گونجیلی آواز میں دہرایا۔

"جی ہاں... یورپ والوں کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ کوئی ٹیکنالوجی متعارف کرواتے ہیں۔ پھر جب تحقیق سے اس کے مضر اثرات سامنے آنے لگتے ہیں تو اس کا استعمال اپنے یہاں تو ترک کر دیتے ہیں، مگر وہ ٹیکنالوجی ہم جیسے ملکوں تک منتقل کر دیتے ہیں۔"

"تو کیا تحقیق سے مائیکرو ویو اوون کے مضر اثرات سامنے آئے ہیں۔" انہوں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"تحقیقات ابھی چل رہی ہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "مگر ظاہر ہے ان کی تحقیقات ان کے ماحول اور کھانوں کے مطابق ہوں گی۔ ضروری نہیں، وہ ہمارے ماحول اور کھانوں سے مطابقت رکھیں۔"

جمیلہ خاتون میری شکل تکنے لگیں۔ یقیناً انہیں میری بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"مطلب..." میں نے جلدی سے وضاحت کی۔ "یورپی اقوام کا تعلق زیادہ تر سرد علاقوں سے ہے۔ دوسرے ان کے کھانے مسالا جات اور چکنائی کے کثرت استعمال سے دور پرے ہوتے ہیں۔" جمیلہ خاتون نے آہستگی سے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔

"جب تک تحقیق کا دائرہ ہم تک وسیع نہیں ہوگا تو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ مائیکرو ویو اوون کی برقی مقناطیسی شعاعیں جب ہمارے کھانے کے ذرات پر پڑیں گی تو ان کے اندر کچھ کیمیائی تبدیلیاں نہیں لے آئیں گی۔ ان کیمیائی تبدیلیوں کے اثرات فوری طور پر مرتب نہیں ہوں گے۔ بلکہ بہت دیر بعد پتا چلیں گے۔ کسی مہلک بیماری کی صورت میں، شخصی تغیر کی صورت میں، کسی غیر معمولی پن کی صورت میں۔"

جمیلہ خاتون کی نگاہوں سے خوف جھانکنے لگا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کسی بھی ٹیکنالوجی کا استعمال مضر اثرات سے خالی نہیں ہے۔" انہوں نے خوف زدہ سے انداز میں کہا۔ "یہ ٹی وی، کمپیوٹر، اے سی، موبائل وغیرہ سب کے نقصانات کے بارے میں تحقیقی رپورٹس سامنے آرہی ہیں۔"

"دیکھیے... میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ٹیکنالوجی کا استعمال حد میں رہ کر کیا جانا چاہیے۔ اسے اپنی زندگی کا حصہ نہیں بنا لینا چاہیے۔ جہاں فطری طریقوں سے کام چل سکتا ہو... وہاں مصنوعی پن کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"بات تو ٹھیک ہے۔" جمیلہ خاتون نے اتفاق کرنے والے انداز میں سر ہلایا۔ "مگر دیکھو! بحث میں اصل موضوع پیچھے رہ گیا۔"

"جبکہ اصل موضوع گلاب جامن ہے۔" میں نے مدبرانہ انداز میں سر ہلایا۔

"گلاب جامن..." انہوں نے داہنی ابرو چڑھا کر سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا۔ "ہم تو رول کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔"

"اوہ..." میں خفیف سی ہوئی۔

"خیر... خیر... مہمان نوازی کا شکریہ... کھیر کھا کر بتانا کیسی بنی ہے۔"

"جی ضرور..." میں اخلاقاً مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

اس رات نصیر آئے تو بڑے تر و تازہ لگ رہے تھے۔

"آج میرے پاس ماموں کا فون آیا تھا۔" اس سے پہلے کہ میں ان سے وجہ پوچھتی، انہوں نے خود ہی خوشی خوشی بتایا۔ "تین، چار دن میں کراچی آرہے ہیں۔"

میں نصیر کی شکل دیکھنے لگی۔ یہ پہلے رشتہ دار تھے جن کی آمد پر وہ خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ شاید وہ ان کی امی کی طرف کے آخری اور اکلوتے رشتہ دار تھے اسی لیے۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں... اچھی بات تو ہے۔" وہ کھلکھلائے۔ "ذرا گھر کو اچھی طرح سے ٹھیک ٹھاک کر لینا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے تابعداری سے کہا۔ پھر سرسری انداز میں پوچھا۔ "ماموں رکیں گے؟"

"امی ہوتی تھیں تو یہیں رکتے تھے۔" وہ کہتے کہتے ایک دم چپ ہو گئے۔

"کافی عرصے بعد آرہے ہیں نا ماموں۔" میں نے جلدی سے موضوع تبدیل کیا۔

"ہاں... اسی لیے۔" انہوں نے شگفتگی سے کہا۔ "رکنا تو چاہیے۔" انہوں نے کچھ دیر توقف کیا۔ پھر بات جاری رکھی۔ "اور تمہیں بتانے کا مقصد یہی ہے کہ ان کی خاطر داری میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔"

"آپ فکر مت کریں۔" میں نے یقین دلایا۔

"ایسا ہی ہوگا ان شاء اللہ۔" میری یقین دہانیوں پر نصیر قدرے مطمئن نظر آنے لگے۔

"اگلے دو" تین دن ماموں سے متوقع ملاقات کے خوش کن تصور میں گزر گئے۔ تاہم چوتھے دن صبح ہی آفس سے نصیر کا فون آگیا۔"

"میرا سوٹ کیس پیک کردو۔" بے زار سے لہجے میں انہوں نے حکم صادر کیا۔ "آج چار بجے اسلام آباد کے لیے فلائٹ ہے۔"

"اتنی اچانک؟" میں حیران ہوئی۔

"ہاں۔۔۔ کوئی غیر ملکی وفد آیا ہوا ہے۔ مجھے اپنے آفس کی نمائندگی کرنی ہے۔"

"یہ تو اعزاز کی بات ہے۔"

"اعزاز کی بات تو ہے۔" انہوں نے مردہ سی آواز میں کہا۔ "مگر مجھے دو دن وہاں رکنا ہوگا۔ میرے پیچھے ماموں آگئے تو۔"

ان کی پریشانی بجا تھی۔ میں نے اس وقت اور اس کے بعد بھی انہیں ڈھیروں تسلیاں' دلاسے دیے۔ مگر ظاہر ہے امی کی طرف کے اکلوتے رشتے دار اور اتنے سال بعد ان کی پاکستان آمد کے باوجود بھی ان سے ملاقات نہ ہونے کا انہیں شدید قلق تھا۔ سو نہایت تذبذب اور بے دلی ساتھ ان کی روانگی ہوئی۔

اگلے دن میں عبدالوسع کے اسکول جانے کے بعد گھر کی صفائی ستھرائی سے فارغ ہو کر سوچ ہی رہی تھی' کیا پکایا جائے کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولنے پر عمر رسیدہ' قطعی اجنبی مگر مشفق صورت کو سامنے پایا۔

"اوہ۔۔۔ تو تم ہماری بہو ہوگی۔" سلام کا جواب دیتے ہوئے اندر آکر انہوں نے خوش مزاجی سے کہا۔

"جی بالکل۔۔۔" میں خوش اخلاقی سے مسکرائی۔ انہوں نے ہزار کے کئی کڑکڑاتے نوٹ میرے ہاتھ پر رکھے۔

"تمہاری منہ دکھائی۔"

"ارے! میں تو اب پرانی ہو چکی ہوں۔" جھینپتے ہوئے کہہ کر میں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ ان کے لیے کھولا۔

"بھئی۔۔۔ ہم تو تمہیں پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔" صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ مسکرائے۔ میں آداب میز نبھانے کے لیے اٹھ گئی۔

"ہمارا بھانجا کدھر ہے بہو۔" وہ میرے پیچھے باورچی خانے میں ہی چلے آئے تھے اور اب ٹیبل سامنے رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ "کہہ رہا تھا۔ میں آؤں گا تو وہ آفس سے آف لے کر آجائے گا۔"

"وہ تو آفس کے کام سے دو دن کے لیے اسلام آباد گئے ہیں۔" میں نے شربت کا گلاس ان کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔۔۔ جب میری اس سے بات ہوئی تھی۔ تب تو ایسا کچھ اس نے نہیں بتایا تھا۔" انہوں نے شربت کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"بس اچانک ہی پتا چلا۔"

ماموں یعقوب نے ٹھنڈی سانس لے کر سر ہلایا۔ پھر میرے' جلدی جلدی دوپہر کے کھانے کی تیاری کے دوران ان سے ہلکی پھلکی گفتگو بھی چلتی رہی۔ نہایت کم وقت میں میں نے کھانا ٹیبل پر لگا دیا تھا۔

"واہ بھئی۔۔۔ یہ تو زبردست متوازن مینیو ہے۔" انہوں نے تعریفی نگاہ سے ٹیبل پر رکھی ڈشز پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"گوشت' چاول' دال' سبزی سب موجود ہے اور اچھا کیا یخنی پلاؤ بنایا۔ مجھے پسند بھی ہے اور ویسے بھی ہر جگہ بریانی کھا کھا کر میں تھک بھی چکا ہوں۔"

"تو۔۔۔ بسم اللہ کریں نا پلیز۔"

میری دعوت پہ انہوں نے ہر چیز بہت شوق سے اور تعریفیں کر کر کے کھائی اور میرا تو آدھا پیٹ ہی تعریفوں سے بھر گیا تھا۔

"بھئی! ہر چیز نہایت مزے دار تھی۔ مدتوں بعد اتنا لذیذ کھانا نصیب ہوا ہے۔"

میں انکساری سے مسکراتی ہوئی فریج سے میٹھا

نکالنے لگی۔ اسے میری چھٹی حس کہہ لیں یا کچھ اور کہ میٹھا میں کل ہی بنا کے رکھ چکی تھی۔

"ارے واہ۔۔۔ گلاب جامن!" انہوں نے بچوں کے سے انداز میں نعرہ لگایا۔

"میری پسندیدہ مٹھائی۔" انہوں نے ایک گلاب جامن اٹھا کر منہ میں رکھی۔ "واہ۔۔۔ مزا آگیا! اتنی خستہ' تازہ' نرم' ذائقے دار گلاب جامن' وہ بھی گھر کی بنی ہوئی' میں نے برسوں بعد کھائی ہے' بھئی بہو! یہ بات تو ماننے کی ہے کہ تمہارے ہاتھ میں بے حد ذائقہ ہے۔"

میں جو اتنی دیر سے اپنی تعریفوں پر خوش ہو رہی تھی معاً" نصیر کی والدہ کا خیال آگیا اور یک بیک بے حد اداسی نے مجھے آلیا۔

"وہ تو آپ کہہ رہے ہیں نا۔" میں نے نہایت پژمردگی سے کہا۔ "مگر میں نصیر کی والدہ کے ہاتھ جیسا ذائقہ کہاں سے لے آؤں۔ میں تو ان کے جیسی گلاب جامن تک نہیں بنا سکتی۔"

ماموں یعقوب ہاتھ میں پکڑی ہوئی گلاب جامن منہ میں لے جانا بھول کے مجھے دیکھے گئے اور یکایک ان پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ میں حیرانی سے ان کو دیکھنے لگی کہ نہ تو یہ موقع ہی ہنسنے والا تھا اور نہ یہ بات بھی۔

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ نصیر احمد کی والدہ کے ہاتھ میں ذائقہ تھا؟" انہوں نے بمشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہماری ہمشیرہ صاحبہ کو تو کھانا بنانا ہی نہیں آتا تھا۔ کجا یہ کہ ذائقے دار کھانا۔۔۔ اور گلاب جامن تو اس نے پوری زندگی میں ایک ہی بار بنائی تھی۔ مجھے یاد ہے' ان دنوں میں یہاں آیا ہوا تھا۔ جب اس نے پہلی بار گلاب جامن بنائی تھی اور ہمارے بہنوئی صاحب نے ادھ کھائی گلاب جامن میری طرف بڑھا کر بے بسی سے کہا تھا۔ "یار! میرے پتھر بھی تم ہی کھالو۔" پھر بہن جی کو خاص ہدایت کی کہ آئندہ مت بنانا۔" انہوں نے اپنی بات ختم کر کے قہقہہ لگایا۔ میں بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہی۔

تو۔۔۔ ایک عرصے سے جن خاتون کے ہاتھ کے ذائقے کی تعریف سنتی رہی تھی وہ سب غلط تھا' جھوٹ تھا۔ مجھے دکھ ہوا۔۔۔ بے حد دکھ۔۔۔ نصیر کی طرف سے دل میں بدگمانی آگئی۔

"مم۔۔۔ مگر۔۔۔ نن۔۔۔ نصیر تو۔۔۔" میں ہکلا گئی۔ "وہ تو امی کے ہاتھ کے کھانے کی ابھی تک تعریف کرتے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔" انہوں نے سر ہلایا۔ "اس کی وجہ ہے۔ اصل میں اپنی ماں کے ہاتھ کا کھانا ہر بچے کو پسند ہوتا ہے۔ اب چاہے وہ جیسا بھی پکا ہو' کیونکہ یہاں صرف ہاتھ کے ذائقے کا سوال نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کھانے میں خلوص' محبت اور ممتا بھی شامل ہوتی ہے۔" انہوں نے میرے چہرے کو دیکھ کر جلدی سے اضافہ کیا۔

"مجو کسی کھانا پکانے کے تیل کی مرہون منت نہیں ہے۔ اب ہماری اماں مرحومہ کو رحلت فرمائے تقریباً" نصف صدی گزر چکی ہے' مگر ہمیں آج تک ان کے ہاتھ کا ذائقہ بھولا نہیں ہے۔ آہ۔۔۔ ہا۔۔۔ آج بھی ہم ان کے بنائے کھانوں کو یاد ہی کرتے ہیں۔"

وہ کسی سوچ میں گم سے ہو گئے۔ پھر ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اوہو۔۔۔ اب بھانجے اور پوتے سے ملنے کے لیے دوبارہ آنا پڑے گا۔۔۔ خیر۔۔۔ خیر۔۔۔ اتنا مزے دار کھانا کھانے کے لیے تو میں بار بار سکتا ہوں۔ بلکہ مجھے تو لگتا ہے تمہارے ہاتھ کا کھانا کھانے کے لیے مجھے مستقل یہیں شفٹ ہونا پڑے گا۔" وہ ہنسے۔ میں محض ہونٹ پھیلا کر رہ گئی۔

"ان شاء اللہ جلد ہی آؤں گا۔" میرے سر پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے کہا۔

"جی ضرور۔۔۔" کہتی ہوئی میں انہیں جاتا ہوا دیکھے گئی۔

ایک گرہ کتنی آسانی سے کھول گئے تھے ماموں یعقوب۔ مجھے اب سمجھ میں آیا تھا کہ لوگوں کے تعریف کرنے پر میرا آدھا پیٹ بھر تو جاتا ہے۔ مگر اپنے ہاتھ کا کھانا کھا کر میرا پیٹ پورا کیوں نہیں بھرتا؟ کوئی بھلے کتنا ہی میرے ہاتھ کے کھانے کی تعریف کیوں نہ کرے۔ مجھے اپنے ہاتھ کا کھانا پسند کیوں نہیں آتا؟ وجہ تو بہت سادی سی تھی۔ پتا نہیں میری عقل میں کیوں نہ آسکی۔

اگلے دن دوپہر کے کھانے تک ان کی واپسی ہو گئی۔ خلاف توقع ان کا موڈ خوش گوار لگ رہا تھا۔

"میٹنگ بہت کامیاب رہی۔" انہوں نے شگفتہ لہجے میں اطلاع دی تھی۔ پھر فوراً" سوال کیا۔ "کیا ماموں۔۔۔؟"

"جی۔۔۔ کل آئے تھے۔" میں نے اس کا سوال مکمل ہونے سے پہلے ہی بتایا۔ "دوبارہ آنے کا کہہ گئے ہیں۔"

"چلو۔۔۔ یہ اچھا ہوا۔" اس کا موڈ مزید خوش گوار ہو گیا۔ "کھانے میں کیا ہے؟" میں نے فرماں برداری سے کل والے مینیو سے ٹیبل سجادی۔

جی ہاں۔۔۔ کہہ لیجئے۔۔۔ شوہر کو باسی کھانا کھلاتے ہوئے مجھے شرم نہیں آئی۔۔۔ آپ کو کہنے سے کون منع کر سکتا ہے' جبکہ نصیر احمد کہہ رہے تھے۔

"کل یہ سب ماموں کے لیے بنایا ہو گا؟"

"جی۔۔۔" میں نے تازہ روٹی ان کے آگے رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "اب اتنا کھانا ضائع تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔"

انہوں نے مزید کچھ کہے بغیر کھانا شروع کر دیا۔ اتنے میں عبدالوسع بھی اسکول سے آگیا اور جلدی سے نہا دھو کے ٹیبل کے گرد آبیٹھا۔

"امی! پلاؤ بے حد مزے دار بنا ہے۔" پہلا نوالہ لیتے ہی اس نے کہا۔

میں اس کی تعریف پر قدرے چپ سی ہو گئی۔ جبکہ نصیر نے کوئی تبصرہ کیے بغیر شیرے میں ڈوبی گلاب جامنوں سے بھرے' شیشے کا پیالہ اپنی جانب کھسکایا' ڈھکن اٹھایا۔

"کیا۔۔۔؟ پھر گلاب جامنیں۔" انہوں نے منہ بنا کر ڈھکن واپس رکھا۔ "اماں کتنی اچھی گلاب جامن بناتی تھیں۔ تم بھی اچھی بناتی ہو' مگر وہ بات نہیں۔ کیا اس کے علاوہ کوئی اور میٹھا تم کو بنانا نہیں آتا؟"

"یہ ماموں یعقوب کی پسندیدہ مٹھائی ہے۔" میں نے رسانیت سے کہا۔ انہوں نے جیسے میری بات سنی نہیں۔ وہ عبدالواسع کی جانب متوجہ تھے۔

"اور تم ابھی اس پلاؤ کی' دال' سبزی اور سالن کی تعریف کر رہے تھے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اپنی دادی یعنی میری اماں کے ہاتھ کا بنا کھاتے تو سب بھول جاتے۔ میری اماں سے اچھا کھانا تمہاری امی بنا ہی نہیں سکتیں۔"

"میری امی بھی بہت اچھا کھانا بناتی ہیں۔" میں نے آہستگی سے بیچ میں مداخلت کی۔ "اور مجھے ان کے ہاتھ کا کھانا اچھا بھی لگتا ہے۔ درحقیقت ہر بچے کو اپنی ماں کے ہاتھ کا بنا کھانا اچھا لگتا ہے۔ کیونکہ یہ صرف ان کے ہاتھ کا ذائقہ نہیں ہوتا' بلکہ اس کھانے میں خلوص' محبت اور ممتا بھی شامل ہوتی ہے۔" میں نے ماموں یعقوب کے الفاظ کسی رٹو طوطے کی طرح من و عن دہرا دیے۔ نصیر مجھے دیکھتے رہ گئے تھے۔ شاید انہیں توقع نہیں تھی کہ اتنے سالوں بعد میں ان کی اماں کی تعریفوں کے جواب میں اعتراض کرنے کے بجائے اس کی وجہ بیان کروں گی۔

نصیر احمد کے لیے میں کھانے میں خلوص اور محبت تو شامل کر سکتی تھی۔ مگر لاکھ چاہنے کے باوجود ممتا کہاں سے لاتی؟ وہ تو خالصتاً" عبدالواسع کے لیے تھی۔ لہٰذا نصیر احمد کو گم صم دیکھ کر میں نے جلدی سے عبدالواسع کو مخاطب کیا۔

"اب میرے بیٹے کو میرے ہاتھ کا بنا کھانا پسند ہی آئے گا۔ چاہے وہ جلا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔"

"تو جناب۔۔۔ وہ دن اور آج کا دن۔۔۔"

نصیر احمد اب اپنی اماں کی تعریف میں ایک لفظ بھی نہیں کہتے۔

البتہ عبدالواسع میری تعریف میں کچھ نہ کچھ کہتا ہی رہتا ہے۔ مگر میں نے سوچ لیا ہے کہ میں آہستہ آہستہ اس پر روک ٹوک کر کے اس کی یہ عادت ختم ہی کر دوں گی' تاکہ اس کے نام پہ آنے والی کو میری طرح سے مشکل نہ ہو۔

اور رہ گئی میں' تو میں چپکے چپکے نصیر احمد کی والدہ کے لیے مغفرت کی دعا کرنے کے ساتھ اپنی امی کی صحت اور طویل عمری کی دعا بھی کرتی رہتی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ گلاب جامن ابھی بھی میری اسپیشلٹی ہے۔ مگر میرا نہیں خیال کہ میں اپنی امی سے بہتر بنا سکتی ہوں۔ تاہم آپ بھی کھا کر دیکھیں گول گول' تازہ' خستہ' نرم' براؤن' ایک ہی سائز کی' گاڑھے شیرے میں ڈوبی گلاب جامن۔

☆

راحت وفا

ان کا نام تو "رسول بی بی" تھا۔

مگر سب انہیں "رسولاں بی بی" کہتے تھے۔

وہ میرے ابا کی چچی تھیں۔ بہت دبنگ قسم کی۔ خاندان میں بڑی تھیں۔ ہر کوئی ان سے اپنے معاملے میں مشورہ لیتا تھا۔ ان کے میاں چاولوں کی آڑھت کا کام کرتے تھے۔ گھر میں خوشحالی تھی۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

مجھے وہ بہت اچھی لگتی تھیں۔ سرخ و سفید رنگت، سیاہ بال، پتلا دبلا جسم، آواز میں رعب، صاف ستھرے کپڑے اور آنکھوں میں ڈھیر سارا سرمہ لگایا کرتی تھیں۔

ہم ایک قصبے میں رہا کرتے تھے۔ ان کا گھر ہمارے اسکول کے راستے میں تھا۔ مجھے یاد ہے میں اپنی باجی کا ہاتھ پکڑے اسکول جایا کرتی تھی۔ راستے میں ان کے گھر کے دروازے کے آگے سے گزرتے تھے۔ دروازہ کھلا ہوتا تھا۔ صحن میں دھریک کا پیڑ تھا۔ وہ اس کی چھاؤں میں بیٹھی کسی نہ کسی کام مشغول ہوتی تھیں۔

باجی گھر کے اندر چلی جاتیں۔ انہیں سلام کرتیں۔ وہ امی جان کا حال پوچھتیں۔ ان کی بڑی بہو باورچی خانے میں ناشتا بنا رہی ہوتی تھیں۔ وہ پوچھتیں۔

"ناشتا کرو گی؟" باجی انکار کر دیتیں۔ ان کی بہو ان کے سامنے چائے کی پیالی اور چنگیر میں دیسی گھی کا پراٹھا رکھتی۔ پراٹھے کے اوپر مسالے سے بھرا آم کا اچار ہوتا۔ میرے منہ میں پانی آجاتا۔ میرا بہت دل کرتا کہ آگے بڑھ کر چائے پراٹھا اور آم کا اچار کھاؤں مگر باجی کے ڈر سے چپ رہتی۔ ویسے کبھی کبھار وہ آدھا پراٹھا میری طرف بڑھا دیتیں تو میں باجی کی گھوریوں کو نظر انداز کر کے کھانے لگتی۔ اس آم کے اچار کا ذائقہ اس قدر لذیذ تھا کہ آج اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی مجھے بھول نہیں سکا۔

گرمیوں میں اسکول سے واپسی پر باجی ضرور ان کے گھر رکتی تھیں۔ وہ گھڑے کا پانی استعمال کرتی تھیں حالانکہ اس وقت تک ان کے گھر میں فریج آچکا تھا۔ گرمی سے ہمارا برا حال ہو رہا ہوتا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اپنی بہو سے کہتی تھیں۔

"بچیوں کو پانی پلا گرمی میں برا حال ہو گیا ہے۔"

پیالے میں گھڑے کا ٹھنڈا پانی پی کر اور تھوڑی دیر دھریک کی چھاؤں میں بیٹھ کر ہمارے اوسان بحال ہوتے، پھر ہم اپنے گھر آجاتے۔ یہ الگ بات کہ روزانہ دیر سے گھر پہنچنے پر امی سے ڈانٹ پڑتی تھی۔

ان کی بڑی بہو ان کے بڑے بھائی کی بیٹی تھی اور ان کی پسندیدہ بہو تھی۔ وہ ان کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ دوسری بہو ان کے شوہر کی بھانجی تھی۔ اس لیے ان کی نور نظر نہیں تھی۔ اس نے بھی شادی کے چند دنوں بعد ہی اپنے شوہر کی مٹھی میں کر لیا اور الگ رہنے کا مطالبہ کر دیا۔ ان کے گھر طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ان سے ٹکر لینے کا حوصلہ کون کرتا۔ بیٹا بیوی کو الگ رکھے، یہ ان کے اصولوں کے خلاف تھا۔ بیٹا بھی زیادہ دیر مزاحمت نہ کر سکا۔ اور روتی دھوتی بیوی ساتھ ہی رہنے پر مجبور ہو گئی۔ دوسری صورت میں ماں نے بیٹے کو طلاق دینے کا حکم دے دیا تھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ بیٹی اور بہو کے معاملات ان کی مرضی کے مطابق طے ہوتے تھے۔ یعنی بہو الگ گھر نہیں لے سکتی تھی اور بیٹی اپنے شوہر کو لے کر ماں کے ساتھ والا گھر کرائے پر لے کر رہ رہی تھی۔ کیونکہ اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ ماں کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ داماد بے زبان خادم تھا، سو ساس کا بھی ہر حکم ماننا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ سگی ماں کو چھوڑ کر ساس کے سائے میں آبیٹھا۔

بیٹے، بہوئیں اور شوہر... ان کے آگے دم مارنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔

☆ ☆ ☆

انٹر کرتے ہی باجی کی شادی ہو گئی۔ اب میں اکیلی اسکول جایا کرتی تھی، اور آتے جاتے انہیں سلام بھی کرتی تھی۔ کبھی کبھار ناشتا اور واپسی پر ٹھنڈا پانی بھی ضرور پیتی تھی۔ اب تو ان کے دونوں بیٹوں کے بچے بھی بڑے ہو رہے تھے۔ بچوں پر بھی ان کا ویسا ہی رعب تھا۔

چھوٹا بیٹا لاڈلا تھا اور بہت ضدی بھی۔ نہ جانے کیسے اس نے اپنے کسی دور پرے کے چچا کی بیٹی کو دیکھ لیا اور ضد پکڑ لی کہ اسی سے شادی کرے گا۔ وہ لوگ

بہت غریب تھے۔ سات بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ باپ تانگہ چلاتا تھا۔

اب ماں بیٹے میں ٹھن گئی۔ ماں اپنے معیار سے کم پر راضی نہ تھی کہ اس کی عزت کا سوال تھا۔ بیٹا اسی لڑکی سے شادی پر اصرار کر رہا تھا کہ یہ اس کی محبت کا سوال تھا۔

اس نے بھوک ہڑتال کرلی۔ گھر چھوڑنے کی دھمکی دے دی۔ سب نے رسولاں بی بی کو سمجھایا کہ جوان خون ہے کچھ کر کرا نہ لے۔ بیٹوں اور شوہر نے بھی سمجھایا۔ آخر مجبوراً' بجھے دل سے غریب لڑکی کے گھر گئیں۔ ایسے رشتہ مانگا جیسے احسان کر رہی ہوں۔ وہ لوگ تو خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ بہرحال شادی ہوگئی۔ لڑکی بے حد خوبصورت' معصوم اور کم عمر تھی۔ شاید اس کا حسن ہی ان کے بیٹے ندیم کا حوصلہ بڑھ گیا تھا کہ وہ ماں کے سامنے ڈٹ گیا۔

☆ ☆ ☆

میں میٹرک میں تھی' جب ندیم کی شادی ہوئی۔ بہت سی باتیں جو مجھے سمجھ میں نہیں آئی تھیں' اب پتا چل گئیں۔ اور چچی رسولاں کا (ابا کی طرح ہم بچے بھی انہیں یہی کہتے تھے) خوبصورت بت میرے دل میں ٹوٹنے لگا۔

اب مجھے پتا چلا کہ وہ ایک سخت گیر اور جابر قسم کی ساس تھیں۔ ہر معاملے میں اپنے اصول' اپنی مرضی کو مقدم جانتی تھیں۔ شوہر بھی ان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ یہاں تک کہ پوتے' پوتیوں کے معاملے میں بھی وہ بہت سخت تھیں۔

مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ ایک طویل وظیفہ کرتی تھیں۔ ان کے حکم کے مطابق کھانا مغرب تک تیار ہوجاتا تھا مگر بیٹے بہوئیں یا بچوں کی جرات نہیں تھی کہ وہ خود کھانا نکال کر کھا سکیں۔ چاہے بچے بھوک سے بلک رہے ہوں۔ ان کی مائیں بے بسی سے انہیں بہلاتی رہتیں۔

نماز اور وظیفے سے فارغ ہو کر وہ خود کھانا نکالتیں اور سب کھاتے۔ ان کی بہوئیں ان کی پسند سے کھاتی' پہنتی اور پہنتی تھیں۔ ملنا ملانا ان کی مرضی سے ہوتا تھا۔ مگر یہ سب اصول ان کی بیٹی پر لاگو نہیں ہوتے تھے۔ لاڈلی اور اکلوتی بیٹی کو اپنے قریب ہی لے آئی تھیں۔ داماد کو اپنا فرماں بردار بنا چکی تھیں۔ بیٹی کا بھی بھاوجوں پر بہت رعب تھا۔ وہ بھی ماں کے ساتھ مل کر ان کا جینا حرام کیے رکھتی تھی۔

چھوٹے بچوں کو فیڈر پینے کی اجازت نہ تھی۔ بہوؤں پر لازم تھا کہ وہ پوری مدت تک دودھ پلائیں۔ بازاری چیزیں بچوں کے لیے ممنوع تھیں۔ غرضیکہ ان کا گھر ایک جیل خانہ تھا جس کی حاکم وہ تھیں اور ان کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔

☆ ☆ ☆

ندیم کی شادی حنا سے ہوگئی۔ حنا معصوم سی' کم عمر لڑکی تھی۔ غریب ہونے کے باوجود وہ سب بہنیں ماں باپ کی لاڈلی تھیں۔ اس کے والدین حتی الامکان اپنی بچیوں کی خواہشات پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حنا کی ماں بھی دو چار گھروں میں صفائی کا کام کرتی تھی۔ حنا گھر میں بڑی تھی۔ بے حد معمولی سا جہیز لائی تھی' جو کہ چچی رسولاں نے بالکل پسند نہیں کیا تھا۔

شادی میں ہم سب بھی شریک تھے۔ مجھے حنا بہت پسند آئی تھی۔ سرخ رنگ کے سوٹ میں وہ دمک رہی تھی۔ دلہن بیاہ کر آئی تو اسے ندیم کے کمرے میں بٹھا دیا گیا جو کہ بہت خوب صورتی سے ندیم کے دوستوں نے سجایا تھا۔ میں حنا کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ امی نے مجھے آواز دی کہ ندیم اپنے کمرے میں آرہا ہے' تم باہر آجاؤ۔ میں کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں آئی تو ندیم ماں کے قریب کھڑا تھا اور وہ کہہ رہی تھی۔

"جن لڑکیوں کی مائیں لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہیں' ان کی بیٹیاں پیچھے اکیلی ہوتی ہیں اور ماؤں کو خبر نہیں ہوتی کہ وہ کیا کرتی پھرتی ہیں۔ دیکھ لینا! پیچھے چھوڑ کر تو نہیں آئی کوئی۔"

ایک ماں کے منہ سے ایسی بات سن کر میں تو شرم کے مارے کانپ اٹھی تھی۔ ندیم کا چہرہ بھی سرخ ہوگیا تھا۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اور پھر وہی ہوا جو وہ چاہتی تھیں۔ دوسرے دن ہی میں نے حنا کے چہرے پر تھپڑوں کے نشان دیکھے۔ میرے پوچھنے پر روتے ہوئے کہنے لگی۔

"ندیم عجیب عجیب سوال پوچھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا تو غصے سے مجھے تھپڑ مارنے لگا۔"

مجھے بہت دکھ ہوا۔ مگر یہ تو ابتدا تھی پھر اس کے بعد حنا کے لیے زندگی آزمائش بن گئی۔

ندیم نے ماں کے اصولوں کے خلاف ڈٹ کر شادی تو کرلی تھی مگر بیوی کا دفاع نہ کرسکا۔

☆ ☆ ☆

میں نے میٹرک کرلیا۔ قصبے کا واحد ہائی اسکول ہائر سیکنڈری اسکول میں تبدیل ہوچکا تھا۔ سو میں نے ایف اے میں داخلہ لے لیا۔ اب میں روزانہ تو ان کے گھر نہیں جاتی تھی۔ البتہ ہفتے میں ایک بار ضرور جاتی اور وہ وہیں دھریک کے سائے میں بیٹھی حنا پر حکم چلاتی نظر آتی تھیں۔

وہ خوب صورت سی لڑکی بجھ رہی تھی۔ گھر میں سارا کام اس کے ذمے لگ چکا تھا۔ ساس کی دیکھا دیکھی دوسری بہوئیں بھی اسی پر حکم چلانے لگی تھیں۔ روزانہ ندیم کو اس کی کوئی نہ کوئی شکایت لگادی جاتی جس کی وجہ سے وہ اسے مارنے پیٹنے لگتا۔

شادی کی پہلی رات سے مار کھانے کی جو ابتدا ہوئی تھی' وہ جاری تھی۔ سال بھر بعد بیٹا ہوگیا۔ ماں باپ بہت کم آتے تھے۔ حنا کو بھی جانے کی اجازت نہیں تھی کہ غریبوں سے ملنا ان کی شان کے خلاف تھا۔ بیٹے کی پیدائش پر ماں باپ آئے۔ ہاتھ جوڑ کر چند دن کے لیے ساتھ لے جانے کی اجازت مانگی۔ پتا نہیں کیسے ترس آگیا اور اسے ایک ہفتے کے لیے ماں کے ساتھ جانے کی اجازت مل گئی۔

بچے کے ساتھ دن رات کام کی زیادتی' اور شوہر کی مارپیٹ۔۔۔ وہ دن بدن کمزور ہوتی جارہی تھی۔

ایک دن اسکول سے واپسی پر میں ان کے گھر گئی تو چچی رسولاں ہمسائے میں کہیں گئی ہوئی تھیں۔ حنا بچے کو آلو کے ساتھ روٹی کھلا رہی تھی۔ چھوٹا سا بچہ بڑی مشکل سے کھا پا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"آپ اسے دودھ میں بسکٹ ڈال کر کیوں نہیں دیتیں۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔ اس کی آنکھوں کی نمی میرا دل دکھا گئی۔

"بھابھی! آپ ندیم بھائی سے احتجاج کیوں نہیں کرتیں۔" میں نے ملول گرفتہ ہو کر کہا۔

"صدف میری بہن! زندگی میں سب کچھ نہیں ملتا۔ تمہیں بتاؤں میں اپنے گھر میں تتلی کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ اگرچہ ہم غریب تھے۔ ابا کی آمدنی اور اماں کی اجرت جمع کر کے بھی تنگی سے وقت گزرتا تھا' پھر بھی ہم خوش تھے۔ مجھے چائے بے حد پسند تھی۔ صبح ناشتے سے پہلے میں آدھا کپ چائے ضرور پیتی تھی۔ اماں ٹوکتیں تو ابا کہتے۔

"اس کی چھوٹی سی خوشی خراب نہ کیا کرو۔ اس نے پردیسی ہوجانا ہے۔" یہاں آکر پتا چلا کہ ابا ٹھیک کہتے تھے۔ پتا نہیں کیسے اماں کو خبر ہوگئی کہ مجھے چائے پسند ہے۔ بس اسی دن سے مجھ پر پابندی ہے۔ مجھے مسالے والے نمکین چاول بہت اچھے لگتے تھے۔ یہاں سفید ابلے چاولوں کے علاوہ کسی بھی قسم کے چاول پکانا منع ہے۔ ترستے ترستے مجھے چائے اور چاول دونوں سے نفرت سی ہوگئی ہے۔ اپنے گھر میں سبزیوں والے' گوشت والے' چنے والے چاول پکایا کرتی تھی۔ دہی کے ساتھ سب گھر والے شوق سے کھاتے تھے۔ ہم غریب تھے' تھوڑی چیز پکاتے تھے مگر ہمارے ابا نے ہمیں کبھی ترسایا نہیں۔ جب ندیم کا رشتہ آیا تو ابا کہنے لگے۔

"میری بیٹی بڑی قسمت والی ہے۔ اتنے اچھے اور کھاتے پیتے گھرانے سے رشتہ آیا ہے۔ جیسا اس کا مزاج ہے' اپنے گھر میں عیش کرے گی اپنی ساری خواہشیں پوری کرے گی۔"

یہ کہہ کر حنا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ میرے بھی

آنسو نکل آئے۔

"بھوک برداشت کر کر کے میری انتڑیاں خشک ہوگئی ہیں۔ جب شدید بھوک میں کھانا نہ ملے تو بھوک مرجاتی ہے۔ بعد میں جتنی چاہے نعمتیں سامنے پڑی ہوں' دل نہیں چاہتا۔ اب تو سب ذائقے بھول گئے ہیں۔ ہم سفر مارنے کے بعد جتنا بھی پیار کرے' دلاسے دے' معذرت کرے' دل کو نہیں بھاتا۔ ماں کے چڑھانے پر نہ چاہتے ہوئے بھی ندیم مجھے مارتا ہے اور اب تو مجھے تکلیف بھی نہیں ہوتی۔ درد کا جیسے احساس ہی ختم ہوگیا ہے۔"

حنا روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ پتا نہیں کتنے عرصے کا لاوا اس کی آنکھوں اور لبوں سے بہہ رہا تھا۔

اچانک چچی گھر میں داخل ہوئیں۔ حنا پھرتی سے اٹھی اور منہ ہاتھ دھو کر ان کے لیے پانی کا گلاس لے آئی۔ مجھے دیکھ کر چچی کے ماتھے پر ناگواری سے بل پڑ گئے۔ انہیں اپنی بہوؤں کے پاس کسی کا بیٹھنا سخت ناپسند تھا۔ میں خفیف سی ہو کر گھر سے نکل آئی۔

دن گزرتے گئے۔ ایف اے کے بعد میری شادی طے ہوگئی۔ جس دن میری شادی تھی' اس دن حنا نے دوسرے بیٹے کو جنم دیا۔ بڑا بیٹا ابھی ڈیڑھ سال کا ہی تھا۔

☼ ☼ ☼
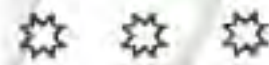
شادی کے بعد نیا گھر' نیا ماحول' نئے لوگ۔ مجھے حنا کے بارے میں پوچھنے کی بھی فرصت نہ ملی۔ خدا کا شکر ہے میرے سسرال والے بہت اچھے تھے۔ اور راحیل ایک سمجھ دار بیٹے اور محبت کرنے والے شوہر ثابت ہوئے۔ انہوں نے ماں کی عزت واحترام کو بھی ملحوظ رکھا اور میری عزت واحترام میں بھی کمی نہ کی۔ میں جو حنا کو دیکھ کر بہت خوف زدہ تھی' پرسکون ہوگئی۔

جب راحیل نے مجھے مان دیا تو میں نے بھی انہیں کبھی شرمندہ نہیں ہونے دیا۔ ان کی ہر بات میرے لیے اہم تھی۔ ان کی ماں' بہن بھائی سب میرے لیے قابل احترام تھے۔

میں بہت کم میکے جاتی تھی۔ بہت سے سال گزر گئے' میرے آنگن میں تین پھول کھلے۔ ان کی مصروفیت میں وقت کا پتا ہی نہیں چلتا مگر جب بھی میکے جاتی' امی سے حنا کے بارے میں ضرور پوچھتی۔ امی کی زبانی ہی پتا چلا کہ ان کے گھر کا ماحول ویسا ہی ہے۔ حنا کے پانچ بیٹے ہوگئے ہیں' پھر بھی اس کا گھر میں کوئی مقام نہیں بنا ہے۔ پھر میں نے سنا ندیم دبئی چلا گیا ہے۔

چچی کے میاں کی وفات کی خبر آئی تو تھوڑی دیر کے لیے جا سکی کہ دونوں بچے بیمار تھے۔ منہ دیکھ کر آگئی۔ پھر تو بہت سے دن گزر گئے۔

ابا کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ امی جان کا فون آیا تو بے اختیار راحیل کے سامنے میں رو پڑی۔ "ہم بیٹیاں کتنی مجبور ہوتی ہیں۔ بیمار والدین کی خدمت بھی نہیں کر سکتیں' حالانکہ مجھ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ بس گھر کے بکھیڑے' بچوں کے اسکول' سسرال کی ذمہ داریاں یہ سب میکے کی یاد کو بھلا رہی تھیں۔ راحیل نے کہا۔

"میں بچے دیکھ لوں گا۔ چھوٹے کو ساتھ لے جاؤ اور کچھ دن فراغت سے ابا سے مل آؤ۔"

میں نے بھی سب مصروفیت کو پس پشت ڈالا اور چھوٹے کو ساتھ لے کر امی کے گھر آگئی۔ ابا بہت خوش ہوئے۔ کتنے سالوں بعد میں میکے میں رات ٹھہرنے آئی تھی' ورنہ "عموماً" صبح جاتی اور رات کو واپس آجاتی۔ چھوٹا بچہ بھائیوں کے بچوں کے ساتھ مگن تھا۔ میری بھابیاں بھی اچھی تھیں۔ سو ماں باپ کی طرف سے یہ سکون تھا۔

"امی جی! چچی رسولاں کا کیا حال ہے اور حنا کیسی ہے۔" میں نے امی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ ندیم باہر چلا گیا ہے۔ سو مار پیٹ سے تو حنا کی جان چھوٹ گئی ہے۔ اب بچے بڑے ہو رہے ہیں اور ماں کے طرف دار ہیں۔ چچی بیمار رہتی ہیں' خاموش ہو کر رہ گئی ہیں۔ ندیم کے باہر جاتے ہی باقی بیٹے بیویوں کو لے کر الگ ہوگئے۔ اس بات کا غم بھی چچی کو کھا رہا ہے۔ بہت کمزور ہوگئی ہیں۔ چپ چاپ

لیٹی رہتی ہیں۔ اب گھر کا سارا انتظام حنا کے ہاتھ میں ہے۔ ندیم پیسے بھی اسی کے نام بھیجتا ہے۔"

میں تصور میں چچی کی حکومت ختم ہوتے دیکھ رہی تھی پھر دل میں کل جانے کا ارادہ کرلیا۔

☼ ☼ ☼

تقریباً" تین سال کے بعد میں نے ان کی جانی پہچانی گلیوں میں قدم رکھا تو عجیب سی خوشی ہونے لگی۔ میکے کی تو ہوا بھی خوشبودار لگتی ہے۔ کتنے سال ان گلیوں سے گزر کر اسکول جاتی رہی تھی۔ کتنا حسین زمانہ تھا۔

گھر کا دروازہ بند تھا۔ یہ دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا تھا۔ میں نے حیران ہو کر دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے ایک کرخت آواز سنائی دی۔ میں نے دوبارہ دستک دی تو جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ میرے سامنے حنا کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر حیرانی اور خوشی سے لپٹ گئی۔ میں نے دیکھا وہ صحت مند اور خوش لگ رہی تھی۔ کپڑے بھی اچھے پہنے ہوئے تھے۔ آگے بڑھی تو دھریک کے نیچے چارپائی پر چچی لیٹی نظر آئیں۔ بے حد کمزور گندے سے کپڑے۔

میں نے آواز دی تو اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ مجھے پہچان کر گلے لگایا اور رونے لگیں۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ میں نے حنا کی طرف دیکھا۔ وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"سارا دن نحوست پھیلائے رکھتی ہے۔"

میں ہکابکا رہ گئی۔ یہ لہجہ اور الفاظ چچی کے لیے تھے؟

چچی اور رونے لگیں۔ میں نے چپ کرایا۔ وہ میرے میاں اور بچوں کا حال پوچھنے لگیں۔ حنا کا بیٹا میرے لیے کولڈ ڈرنک لے کر آیا تو چچی للچائی نظروں سے کولڈ ڈرنک کی طرف دیکھنے لگیں۔ میں نے جلدی سے بوتل انہیں پکڑادی۔ حنا اس وقت کمرے میں کسی کام سے گئی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا وہ ندیدوں کی طرح جلدی جلدی بوتل پینے لگیں۔ کچھ منہ سے باہر گر رہی تھی۔ میں حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

حنا کی آواز آئی تو انہوں نے جلدی سے بوتل میرے ہاتھ میں پکڑا کر دوپٹے سے منہ صاف کرلیا۔

"صدف! اندر آجاؤ۔" حنا نے مجھے آواز دی۔ میں چچی کو دیکھتے ہوئے حنا کے کمرے کی طرف بڑھی۔

"بیٹی!" وہ میرا ہاتھ تھام کر لجاجت سے بولیں۔

"حنا سے کہہ دو۔ مجھے روٹی دے دے۔ بڑی بھوک لگی ہے۔ رات کو بھی مجھے آدھی روٹی دی تھی۔" میں لرز اٹھی۔ حنا تیر کی طرح باہر آئی۔

"لگاؤ میری شکایتیں۔ تمہاری مکاریاں بھی ختم نہیں ہوں گی۔" پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

"اس کا تو پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ کھا کھا کر معدہ خراب کرلیتی ہے۔ کون بار بار باتھ روم لے کر جائے۔ باقی سب تو جان چھڑا گئے۔ یہ مصیبت میرے گلے ڈال گئے۔"

میں اس کم گو اور سہمی ہوئی حنا کو دیکھنے لگی جو چچی کے سامنے اونچی آواز میں بول نہیں سکتی تھی۔

اب حنا گرج رہی تھی۔ چچی رو رہی تھیں۔

"میں نے ہوٹل نہیں کھول رکھا۔ اپنی بیٹی سے کہو، تمہیں ادھر سے لے جائے۔ سارا کچھ کھا گئیں ہمارا۔ ہمارا حق مار کر بیٹی کو کھلاتی رہی ہو۔ اب جاؤ اسی کے پاس۔"

حنا کا لہجہ زہر سے بھی کڑوا تھا۔ میں حق دق کھڑی تھی۔ چچی نے اپنے سر سے چادر ہٹا کر دکھایا تو دکھ کی ایک لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ لڑکوں کی طرح چھوٹے چھوٹے بے ڈھنگے طریقے سے کٹے ہوئے بال۔

حنا نے ان کے بال کاٹ دیے تھے کہ اس سے سنبھلتے نہیں ہیں۔ میں ابھی اسی لمحے کے صدمے میں تھی کہ حنا ہاتھ میں آدھی روٹی کے اوپر ایک بڑا سا آلو رکھے باہر آئی۔ "لو کھاؤ مرو۔" حنا میرے لیے چائے لے آئی۔ میں مرے مرے قدموں سے حنا کے کمرے میں چلی گئی۔

"بھابھی! چچی کو چائے دے دو۔" میں نے التجا کی۔

"نہیں صدف!" وہ حتمی لہجے میں بولی۔

"میں نے اسے اپنے گھر رکھا ہے۔ اسے کھانے کو دیتی ہوں۔ یہ ہی بہت ہے۔ بیٹی تو ماں کے بیمار ہوتے ہی سسرال سدھار گئی۔ سب چھوڑ گئے۔ یہ سیاپا میرے گلے ڈال گئے۔"

مجھے حنا کے چہرے پر چچی کا چہرہ لگ رہا تھا۔ میرے ذہن میں پچھلے سال گھوم گئے۔ جب چچی حنا کی جگہ پر تھیں۔ حکمران ۔۔۔ بہت بلندی پر بیٹھی ہوئیں۔ دوسروں کو جوتے کی نوک پر رکھنے والیں اور آج حنا اسی مقام پر کھڑی تھی۔ چہرے بدل گئے تھے۔ اصول اور معاملات وہی تھے۔ مجھ سے چائے پینا دوبھر ہوگیا۔

"بھابھی! آپ معاف نہیں کرسکتیں انہیں۔" میں نے التجائیہ انداز میں کہا۔

"نہیں صدف! معاف کرنا اعلا ظرفی ہے اور میں بہت کم ظرف ہوں۔ گزرے وقت کی تلخی مجھے بھولنے نہیں دیتی کچھ بھی۔ میرے اتنے سنہری سال کھا گئی یہ عورت۔ کہاں سے لاؤں وہ دن، وہ خواہشیں۔ دل خالی ہوچکا ہے۔ جسم کے زخم تو بھر چکے ہیں۔ روح زخمی ہے ابھی۔۔۔ تار تار ہے۔" اس کا لہجہ نم ہوگیا تھا۔

بہت دکھ ہوا تھا مجھے۔ بعض اوقات ہم دوسروں کو خود ہی ظالم بنا دیتے ہیں۔ چچی نے معصوم اور سہمی ہوئی لڑکی کو ظالم بنا دیا تھا۔ جو انہوں نے بویا تھا اب وہی کاٹ رہی تھیں۔ پتا نہیں طاقت اور حکمرانی کے نشے میں چور ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ یہ طاقت اور حکمرانی سدا رہنے والی نہیں ہے۔ آج ہمارے پاس تو کل کسی اور کے پاس۔

حنا کو وقت نے حکمرانی دے دی تھی تو اسے چاہیے تھا کہ اس کو اپنے صبر کا انعام سمجھ کر چچی کو معاف کردیتی۔ دوہرا اجر پاتی۔۔۔ مگر وہ واقعی اپنے ظرف کو بلند نہ کرپائی۔ وہ مکافات عمل کو بھول گئی۔

"بھابھی! بچپن سے میں چچی رسولاں کو دیکھتی آرہی ہوں۔ ان کے کروفر کو۔۔۔ ان کے غصے کو۔۔۔ ان کے رعب کو اور۔۔۔ ان کے ظلم کو۔۔۔ بھابھی! میں جانتی ہوں انہوں نے آپ پر بے حد ظلم کیے ہیں مگر اب ان کو قدرت کی طرف سے سزا مل گئی ہے۔ ان کے بچے انہیں چھوڑ گئے ہیں۔ وہ بوڑھی ہوگئی ہیں۔ ان کے شوہر مرگئے ہیں۔ وقت کی باگ اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ انہیں معاف کردیں ورنہ بھابھی۔ سوچیے! یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔ پہلے چچی۔۔۔ پھر آپ۔۔۔ پھر آپ کی بہوویں۔۔۔"

اس بات پر میں نے دیکھا کہ حنا چونک کر اپنے بیٹوں کو دیکھنے لگی ہے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

"وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا اور ہمیشہ ایک کا نہیں رہتا۔ سو جب ہمیں وقت پر کچھ اختیار ملے تو ہمیں کم ظرفی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ درگزر کردینا چاہیے۔ وہ غلطی پر تھیں مگر وہ ندیم کی ماں ہیں۔ ماں جتنی بھی بری ہو۔ اولاد کو اپنے فرض سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ ماں کے نافرمان اور ماں کو اذیت دینے والے کو آخرت میں تو سزا ملتی ہی ہے مگر دنیا میں بھی ذلت ہوتی ہے۔ آپ کی دنیا و آخرت دونوں بچ سکتی ہیں۔ بھابھی! ورنہ۔۔۔ ورنہ کچھ سالوں بعد میں پھر آپ کے گھر آؤں گی تو دھریک کے اس پیڑ تلے چچی کی جگہ ہوسکتا ہے آپ۔۔۔"

میری آواز بھرا گئی۔ میں اپنی بات مکمل نہ کرپائی۔

حنا پتھرائے ہوئے چہرے کے ساتھ چچی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بمشکل سادی روٹی اور خشک آلو کھانے کی کوشش کررہی تھیں۔ حنا کی آنکھیں بھرنے لگیں۔ اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور تیزی سے چچی کی جانب بڑھی۔

اس نے چچی کے پاس بیٹھ کر ان کے ہاتھ تھام لیے اور ان ہی ہاتھوں پر سر رکھ کر رو دی۔

چچی نے ناسمجھی سے اسے دیکھا، پھر ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ میں بھیگی آنکھوں سے ہولے سے مسکرا دی۔ چچی نے تشکر بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور آگے بڑھ کر حنا کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔

میں مطمئن دل کے ساتھ دھریک کے پیڑ کو دیکھتے ہوئے چچی رسولاں کی دہلیز پار کرگئی۔

☼

سائرہ چوہدری

وہ بار بار فائلوں پر سے سر اٹھا کر سامنے لگی ہوئی دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھتا۔ ابھی پانچ بجنے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ اسے گھڑی کی سوئیاں کچھوے کی سی رفتار سے چلتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"ان میں چستی صرف صبح کے وقت ہی ہوتی ہے۔" اس نے دل میں سوچا۔

دفتر آتے وقت وہ ہزار کوشش کے باوجود اکثر لیٹ ہو جاتا تھا۔ اگر گھر سے کبھی وقت سے پہلے نکل آتا تو سڑک پر رکشہ یا وین کے انتظار میں دیر ہو جاتی۔

ناولٹ

گاڑی اس کے پاس تھی نہیں۔ کچھ پیسے جمع کر کے ایک موٹر سائیکل لی تھی۔ وہ بھی ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر چل چل کر اس طرح ہو گئی تھی کہ کچھ دنوں بعد ہی اس کو کسی ورکشاپ لے جانا پڑتا۔ آج کل بھی وہ ورکشاپ پر پڑی تھی۔ اسی لیے اس کو دفتر آنے جانے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے گھڑی نے پانچ بجائے اور وہ فائلیں سمیٹ کر گھر کے لیے نکلا۔

جون کی تپتی شام' اوپر سے سڑک پر کھڑے ہو کر وین کا انتظار' یہ سب اس کے لیے کافی تکلیف دہ تھا۔ اس کی شرٹ پسینے سے بھیگ چکی تھی۔ چہرے پر بھی پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ آدھا گھنٹہ انتظار کے بعد وین آ گئی۔ وین پہلے سے ہی بھری ہوئی تھی۔ مگر وہ سڑک پر مزید کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ جیسے بھی جگہ ملی وہ سوار ہو گیا۔ گھر پہنچتے پہنچتے اس کا برا حال ہو گیا۔

گھر میں قدم رکھتے ہی کوئی چیز اس کے قدموں سے ٹکرائی۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ ذرا سنبھل کر دیکھا تو وہ پانی والی بالٹی تھی جو شاید ہوا سے لڑھک کر دروازے تک آ گئی تھی۔ تھوڑا سا آگے چلا تو صحن میں جھاڑو' چارپائی' گندے کپڑے ہر چیز بکھری پڑی تھی۔ صحن میں جگہ جگہ گند پڑا ہوا تھا۔ لگتا تھا آج گھر کی صفائی نہیں ہوئی تھیں۔

اندر کا بھی وہی حال تھا جو باہر کا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر صبح کے ناشتے والے برتن ویسے کے ویسے پڑے تھے۔ صوفے کے کشن بے ترتیب پڑے تھے۔ ہر چیز وہ صبح

جس حالت میں چھوڑ کر گیا تھا۔ ویسے کی ویسی ہی پڑی تھی۔ اسے صورت حال کا اندازہ ہو گیا تھا۔

پیاس سے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی۔ گلاس لینے کے لیے وہ کچن کی طرف بڑھا۔

کچن کا حال بھی ابتر تھا۔ سلیب پر انڈوں کے چھلکے پڑے تھے۔ توا ابھی تک چولہے پر پڑا تھا۔ کیتلی میں صبح والی چائے پڑی ہوئی تھی۔ سنک میں گندے برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس نے صاف گلاس کے لیے ادھر ادھر نظریں گھمائیں۔ اسے گلاس اسٹینڈ پر صرف ایک گلاس نظر آیا۔

گلاس لے کر وہ واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے غٹاغٹ ٹھنڈے پانی کے دو گلاس حلق میں اتارے۔ پیاس کی شدت کچھ کم ہوئی۔

گھر میں مکمل سناٹا تھا۔ وہ کپڑے تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے ہاتھ سے دھکا دے کر دروازہ کھولنا چاہا۔ مگر دروازہ اندر سے لاک تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ مگر لاحاصل۔ نہ دروازہ کھلا' نہ کسی قسم کی کوئی آہٹ سنائی دی' جیسے کوئی اندر ہو ہی نہ۔

اس نے اسٹور سے غیر استری شدہ سوٹ نکالا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے شاور نے اس کو کافی تازگی بخشی۔ نہا کر نکلا تو دروازہ ابھی تک بند تھا۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔ جب بھی اماں اور مائرہ کی لڑائی ہوتی' وہ اسی طرح سب کام چھوڑ چھاڑ کمرے میں بند ہو جاتی اور اماں محلے میں سارا دن کسی کے پاس بیٹھی رہتیں۔

نہ گھر کی صفائی ہوتی' نہ کھانا پکتا۔ ساس' بہو کے جھگڑے میں سزا بے چارے عقیل کو ملتی۔ وہ دفتر سے تھکا ہارا لوٹتا تو نہ کوئی کھانے کا پوچھتا' نہ پانی کا۔ اوپر سے اماں اور بیوی دونوں کی باتیں سننی پڑتیں۔ ایک کی سنتا تو دوسری ناراض ہو جاتی۔ ایک دو دن اسی طرح گزر جاتے۔ تب کہیں جا کے بمشکل ساس' بہو کی صلح ہوتی۔ مگر کچھ دنوں بعد پھر کوئی نہ کوئی ایسا مسئلہ نکل آتا' جس پر دونوں کی تکرار ہو جاتی۔

آج بھی اماں شاید کہیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ جب وہ آیا تو بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔

عقیل کو زوروں کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ صبح بھی جلدی میں اس نے صرف چائے پی تھی۔ ناشتا نہیں کیا تھا۔ دفتر سے واپسی پر سوچ رہا تھا کہ پہلے جا کر کسی ٹھنڈے شربت سے پیاس بجھاؤں گا' پھر نہا کر گرم گرم کھانا تناول فرماؤں گا۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا تھا۔

اس نے فریج کھول کر کھانے کے لیے کچھ تلاش کیا۔ کل رات کا بچا ہوا تھوڑا سا سالن پڑا تھا' مگر روٹی نہیں تھی۔ آخر تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے ڈبل روٹی کے دو سلائس مل گئے۔ جو شاید دو دن پہلے کے تھے۔ مگر اس وقت یہ سب کچھ بھی اس کو بہت بڑی نعمت لگ رہا تھا۔ اس نے صبر شکر کے ساتھ کھا کر ایک گلاس پانی پیا۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں پڑے صوفے پر ہی لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی نیند اس پر غالب آ گئی۔ وہ سو گیا۔

کسی آہٹ پر آنکھ کھلی تو اس کی نظر گھڑی پر پڑی۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے سوتا رہا تھا۔ مائرہ کے کمرے کا دروازہ ابھی تک بند تھا۔ اماں جانے کہاں سے آ رہی تھیں۔ ان ہی کے دروازہ کھولنے کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔

"آ گئے بیٹا؟" اماں نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

اماں اس سے نظریں چرا رہی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ دفتر سے آ کر بے آرام ہوا تھا۔ یہ سب تو اب آئے دن کا معمول تھا۔ اگر مائرہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اندر بند ہو کر بیٹھ جاتی تو اماں بھی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتیں۔ بقول ان کے اب ان کی بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم کہاں کہ وہ یہ کام کریں۔ ان کے تو اب اللہ اللہ کرنے کے دن ہیں۔

اماں اب اتنی بوڑھی بھی نہیں تھیں۔ وہ کافی صحت مند تھیں۔ کوئی بڑھاپے والی بیماری ابھی ان کو نہ لگی تھی۔ چھوٹے موٹے کام وہ باآسانی کر سکتی تھیں۔ مگر جب سے بہو آئی تھی۔ انہوں نے سارے کام چھوڑ چارپائی سنبھال لی تھی۔ کہتی تھیں کہ ان کے جوڑوں میں درد رہنے لگا ہے۔ مگر یہ درد جانے اس وقت کہاں جاتا' جب وہ محلہ گھومنے جاتیں۔ جب خالہ ایمن ان کو آ کر محلے بھر کے قصے سناتی رہتیں۔ گھنٹوں دونوں کی کھسر پھسر ہی ختم نہ ہوتی۔ خالہ ایمن کا تو کام ہی یہی تھا۔ اِدھر کی باتیں اُدھر اور اُدھر کی باتیں اِدھر' سارے محلے میں مقبول تھیں۔ ہر گھر میں ان کے آنے کا انتظار کیا جاتا۔ اگر وہ اماں کی طرف آنے میں کچھ دن لگا دیتیں تو اماں ناراض ہو جاتیں۔

"ارے جاؤ! میں تم سے بات نہیں کرتی' اتنے دنوں بعد شکل دکھائی۔" اماں بچوں کی طرح روٹھ کر کہتیں۔

"ارے بہن! سچی میں اتنی مصروف ہو گئی تھی کہ وقت ہی نہیں ملا۔" خالہ ایمن اپنی صفائی میں کہتیں۔

"آج ایسی خبر لائی ہوں کہ سنو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔" خالہ ایمن' اماں کی کمزوری خوب اچھی طرح جانتی تھیں۔ "ذرا قریب تو آؤ۔"

اماں کا غصہ ختم ہو جاتا اور وہ کھسک کر خالہ ایمن کے اور قریب ہو جاتیں۔ خالہ ایمن گھنٹوں اماں کے کانوں میں کھسر پھسر کرتی رہتیں۔ اماں ان کی باتیں سنتے ہوئے کبھی کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کرتیں' کبھی ہتھیلیاں ملنے لگتیں۔ کبھی ہونٹ سکیڑ کر چچ چچ کی آواز نکالتیں۔

خالہ ایمن جب اٹھ کر جانے لگتیں تو اماں اصرار کر کے ان کو تھوڑی دیر اور بٹھاتیں۔

"اچھا! بیٹھتی ہوں۔ ذرا ایک کپ چائے تو پلاؤ۔"

"اچھا! ابھی لاتی ہوں۔ تم بیٹھو تو سہی۔ ارے مائرہ! دو کپ چائے تو بنانا۔"

جب سے عقیل کی نوکری لگی تھی۔ اماں کے سر پر اس کی شادی کا جنون سوار ہو گیا تھا۔

عقیل ابھی شادی کے حق میں نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ابھی وہ صحیح طرح اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ اس کے معاشی حالات بھی ابھی اس کی اجازت نہیں دیتے۔ عقیل کے والد فوت ہو چکے تھے۔ وہ دو ہی بہن بھائی تھے۔ نبیلہ اس سے پانچ سال بڑی تھی۔ ابا نے جو جمع پونجی چھوڑی تھی۔ اس سے انہوں نے دو سال پہلے نبیلہ کی شادی دھوم دھام سے کر دی تھی۔ نبیلہ کی شادی اماں کے دور کے بھانجے سے ہوئی تھی۔ وہ اپنے گھر میں خوش تھی۔ چونکہ وہ دوسرے شہر میں رہتی تھی' اس لیے اس کا آنا کم ہی ہوتا تھا۔

عقیل کی نوکری لگنے سے پہلے گھر کا گزارہ ابا کی پنشن سے ہوتا تھا اور عقیل فارغ وقت میں کچھ ٹیوشن بھی کر لیا کرتا تھا۔ اس طرح اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔ ویسے بھی دو افراد کا خرچ ہی کیا ہوتا۔

عقیل کے نوکری لگنے سے اب گھر کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی تنخواہ ٹھیک ٹھاک تھی۔ وہ ساری تنخواہ لا کر اماں کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ اماں کفایت شعاری سے گھر کا خرچ چلاتیں۔ ایک سال میں انہوں نے اتنی بچت کر لی کہ وہ اب عقیل کی شادی آسانی سے کر سکتی تھیں۔

"ابھی شادی نہیں کرو گے تو کیا میرے مرنے کے بعد کرو گے؟"

اماں کا شادی کا مطالبہ دن بدن زور پکڑتا جا رہا تھا۔ اماں کے سر پر جو جنون سوار ہو جاتا' وہ مشکل سے ہی اترتا تھا۔ صبح' شام' آتے جاتے' ان کی زبان پر صرف یہی بات ہوتی۔

ایک دن وہ کہیں سے کھینچ کھانچ کر آنکھوں میں من من بھر کے آنسو بھر لائیں۔ عقیل کو ان کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

اماں نے ایک رشتے والی سے مل کر رشتے کی تلاش شروع کر دی۔

"اماں! اگر خاندان میں اچھی لڑکیاں موجود ہیں تو پھر باہر سے لانے کی کیا ضرورت ہے؟"

عقیل کو اماں کا باقاعدہ رشتے کی تلاش میں گھر گھر جانا پسند نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ خاندان سے باہر اجنبی

لوگوں میں رشتہ داری کا قائل نہیں تھا۔
"تم چپ کر کے بیٹھو۔ میں جانوں اور میرا کام۔ مجھے پتا ہے خاندان کی اچھی لڑکیوں کا۔"
عقیل کے اعتراض پر اماں نے اس کو ڈانٹ دیا۔
اماں کی اپنے سسرال والوں سے کبھی نہیں بنی تھی۔ نندوں کے گھر وہ رشتہ کبھی نہیں کریں گی کہ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے کبھی ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تو ان کی بیٹیاں ان سے کیا اچھا برتاؤ کریں گی۔ بلکہ وہ تو اپنی ماؤں کے نقش قدم پر ہی چلیں گی۔ جٹھانی کوئی تھی نہیں۔ دیورانی سے ان کو خدا واسطے کا بیر تھا۔ ویسے بھی ان کی لڑکیاں اتنی پڑھی لکھی نہیں تھیں اور عقیل نے تو ماشاء اللہ ماسٹرز کر رکھا تھا۔ اس کے لیے تو کوئی پڑھی لکھی لڑکی چاہیے تھی۔
بھانجی، اماں کی کوئی تھی نہیں۔ اماں کی ایک بہن اور دو بھائی تھے۔ خالہ کے صرف دو بیٹے ہی تھے۔ ماموؤں کی اگرچہ بیٹیاں تھیں۔ مگر وہ لوگ معاشی لحاظ سے کچھ زیادہ ہی خوش حال تھے۔ ان کی بیٹیوں کا اماں کے گھر میں گزارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ عقیل کی آدھی تنخواہ جتنی تو ان کا جیب خرچ ہوتا تھا۔ ویسے بھی ممانیوں نے کبھی اماں کو اتنی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ وہ لوگ تو کبھی ان کی طرف آئی ہی نہیں۔ اگر کبھی اماں ان سے ملنے چلی جاتیں تو ان کا سلوک بڑا رسمی سا ہوتا۔
لہٰذا ان کی طرف کا تو اماں نے سوچا بھی نہیں، کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ وہ ان سے رشتہ مانگنے گئیں بھی تو انکار ہی ہوتا تھا۔
ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ یہی ہوا کہ لڑکی خاندان سے باہر تلاش کی جائے۔
رشتے والی ماسی اماں سے کافی پیسے بٹور چکی تھیں۔ مگر نتیجہ ابھی تک کچھ نہیں نکلا تھا۔ لڑکی پسند آتی تو خاندان اچھا نہ ہوتا۔ اگر کہیں یہ دونوں باتیں ملتیں تو لڑکی کی تعلیم کم ہوتی۔
اسی کوشش میں تین مہینے گزر گئے۔ عقیل کا خیال تھا کہ اماں تھک ہار کر خاندان میں رشتہ کرنے پر راضی ہو جائیں گی۔ مگر وہ بھی ہمت ہارنے والی نہیں تھیں۔
ایک دن خالہ ایمن سے انہوں نے اس سلسلے میں بات کی تو وہ ان کو مائرہ کے گھر لے گئیں۔ اماں کو مائرہ بہت پسند آئی۔ وہ بی اے پاس تھی۔ خاندان بھی اچھا تھا۔
وہ لوگ بھی عقیل کو دیکھنے آئے۔ انہیں بھی عقیل پسند آگیا۔ دونوں خاندانوں کی دو، چار ملاقاتوں کے بعد رشتہ طے پا گیا۔ اماں تو خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھیں۔
اماں ہر آنے جانے والے کے سامنے مائرہ کی تعریفیں کرتے نہ تھکتیں۔ خصوصاً جب کوئی خاندان سے آتا تو وہ کہتیں۔
"میری بہو تو چاند کا ٹکڑا ہے۔ ایسی لڑکی چراغ لے کر ڈھونڈو تو بھی نہ ملے۔ ہماری فیملی میں تو اس کے ہم پلہ کوئی لڑکی ہے ہی نہیں۔"
اماں سب کے دلوں کو جلا کر اپنا دل ٹھنڈا کرتیں۔
گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اماں نے عقیل کی شادی کے لیے کافی رقم جمع کر رکھی تھی۔ انہوں نے مہنگی مہنگی دکانوں سے بری کے جوڑے تیار کروائے۔ زیور ان کی اپنی شادی کے رکھے ہوئے تھے۔ وہ تڑوا کر انہوں نے آج کل کے فیشن کے نئے زیور بنوائے۔
نبیلہ بھی راولپنڈی سے آگئی۔ البتہ اس کے شوہر شادی سے صرف تین دن پہلے ہی آئے۔ کیونکہ ان کو کام سے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ اماں نے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی پر جی بھر کر ارمان نکالے۔ سارے رشتے داروں نے شادی میں شرکت کی۔ سب کو شادی سے زیادہ چاند سی دلہن دیکھنے کا اشتیاق تھا۔
آخر جنوری کی ایک خوش گوار شام کو مائرہ دلہن کا روپ دھارے عقیل کے آنگن میں اتری۔
وہ دلہن کے روپ میں کافی اچھی لگ رہی تھی۔ مگر دیکھنے والوں کو دیکھ کر ایک دھچکا سا لگا کہ وہ کسی طرح بھی چاند کا ٹکڑا نہیں لگ رہی تھی۔ معمولی شکل و

صورت، مناسب قد، گندمی رنگ، سنہری زیوروں میں لدی، سرخ لہنگا، بھاری کامدار دوپٹہ اور اس پر بیوٹیشن نے کمال مہارت سے اس کے نقوش کو سنوارا تھا۔ ان سب میں وہ کافی خوب صورت لگ رہی تھی۔ مگر یہ مصنوعی حسن کا لبادہ اتر کر جو شکل سامنے آتا تھی، اس کو اگر چاند کے سامنے کیا جاتا تو وہ واقعی ناراض ہو کر، بادلوں میں منہ چھپا لیتا۔
عقیل کو مائرہ پسند آئی۔ ویسے بھی وہ کسی حور پری جیسی بیوی کا خواہش مند تھا بھی نہیں۔ اسے تو ایک قبول صورت، طریقے سلیقے والی شریک حیات چاہیے تھی۔ مائرہ میں یہ خوبیاں موجود تھیں۔
شادی کا ہنگامہ اگرچہ ختم ہو گیا تھا۔ مگر رشتہ داروں کے ہاں دعوتوں کا سلسلہ کافی دن جاری رہا۔ روز رنگ برنگ کے کھانے، سجی سجائی دلہن سسرال میں سالیوں کی چھیڑ چھاڑ، ہر طرف سے مبارک بادیں۔ زندگی واقعی اتنی خوب صورت پہلے کبھی نہ تھی۔ شادی کے دس، پندرہ دن خاندان میں ہی آنا جانا رہا۔ اس کے بعد نبیلہ ان سے راولپنڈی آنے کا وعدہ لے کر رخصت ہوئی۔ کیونکہ وہ کافی دنوں سے آئی ہوئی تھی۔ اس کے میاں کے فون پر فون آرہے تھے۔
عقیل کے دل سے شادی کے بارے میں جو وسوسے تھے، وہ نکل گئے تھے۔ وہ اکثر سوچتا کہ وہ خوامخواہ ہی شادی کے نام سے بھاگتا تھا۔ اگر مائرہ جیسی محبت کرنے والی بیوی اور اماں جیسی مہربان ماں ہو تو زندگی کتنی خوب صورت ہو جاتی ہے۔ وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتا۔
لیکن زندگی اگر اتنی سیدھی اور آسان ہو تو پھر وہ زندگی ہی کیا ہوئی۔ شادی کے چار مہینوں بعد ہی عقیل کو محبتوں کا وہ طلسم ٹوٹتا محسوس ہوا۔
شادی کے شروع دنوں میں تو اماں نے بہو کے خوب ناز اٹھائے، مگر رفتہ رفتہ ان کی محبت کی گرمی ٹھنڈی پڑنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

شادی کے دنوں میں چونکہ کام زیادہ ہوتا تھا۔ اس

لیے اماں نے ایک کام والی رکھ لی تھی۔ شادی کے بعد بھی وہ کام کرتی رہی۔ مائرہ کو کبھی کوئی خاص کام کرنا ہی نہیں پڑا تھا۔

اب اماں نے اچانک کام والی نکال دی تو مائرہ کو ایک دم دھچکا سا لگا۔ وہ کافی آرام طلب ہو گئی تھی۔ میکے میں تو وہ دو تین بہنیں، دو بھابھیاں اور ایک اماں ہوتی تھیں تو سب کے حصے میں ایک ایک کام ہی آتا تھا۔ مگر یہاں اس پر سب کاموں کی ذمہ داری ایک ساتھ آن پڑی۔

اگرچہ وہ گھر کے افراد تین ہی تھے۔ مگر سارا دن چھوٹے چھوٹے کام ختم ہی نہ ہوتے۔ کچھ وہ تھی بھی ذرا سست۔ صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہوتے نو بج جاتے۔ پھر برتن دھونا، صفائی کرنا، بکھری چیزیں سمیٹنا، ان سب میں اسے دو، تین گھنٹے لگ جاتے۔ کچھ دنوں بعد ہی کپڑوں کا ڈھیر لگ جاتا۔ اگر مشین لگاتی تو سارا دن اسی میں گزر جاتا اور دوپہر کے کھانے میں دیر ہو جاتی۔

عقیل کے لیے روزانہ صبح آفس جانے کے لیے ایک سوٹ تیار کرنا، پھر اس کے واپس آنے سے پہلے اس کا آکر بدلنے والا سوٹ تیار کرنا۔ عقیل کو کاٹن کے کپڑے ہی زیادہ پسند تھے۔ وہ کاٹن کے کلف لگے کپڑے پہنتا۔ میکے میں اس نے کبھی کلف والے کپڑے استری نہیں کیے تھے۔ یہ کام بڑی آپی کے ذمے تھا۔ مگر اب یہاں تو بڑی آپی نہیں آسکتی تھی۔ ایک سوٹ استری کرتے کرتے اسے ایک گھنٹہ لگ جاتا۔ مگر اس کی ساری شکنیں پھر بھی نہ نکلتیں۔

"تم نبیلہ کی طرح استری نہیں کرتیں۔ کالر بھی ٹیڑھا ہے۔ کف بھی صحیح استری نہیں ہوئے۔"

جب وہ عقیل کو سوٹ تھماتی تو کچھ اسی طرح کے الفاظ سننے کو ملتے۔

جب بجائے تعریف کے تنقید سننے کو ملتی تو استری کرتے کرتے اس کی دہری کمر کچھ اور دوہری ہو جاتی۔

عقیل کے ساتھ ساتھ اماں کے کپڑوں کا خیال کرنا۔ اپنا کہیں آنے جانے کے لیے ہر وقت کوئی نہ کوئی سوٹ استری کر کے ہینگ کرنا۔

کاموں کا ایک سلسلہ تھا جو اس کے لیے ختم نہیں ہوتا تھا۔

اماں کا کہنا تھا کہ اس جیسی جوان لڑکی کے آگے یہ کام کیا معنی رکھتے ہیں۔ میری نبیلہ تو ایسے بیسیوں کام منٹوں میں نپٹا لیتی تھی۔

مائرہ نے دبے دبے لفظوں سے کام والی ماسی چھڑانے پر احتجاج کیا۔ مگر اماں نے صاف کہہ دیا۔

"اے لڑکی! ہم نے کبھی گھر کے کام نوکرانیوں سے نہیں کرائے۔ عورت خود ہی اپنے گھر کو سجاتی سنوارتی ہے۔ ویسے بھی مہینے کا ایک ہزار وہ لے جائے گی تو گھر کیسے چلے گا... !" بات اماں کی بھی سچ تھی مگر سچ چونکہ کڑوا ہوتا ہے اور مائرہ کو یہ سچ کچھ زیادہ ہی کڑوا لگا۔ دنوں تک حلق سے اتر ہی نہیں رہا تھا۔

مائرہ کے آنے سے اماں گھر کے کام کاج سے بالکل فارغ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے تو چارپائی سنبھال لی تھی یا پھر زیادہ وقت وہ محلے میں کسی نہ کسی کے گھر گئی ہوتیں۔

اماں کو مائرہ کے ہر کام میں نقص نظر آتا۔

"پراٹھے تو بس میری نبیلہ بناتی تھی۔ ہاتھ ہی نہیں رکتا تھا۔ پتلے پتلے، نرم نرم، خستہ بالکل پوریوں کی طرح۔"

سالن میں کبھی نمک کم ہے تو کبھی مرچیں زیادہ ہونے کا شکوہ۔ روٹیاں اچھی ہیں تو نبیلہ کی روٹیوں کی طرح گول نہیں ہیں کہ چنگیر میں رکھو تو اوپر سے نیچے تک ایک ہی روٹی نظر آئے۔

اماں کھانے میں نقص نکالتی رہتیں، لیکن خوب پیٹ بھر کر کھاتیں۔

"اماں! ہر بندے کے ہاتھ کا اپنا ذائقہ ہوتا ہے۔ مائرہ بھی اچھا کھانا بناتی ہے۔" عقیل دبے دبے لفظوں سے اماں کو احساس دلانے کی کوشش کرتا۔

"تمہیں تو اچھا ہی لگے گا۔۔۔ جورو کا غلام!" بات آکر اسی محاورے پر ختم ہوتی۔

صرف دسترخوان پر ہی نہیں، کپڑوں کی سلائی، دھلائی، فرنیچر کی صفائی، گھر کی صفائی، گرہستی کے ہر

موڑ پر اس کا مقابلہ نبیلہ سے لیا جاتا۔ اسے نبیلہ سے چڑ سی ہونے لگی۔ اگر اماں کا رویہ بہو سے ایسا تھا تو بہو بھی ان سے دو ہاتھ آگے تھی۔

گھر کا خرچ اماں کے ہاتھ میں تھا۔ مائرہ کی پہلی کوشش یہی تھی کہ اب گھر کا خرچا وہ چلائے۔ اس نے عقیل سے اس معاملے میں کھل کر بات بھی کی۔ عقیل نے سختی سے انکار کر دیا۔

"گھر کا خرچ اماں کے ہاتھ میں ہے اور ہمیشہ ان کے ہاتھ میں ہی رہے گا۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہے، مجھے بتاؤ! میں لا کر دوں گا۔"

مائرہ کو اس بات پر غصہ تو بہت آیا، مگر وہ کر کچھ نہ سکتی تھی۔ عقیل کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کو صحیح کہے اور کس کو غلط۔ وہ اماں اور بیوی کی لڑائی میں خوامخواہ پس رہا تھا۔

آج بھی دفتر سے واپسی پر گھر کا نقشہ دیکھ کر اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ضرور اس کے دفتر جانے کے بعد گھر میں لڑائی ہوئی تھی۔ اسی لیے مائرہ کمرے میں بند تھی اور اماں نے سارا دن محلے میں کسی کے پاس بیٹھ کر گزارا تھا۔

اماں تو اب گھر آگئی تھیں۔ مگر مائرہ نے ابھی تک دروازہ نہیں کھولا تھا۔

"اماں! کیا بات ہے۔ آج پھر آپ دونوں کی لڑائی ہوئی ہے؟"

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ اپنی بیوی سے پوچھو۔ ہمیشہ وہ ہی لڑائی شروع کرتی ہے۔ ہاں! جب وہ الٹی سیدھی باتیں کرتی ہے تو جواب تو دینا پڑتا ہے۔ اب اس کو تم کو لڑائی کہو یا جو مرضی۔"

عقیل کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ٹھک کی آواز سے مائرہ کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ دروازے سے ہی لگی بیٹھی تھی۔ جیسے ہی اس کو اماں اور عقیل کی باتوں کی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً" باہر نکل آئی۔

"ہاں، ہاں! بھرو اس کے کان کرو میرے خلاف۔ میں ہی بری ہوں۔ ساری برائیاں مجھ ہی میں ہیں۔ مجھے شوق جو ہے لڑنے کا۔ خوشی ملتی ہے مجھے اپنا اور دوسروں کا خون جلا کے۔" مائرہ باہر نکلتے ہی شروع ہو گئی۔

"مائرہ! تم ہوش میں تو ہو؟ تمیز سے بات کرو۔" عقیل نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

"دیکھو، دیکھو، بیٹا! تمہارے سامنے اس طرح بات کر رہی ہے تو خود سوچو، تمہارے بعد کیا کرتی ہو گی۔ ماں نے یہی تربیت دے کر بھیجا ہے، بڑوں سے زبان درازی کی جائے۔"

"خبردار! اگر میری ماں کو کچھ کہا۔ تم سے تو وہ ہزار درجہ بہتر ہیں۔ انہوں نے اچھے اور برے میں فرق سکھایا ہے۔" مائرہ نے لفظ برے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"دیکھ رہے ہو بیٹا۔" اماں نے عقیل کو مخاطب کیا۔

"نہیں کیا دکھاتی ہیں؟ اگر یہ اتنے سمجھ دار ہوتے تو یہاں تک نوبت ہی نہ آتی۔" مائرہ نے اماں کے ساتھ عقیل کو بھی گھسیٹ لیا۔ حالانکہ عقیل نے ہمیشہ ماں اور بیوی دونوں کا ہی برابر خیال رکھا تھا۔

"خدا کے لیے بس کرو۔ سارا محلہ دیواروں سے کان لگائے سن رہا ہو گا۔" اس نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"سنتا ہے تو سنے۔ اچھا ہے، سب کو معلوم ہو جائے کہ میرے ساتھ اس گھر میں کیا سلوک ہوتا ہے۔" مائرہ نے بھی آج خاموش نہ ہونے کی قسم کھا رکھی تھی۔

"ارے! ساری غلطی میری ہے جو اس جیسی ڈائن کو دلہن بنا کر گھر لے آئی۔ جانے اس وقت میری آنکھوں پر کیا پٹی بندھ گئی تھی جو اس نیچ خاندان سے ناتا جوڑ لیا۔" اماں نے کف افسوس ملتے ہوئے اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کیا۔

"اگر میرا خاندان نیچ ہے تو یہاں کون سا شاہی خاندان ہے اور اس وقت تو ہماری دہلیز کی مٹی لے لی تھی۔ میری اماں نے بھی جانے کیا دیکھا اس گھر

میں۔"

"ارے میں کہاں جاتی تھی۔ وہ تو کرموں جلی ایمن لے گئی مجھ کو۔ زندگی برباد کردی میرے بیٹے کی۔" اماں نے روہانسی ہوکر کہا۔

"اگر تمہارے بیٹے کی زندگی برباد ہوئی ہے تو میری کون سی آباد ہوگئی ہے۔ دو گھڑی سکون کا وقت نہیں ملتا۔ سارا دن نوکروں کی طرح کام میں جتی رہتی ہوں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ سسرال میں سونے کے بھی بن کر رہو، مگر قدر کوئی نہیں ہوتی۔" مائرہ غصے میں جو منہ میں آیا بولے جارہی تھی۔ عقیل کی سماعتیں شل ہورہی تھیں۔

"اب میں اس جہنم میں اور نہیں رہ سکتی۔ میں جارہی ہوں واپس اپنے گھر۔ یہ گھر میرا نہیں، جہاں میرے میکے سے کسی کے آنے پر منہ پھلا لیا جائے۔ جہاں میں اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتی۔ جہاں میری کوئی عزت نہیں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اندر گئی اور سامان والا اٹیچی جو اس نے پہلے ہی تیار کیا ہوا تھا، لے کر باہر آگئی۔

عقیل ہکا بکا کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اسے مائرہ کے اس حد تک جانے کی توقع نہ تھی۔

"میں نے تو تمہارے مان اور عزت میں کوئی کمی نہیں کی۔ تم کو ہمیشہ اپنے گھر کی اور اپنے دل کی رانی سمجھا۔ مگر تم نے ایک ہی لمحے میں یہ سارے جذبے اپنے پاؤں تلے روند دیے۔" کوئی عقیل کے اندر سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ مگر اس کے لب خاموش تھے۔ وہ اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہا۔

مائرہ اپنے سامان سمیت بیرونی دروازے سے باہر نکل گئی۔ عقیل کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا مائرہ اس کے گھر آنگن کو اس طرح ٹھوکر مار کر چلی جائے گی۔

☼ ☼ ☼

مائرہ کو میکے گئے پندرہ دن گزر گئے تھے۔ عقیل نہ تو اس کو لینے گیا اور نہ ہی کوئی فون کیا۔ وہ جس طرح اس گھر کو ٹھوکر مار کر گئی تھی، عقیل کے لیے وہ سب قبول کرنا بہت مشکل تھا۔ وہ بہت چپ چپ رہنے لگا۔ اسے مائرہ کی کمی ہر لمحہ محسوس ہوتی۔ گھر میں ہر جگہ اس کی یادیں بکھری پڑی تھیں۔ وہ آفس سے آکر کمرے میں بند ہوکر بیٹھ جاتا یا اگر کبھی طبیعت زیادہ اداس ہوتی تو سڑکوں پر ٹہلتا رہتا۔

مائرہ کے جانے کے بعد گھر کا سارا کام اماں پر آن پڑا تھا۔ اماں تو پکی پکائی کی عادی ہوچکی تھیں۔ ان کے لیے اب گھرداری بہت مشکل تھی۔ پندرہ دن میں ہی انہیں احساس ہوگیا کہ مائرہ نے کس طرح گھر سنبھال رکھا تھا۔

صبح صبح اٹھ کر ناشتے کا جھنجٹ، اماں کی آسانی کے لیے عقیل ناشتا کیے بغیر آفس چلا جاتا۔ مگر دن کو تو کچھ نہ کچھ بنانا پڑتا۔ پھر اگر کسی طرح دن کا کام ختم ہوتا تو شام سر پر کھڑی ہوتی۔

اماں ایک دن سالن پکاتیں اور دو دن تک اس سے کام چلاتیں۔ ناشتا تو صبح بنتا ہی نہ تھا روٹیاں دن میں پکا لیتیں اور وہی شام کو بھی چلتیں۔

روٹیاں پکاتے وقت اماں کو مائرہ بہت یاد آتی۔ بے شک اس کی روٹیاں نبیلہ کی طرح گول نہیں ہوتی تھیں، مگر تازہ اور نرم تو ہوتی تھیں۔

کھانے پینے کے علاوہ گھر کی صفائی کا مسئلہ بھی تھا۔ اماں روزانہ جیسے تیسے جھاڑو دے لیتیں، مگر پونچھا لگانا اب ان کے بس کا کام نہیں تھا۔ میل جمنے سے فرش اپنی چمک کھوچکے تھے۔ باتھ روم کا بیسن بدرنگ ہوچکا تھا۔ کیوں کہ اس کی روزانہ صفائی نہیں ہوتی تھی۔ کمرے میں چیزوں کی ترتیب بھی پہلی والی نہ تھی۔ جگہ جگہ جالے لٹک رہے تھے۔

کچھ ہی دنوں بعد کپڑوں کا ڈھیر لگ جاتا۔ اماں سارا دن لگا کر کپڑے دھوتیں، مگر پھر بھی وہ صحیح طرح صاف نہ ہوتے۔ بظاہر گھر کے کام جو معمولی نظر آتے ہیں، ان کو ایک مقررہ وقت اور چاق و چوبند ہاتھ چاہیے ہوتے ہیں۔

اماں اب بہت تھک چکی تھیں۔ انہیں پوری طرح احساس ہوگیا، اب یہ گھر مائرہ کے بغیر نہیں چل سکتا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ مائرہ جلد از جلد گھر واپس آجائے۔ وہ دیکھ رہی تھیں کہ عقیل بھی مائرہ کے جانے کے بعد اداس اور بجھا بجھا سا رہنے لگا ہے۔

آج انہوں نے تہیہ کرلیا کہ وہ عقیل سے بات کریں گی کہ وہ مائرہ کو گھر لے آئے۔

عقیل کہیں باہر نکلا ہوا تھا۔ وہ جیسے ہی آیا۔ اماں نے اس سے بات کرنے کی ٹھان لی۔

"کہاں گئے تھے بیٹا؟" حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ وہ اکثر شام کو دوستوں کے ساتھ پارک وغیرہ میں بیٹھا رہتا تھا۔

"کہیں نہیں اماں! یہیں تھا۔" عقیل نے سرسری سا جواب دیا۔

"بیٹا! تم سے ایک بات کرنی ہے۔" اماں نے اصل موضوع چھیڑا۔

"کہیں اماں! کیا بات ہے؟"

"بیٹا! بہو کی طرف نہیں گئے تم؟ کتنے دن ہوگئے اس کو گئے ہوئے۔ اب ایسی بھی کیا ناراضی؟"

"کیوں اماں! کیا اداس ہوگئی ہیں آپ اس کے بغیر؟" عقیل نے طنزیہ کہا۔

"ایسا ہی سمجھ لو۔" اماں نے اس کے لہجے کی چبھن محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"خود ہی گئی ہے، خود ہی آئے گی۔ کوئی گھر سے نکالا نہیں گیا اس کو۔ میں اس کو لینے نہیں جاؤں گا اور نہ ہی آپ جائیں گی۔ سنا آپ نے؟"

"کیوں، میں کیوں نہ جاؤں؟ آخر کسی نے تو جانا ہے۔ بات اسی طرح ختم ہوگی۔ آخر بڑوں کو ہی چھوٹوں کے مسئلے حل کرنے ہوتے ہیں۔"

"اماں! اگر آپ کو بڑا پن دکھانا تھا تو اس وقت دکھاتیں، جب آپ دونوں معمولی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر بچوں کی طرح لڑنا شروع کردیتی تھیں۔ اس وقت آپ نے یہ سب کیوں نہیں سوچا؟ اگر مائرہ کم عقل تھی تو آپ اپنے حسن سلوک سے اس کو بدل سکتی تھیں۔ وہ پہلے دن سے ایسی نہ تھی۔ آپ نے اس کو ہر قدم پر تنقید کا نشانہ بنایا۔ ہر جگہ اس کو نبیلہ سے کمتر ہونے کا احساس دلایا۔ آپ کو تو اس کی ہر بات پر اعتراض تھا۔ اس کے رسالے پڑھنے، اونچا میوزک سننے، گھنٹوں فون پر سہیلیوں سے گپیں لگانے، نئے فیشن کے کپڑے پہننے، آئے دن میکے جانے، غرض ہر بات پر تو اعتراض تھا۔ مگر اماں! ذرا سوچیں۔ کیا یہ سب عادتیں ہر لڑکی میں نہیں ہوتیں۔ کیا نبیلہ آپی میں بھی یہ سب عادتیں نہیں تھیں؟ اس وقت تو آپ کو یہ سب باتیں اتنی بری نہیں لگتی تھیں۔ بلکہ آپ کہتی تھیں کہ نبیلہ تو ہمارے گھر کی چڑیا ہے۔ اسی کی چہکار سے گھر کی رونق ہے۔ جس دن یہ اڑ گئی۔ ہمارے گھر کا آنگن سونا ہوجائے گا۔ اماں! سوچیں اگر نبیلہ آپی گئیں تو اللہ نے آپ کو مائرہ کی صورت میں وہی چہکار لوٹا دی، لیکن آپ نے اسے کبھی نبیلہ نہ سمجھا۔"

اماں پھٹی پھٹی نظروں سے عقیل کی طرف دیکھ رہی تھیں انہیں اندازہ ہی نہ تھا کہ عقیل اس قدر بھرا بیٹھا ہے۔

"اماں! یہ جو آپ مجھے ہر وقت جورو کا غلام ہونے کا طعنہ دیتی تھیں، بتائیے! بیوی کو کبھی کبھی باہر گھمانے لے جانا، اس کی پسند کا کوئی تحفہ دلا دینا، اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال رکھنا، صبح سے شام تک کام کرنے والی کو دو لفظ تعریف کے کہہ دینا کیا یہ سب کرنے سے بندہ جورو کا غلام ہوجاتا ہے؟ اگر آپ نے مائرہ کو دل سے قبول کیا ہوتا تو ہمارے گھر کے حالات اس نہج پر نہ آئے ہوتے جس پر آج ہیں۔" بولتے بولتے عقیل کی آواز بھرا گئی۔

"اب پلیز! آپ مجھ سے آئندہ مائرہ کو لانے کی بات مت کیجئے گا۔ میں اسے لینے کبھی نہیں جاؤں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" عقیل جھٹکے سے اٹھا اور جاکر اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔

اماں جہاں بیٹھی تھیں، وہیں بیٹھی رہ گئیں۔ عقیل نے آج ان کو کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا۔ اس کی کہی ہوئی باتوں کا لفظ لفظ سچ تھا۔ اماں کو آج اپنا بیٹا خود سے بہت زیادہ قد آور لگ رہا تھا۔ اس کے سامنے وہ خود کو بہت چھوٹا محسوس کررہی تھیں۔ ان کی وہ رات بستر پر

کروٹیں بدلتیں ہی گزر گئی۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی نہ سو سکیں۔ عقیل کی کہی ہوئی باتیں ان کے ذہن میں ابھی تک گونج رہی تھیں۔ انہیں احساس ہو رہا تھا کہ ان سے بھی کچھ زیادتیاں ہو گئی ہیں۔

☼ ☼ ☼

شادی کے بعد مائرہ پہلی دفعہ اتنا عرصہ میکے رہ رہی تھی۔ ورنہ وہ اور عقیل اکٹھے آتے اور ساتھ ہی چلے جاتے۔ پہلے کچھ دن تو کسی نے محسوس نہیں کیا' مگر آہستہ سب کو معلوم ہو گیا کہ اس کا اپنی ساس سے جھگڑا ہو گیا ہے۔

"یہ مائرہ کتنے دن سے آئی ہوئی ہے۔ گھر کیوں نہیں جا رہی؟" ابا کو تشویش ہوئی تو وہ ایک دن پوچھ بیٹھے۔

"چلی جائے گی۔ ساس سے کوئی جھگڑا ہوا ہے۔ خود ہی نمٹ جائے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" اماں نے بات چھپانا مناسب نہ جانا۔

"دیکھو مائرہ کی ماں! جو بھی مسئلہ ہے۔ اس کو حل کرو۔ اور اسے اپنے گھر بھیجو۔ بات کو طول نہ دو۔ خود جا کر پتا کرو۔ عقیل سے ملو۔ آخر بات کیا ہے۔ ہماری اور بھی بیٹیاں ہیں' جن کو ہم نے بیاہنا ہے۔ اگر تم سے بات نہیں بنتی تو مجھے بتاؤ! میں چھوڑ کر آتا ہوں اسے اس کے گھر۔" مائرہ کے والد احمد علی سمجھ دار اور سلجھے ہوئے انسان تھے۔

اماں نے مائرہ سے دوٹوک بات کی۔ "تناں! کس نے تم سے کہا تھا کہ تم لڑ جھگڑ کر گھر ہی چھوڑ بیٹھو؟"

"امی! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کیا میں آپ پر بوجھ بن گئی ہوں؟ آپ خود ہی تو کہتی تھیں کہ کسی سے دب کر نہ رہنا۔ ورنہ ہمیشہ کے لیے دب جاؤ گی۔"

"لیکن تمہیں گھر چھوڑنے کا تو نہیں کہا تھا۔ اس طرح بات بگڑ بھی سکتی ہے۔ تمہیں آئے ڈیڑھ مہینے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ وہاں سے کوئی لینے نہیں آیا۔ تمہارے ابا تو کہہ رہے تھے کہ اگر کوئی لینے نہیں آیا تو میں خود چھوڑ آتا ہوں۔"

"نہیں امی! میں اس طرح نہیں جاؤں گی۔ اس طرح میری نہ میکے میں عزت رہے گی' نہ سسرال میں۔" وہ رونے لگی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ شادی کے بعد لڑکی میکے آتی ہے تو مہمانوں کی طرح' جس کے آنے کے ساتھ ہی اس کی واپسی کا انتظار بھی کیا جانے لگتا ہے۔

اس کے روٹھ کر آنے سے اس کی بھابھیاں بھی شیر ہو گئیں۔ انہیں زبان مل گئی کہ وہ ہی ہیں جو بھرے گھر میں گزارہ کر رہی ہیں۔ ورنہ مائرہ تو اکیلی ساس کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکی۔

مائرہ کے کانوں میں اٹھتے بیٹھتے بھاوجوں کی طنزیہ باتیں پڑتی رہتیں۔

"بس چکا ان کا گھر۔ گئی ہیں نہیں اور مڑ بھی آئیں۔ ابھی تو راستے بھی میلے نہیں ہوئے۔"

وہ پلٹ کر جواب نہ دیتی۔ گھر کے سب افراد اس سے ہی کھنچے کھنچے رہنے لگے۔

مائرہ سے چھوٹی عالیہ کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ مائرہ کی وجہ سے اس پر اثر پڑ سکتا تھا اسی لیے عالیہ اس سے کم ہی بات چیت کرتی۔ حالانکہ جب وہ پہلے آئی تھی تو سب سے زیادہ وہ ہی اس کے پاس بیٹھ کر گپیں لگاتی تھی۔

امی بھی اب خوامخواہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر چڑنے لگی تھیں۔ وہ بظاہر تو دوسروں کو ڈانٹ رہی ہوتیں' مگر اسے لگتا جیسے وہ اسی کو سنا رہی ہوں۔

مائرہ کے لیے زندگی کا یہ روپ انتہائی بھیانک تھا۔

"کتنی ناقدری اور ناشکری کی میں نے۔ عقیل جیسے محبت کرنے والے شوہر کو کتنا دکھ دیا۔ ان کے گھر کو' ان کی محبتوں اور خلوص کو ایک ٹھوکر میں چھوڑ آئی' اس میکے کے گھمنڈ پر۔"

آج وہ ضمیر کی عدالت میں کھڑی تھی۔ ہر گواہی اس کے خلاف تھی۔

کیا تمہارا اپنا گھر نہیں تھا؟ کیا کمی تھی تمہارے اس گھر میں۔ جسے تم جہنم کہہ کر چلی آئیں؟

تم سے ایک اماں کا دل بھی جیتا نہ جا سکا۔ کیا ہوا اگر وہ کسی بات پر روک ٹوک کرتی تھیں۔ کیا تمہاری سگی ماں نے کبھی تمہیں کسی بات پر منع نہیں کیا۔ کیا انہوں نے کبھی تمہاری ذات پر نکتہ چینی نہیں کی؟ مائیں اگر ایسا کرتی ہیں تو اولاد کی اصلاح کے لیے۔

کیا تمہاری سگی ماں نے کبھی تمہیں بے ہودہ فیشن کے ملبوسات پہننے پر نہیں ٹوکا۔ کیا وہ تمہیں میوزک سننے پر نہیں ٹوکتیں؟ کیا وہ رسالوں کو زیادہ پڑھنے سے منع نہیں کرتیں کہ اس طرح آنکھوں کی بینائی پر اثر پڑتا ہے۔ یہی سب باتیں اگر ساس نے کہہ دیں تو تم کو یہ پابندیاں لگنے لگیں۔ جس طرح تم نے ساس سے بدتمیزی کی۔ اگر تمہاری بھابھیاں تمہاری ماں سے کریں تو تمہارے بھائی خاموش رہیں گے؟ تم نے کیوں عقیل کو اس کا صبر آزمانے پر مجبور کر دیا۔ ضمیر کی عدالت میں اس پر لگائے جانے والے الزامات کی فہرست بہت طویل تھی۔

"او میرے خدایا! مجھ سے کیا ہو گیا۔ میں خود ہی اپنی کم عقلیوں سے اپنا گھر اجاڑنے لگی تھی۔"

ان چند دنوں میں مائرہ نے جو کچھ سیکھا تھا۔ اپنے گھر میں رہ کر شاید وہ کبھی نہ سمجھ سکتی۔

وہ اب جلد از جلد گھر لوٹنا چاہتی تھی۔ مگر گھر سے کوئی لینے نہیں آ رہا تھا۔

ابا کا اصرار بھی روز بروز بڑھنے لگا کہ مائرہ کو گھر چھوڑ کر آؤ۔ نہیں تو میں خود چھوڑ آتا ہوں۔

"مائرہ! اب اس طرح نہیں جائے گی۔" امی کہتیں۔

"عذرا بیگم! تم جیسی مائیں ہی بیٹیوں کا گھر نہیں بسنے دیتیں۔ جھوٹی انا لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اس سب کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔"

"جو ہو گا' دیکھا جائے گا۔" امی بے بسی سے کہتیں۔ پریشان تو وہ خود بھی تھیں۔ انہیں رہ رہ کر عقیل پر غصہ آتا کہ وہ بھی ضد لگا کر بیٹھ گیا۔ پہلے تو وہ ایسا نہیں تھا۔

"تم خود عقیل سے بات کرو۔ آخر کو تم دونوں میاں بیوی ہو۔ اس طرح کی اونچ نیچ تو ہر گھر میں ہوتی رہتی ہے۔ معاملے کی نزاکت کو سمجھو۔ کہیں بات ہاتھ سے نہ نکل جائے اور تم ہاتھ ملتی رہ جاؤ۔"

امی کے بے حد اصرار پر وہ گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

"ہیلو!" کسی نے پہلی بیل پر ہی فون اٹھا لیا۔ اسے آواز پہچاننے میں ذرا دیر نہ لگی۔ دوسری طرف سے فون عقیل نے ہی اٹھایا تھا۔

"ہیلو! ہیلو کون ہے؟" عقیل دوسری طرف سے مکمل خاموشی پر خود ہی بولے جا رہا تھا۔

"میں ہوں' مائرہ!" اسے اپنی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ آواز حلق سے پھنس پھنس کر نکل رہی تھی۔

"کون مائرہ؟" عقیل کا رویہ اجنبیوں جیسا تھا۔

"ابھی اتنی دیر بھی نہیں ہوئی کہ آپ میرا نام ہی بھول جائیں۔" مائرہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اینی وے! کم ٹو دا پوائنٹ۔ کس لیے فون کیا؟"

اتنی اجنبیت' اتنی بے رخی' مائرہ کو ایسے لگا جیسے وہ واقعی کسی اجنبی سے بات کر رہی ہو۔

"کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ اپنے شوہر سے بغیر کسی وجہ کے بات کر سکوں؟"

"یہ حق تم نے خود کھویا ہے مائرہ بیگم! اب شکوہ کیسا؟"

"مجھے یہ حق واپس چاہیے..... میں گھر واپس آنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے لینے آ جائیں۔" یہ سب اس نے جس طرح اپنی انا کو اپنے پاؤں تلے کچلتے ہوئے کہا' یہ وہ ہی جانتی تھی۔

"یہ تو تم بھول جاؤ کہ میں تمہیں منانے آؤں گا۔ تمہاری ماں' بہن' بھائیوں کے سامنے خود کو قصوروار ظاہر کرتے ہوئے درخواست کروں کہ انکل' آنٹی! آپ پلیز مائرہ کو واپس بھیج دیں۔ آئندہ ہمارے گھر میں اس کی شان میں کوئی گستاخی نہیں ہو گی۔ ہم اس کو پھولوں کی طرح رکھیں گے اور پھر تم بڑے فخر اور غرور کے ساتھ مجھے نیچا دکھا کر میرے ساتھ احسان عظیم کرتے ہوئے چل پڑو گی۔"

"میں نے یہ سب کب کہا ہے؟" وہ بے بسی سے بولی۔ اس نے عقیل کو اس لہجے میں بات کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"نہیں کہا تو اب کہہ لوگی۔ تم سے اب ہر چیز کی توقع کی جاسکتی ہے۔"

"عقیل! یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

"سچ کہہ رہا ہوں' اسی لیے بہت عجیب لگ رہا ہے۔"

مائرہ تو سمجھ رہی تھی کہ وہ فون کرے گی۔ عقیل سے سوری کرے گی اور ہمیشہ کی طرح اس کی غلطیوں کو درگزر کرنے والا عقیل فوراً" مان جائے گا۔ مگر یہاں تو سب کچھ اس کی سوچوں کے برعکس ہو رہا تھا۔

"عقیل پلیز! آپ بات کو بڑھائیں مت۔" مائرہ آج ہر حال میں صلح کی خواہاں تھی۔ ورنہ وہ کہاں کسی کی اتنی باتیں سننے والی تھی۔ وہ تو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والی تھی۔

"بات تم نے شروع کی تھی۔ اختتام میں کروں گا۔ ویسے بھی تم اس گھر میں، جو کہ بقول تمہارے کسی طرح بھی جہنم سے کم نہیں' آکر کیا کروگی؟ اس گھر نے تمہیں دیا ہی کیا ہے؟ نہ محبت' نہ مان' نہ عزت۔ بھلا کیوں لوٹوگی تم واپس اس ویرانے میں' جہاں تم سے نوکرانیوں کی طرح کام کرایا جاتا ہے۔" عقیل مائرہ کی کہی ہوئی باتیں لوٹا رہا تھا۔

"تم جیسے گئی تھیں' ویسے ہی آؤ گی۔ یہاں سے کوئی تمہیں لینے نہیں آئے گا۔" عقیل نے فون بند کردیا۔

اسے فون رکھتا دیکھ کر امی آگئیں۔

"ہوگئی عقیل سے بات؟ کیا کہا اس نے؟ کب آئے گا؟" انہوں نے ایک ہی سانس میں کتنے سوال کر ڈالے۔

"امی! وہ نہیں آئیں گے۔ انہوں نے کہا کہ خود گئی ہو' خود ہی آؤ گی۔"

شام تک یہ بات سب گھر میں پھیل چکی تھی۔ سب کو معلوم ہوچکا تھا کہ مائرہ کے سسرال والے بھی اب ضد لگا کر بیٹھ گئے ہیں۔ چھپ بھی کیسے سکتی تھی' سب کو پتا تھا کہ چھوٹی بھابھی کو کن سوئیاں لینے کی عادت ہے۔ عقیل اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو ابا تک بھی پہنچ گئی تھی۔ انہوں نے مائرہ کو بلا کر کہا۔

"اپنا سامان پیک کرلو۔ ہمیں صبح ہی نکلنا ہے۔"

"مگر کہاں ابو؟" وہ سمجھ نہ سکی۔

"تمہارے گھر اور کہاں۔"

"مگر ابو.....!"

"اب میں تمہاری کوئی اگر مگر نہیں سنوں گا۔ اپنی حماقتوں کا انجام دیکھ لیا؟ بسا بسایا گھر اجاڑنے پر تلی ہوئی ہو تم دونوں ماں' بیٹی۔ کیا تمہیں خود احساس نہیں تمہاری چھوٹی بہنیں بھی ہیں؟ اگر تم گھر بیٹھ گئیں تو سوچو ان کے مستقبل پر کیا اثر پڑے گا۔"

مائرہ نے خود کو اتنا بے بس کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

"جی ابو!" کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ اس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ کمرے میں پہنچ کر وہ بیڈ پر دھڑام سے گر گئی۔

"او میرے خدایا! اتنی بے وقعتی۔" وہ تکیہ میں سر دے کر رونے لگی۔ آنکھوں کے راستے دل کا غبار ڈھل گیا تو وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔

اس پریشانی میں اس کو صرف ایک ہی راستہ نظر آیا۔ باتھ روم میں جاکر اس نے وضو کیا اور جائے نماز بچھا کر عشاء کی نماز ادا کرنے لگی۔ پھر دو رکعت پڑھ کر اپنے رب کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی اور پھر پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

فجر کی اذان کے وقت اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے وضو کیا اور فجر کی نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے تھوڑی دیر تلاوت کی۔ نیند اس پر غالب آرہی تھی۔ چونکہ وہ رات کو بھی صحیح طرح سو نہیں سکی تھی۔

صبح آٹھ بجے کسی نے اس کا دروازہ بجایا تو اس کی آنکھ کھلی۔

"مائرہ باجی! اٹھ جائیں۔ آپ کے گھر سے کوئی آپ کو لینے آیا ہے۔" عالیہ نے بند دروازے سے ہی آواز دے کر کہا۔

مائرہ کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"کیا عقیل آگئے؟"

مائرہ نے سر سجدے میں رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر سب سے پہلے صحن میں رکھے پودوں پر پڑی۔ جو وقت پر پانی نہ دینے کی وجہ سے مرجھا گئے۔ اس سے پہلے کسی کو گھر میں پودوں کا شوق نہیں تھا۔ اس نے عقیل سے کہہ کر صحن کے کونے میں زمین کھدوا کر ایک کیاری کے لیے جگہ بنوائی تھی۔ کیاری کے علاوہ بھی اس نے گملے منگوا کر ان میں موتیا اور گلاب کے پودے لگائے تھے۔ ان پودوں میں جب پھول کھلتے تھے' آنگن سج جاتا تھا۔ مگر اب ان پودوں کی حالت دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوا۔ دروازے کے ساتھ جو رنگ برنگ کے پھولوں والی بیل تھی' جسے اس نے رسیوں سے باندھ کر بمشکل دیوار اور دروازے پر چڑھایا تھا۔ وہ شاید تیز ہوا چلنے سے ٹوٹ کر دو حصے ہوگئی تھی۔ بیل کا ٹوٹا ہوا حصہ ابھی تک رسی سے بندھا ہوا دیوار پر لٹک رہا تھا۔ گو کہ اب وہ بالکل سوکھ گیا تھا۔

صحن کے ساتھ ساتھ باقی گھر کی حالت بھی ابتر تھی۔ فرش پر دھول مٹی جمی ہوئی تھی۔ جوتا اتار کر ان پر چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب وہ یہاں تھی تو صحن روزانہ دھوتی تھی۔ کمرے کے فرش اس طرح گیلے کپڑے سے رگڑ رگڑ کر چمکاتی کہ ان پر جوتا اتار کر چلنے کو دل کرتا۔

کمروں کے پردے اور بیڈ شیٹ بھی بہت گندی ہوگئی تھیں۔ کمرے کی کھڑکیوں اور دروازوں پر مٹی جم سی گئی تھی۔ فرنیچر کا بھی یہی حال تھا۔ کچن میں آئی تو برتنوں کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ کوئی برتن اپنی جگہ پر نہ تھا۔ سنک کی تو چمک ہی ختم ہوگئی تھی۔

اس نے سب سے پہلے کچن سے شروع کیا۔ برتن دھو کر ترتیب سے رکھے۔ گیلے کپڑے سے شیلف کو صاف کیا۔ جھاڑو دے کر فرش پر پونچھا لگایا' پھر اس نے کمروں کا رخ کیا۔

سب سے پہلے اس نے اماں کے کمرے کی صفائی کی۔ ان کے بستر کی چادر کافی گندی ہوگئی تھی۔ اس نے دوسری چادر ڈال کر گندی چادر دھونے والے کپڑوں میں رکھ دی۔

اماں نے صحن میں پڑی واشنگ مشین کو دھو کر اس میں صابن ڈال دیا۔ وہ دھلنے والے کپڑے نکال کر بڑے ٹب میں رکھتی جاتی۔

ان کاموں سے فراغت پا کر وہ اپنے کمرے کی طرف آئی۔ کپڑوں والی الماری کھولی تو کوئی کپڑا اپنی جگہ پر نہ تھا۔ صرف ایک سوٹ ہینگر پر لٹک رہا تھا۔ کاٹن کے کپڑے ایک کونے میں گچھا بنے پڑے ہوئے تھے۔ لگتا تھا اس کے جانے کے بعد کسی نے ان کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ لگاتا بھی کون۔ اماں تو اب کلف لگا کر استری کرنے سے رہیں۔ عقیل کو کتنا شوق تھا' کاٹن کے کپڑوں کو کلف لگا کر پہننے کا۔ اسے دل میں دکھ سا محسوس ہوا۔

الماری کی ترتیب درست کرنے کے بعد اس نے بیڈ شیٹ بدلی۔ عقیل کی کتابوں کو ترتیب سے رکھا۔ عقیل کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ رات کو سونے سے پہلے کسی اچھی سی کتاب کا مطالعہ ضرور کرتا تھا۔

کتابوں کو صاف کرتے ہوئے ایک کاغذ اس کے ہاتھ لگا۔ اس نے کھول کر دیکھا تو اس پر کوئی شعر لکھا ہوا تھا۔

کبھی عزیز تھا جو مجھ کو دل و جان کی طرح
ابھی قریب سے گزرا ہے وہ انجان کی طرح

اسے بتاؤ کڑی دھوپ میں' میں جل رہا ہوں
کبھی جو ساتھ رہا میرے سائبان کی طرح

مائرہ کو محسوس ہوا کہ جس طرح وہ عقیل کے لیے دن رات تڑپی ہے۔ اسی طرح عقیل نے بھی اس کی کمی محسوس کی ہے۔ اس احساس نے اس کے اندر تازگی

سی بھر دی۔
وقت بہت کم تھا۔ اس نے عقیل کے آنے سے پہلے پہلے سارے کام ختم کرنے تھے۔
فرنیچر کی جھاڑ پونچھ سے فارغ ہو کر اس نے کھڑکیوں اور دروازوں سے مٹی کی تہ گیلے کپڑے سے صاف کی۔ فرش اتنا گندا تھا کہ بغیر دھوئے چارہ نہ تھا۔
وہ صحن والی ٹونٹی سے پانی والا پائپ لگا کر اندر تک لے آئی۔ فرش پر سرف چھڑک کر اس نے رگڑ رگڑ کر فرش پر جمی میل کی تہ صاف کی۔
فرش دھو کر اس نے سکھانے کے لیے ہر جگہ کے پنکھے آن کر دیے۔
اماں نے کپڑوں کو دھو دھو کر ڈھیر لگا دیا تھا۔
وہ کپڑوں کو نتھارنے کا سوچ رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ وہ فون اٹھانے کے لیے اندر جانے لگی تو اماں نے اسے روک دیا۔
"ٹھہرو بہو! میں دیکھتی ہوں' ہو سکتا ہے عقیل کا فون ہو۔"
دونوں کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔
فون واقعی عقیل کا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ آج اسے ضروری کام ہے۔ اس لیے وہ ذرا دیر سے آئے گا۔ آپ پریشان نہ ہوئیے گا۔
چونکہ عقیل کو دیر سے آنا تھا' اس لیے اسے تھوڑا اور وقت مل گیا۔
وہ کپڑے نتھار کر اور نچوڑ کر اماں کو پکڑاتی جاتی اور وہ صحن میں لگی رسیوں پر پھیلاتی گئیں۔
تھوڑی دیر میں سارے کپڑے دھل گئے۔ اس نے مشین دھو کر خشک کپڑے سے سکھا دی۔ دھوپ میں پڑے رہنے سے اس کا رنگ کافی دھیما پڑ گیا تھا۔ مائرہ اس کو گھسیٹ کر برآمدے تک لے آئی۔
اس کام سے فارغ ہو کر مائرہ نے عقیل کے کاٹن کے سوٹ کو کلف لگا کر دھوپ میں پھیلا دیا۔
بھوک بہت زوروں کی لگ رہی تھی۔ مگر کھانے کا اہتمام تو انہوں نے رات کو کرنا تھا۔ اس لیے دونوں نے سینڈوچز پر گزارا کیا۔
عقیل کے سوٹ میں ابھی ہلکی ہلکی سی نمی تھی۔ مائرہ نے اسے اتار لیا۔ اس طرح ہلکے گیلے کپڑوں کو استری کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اس نے سوٹ استری کر کے ہینگر میں لٹکا دیا۔
اماں نے اس دوران بریانی کا مسالا تیار کر دیا تھا۔ اس نے بریانی کے لیے دیگچہ چولہے پر چڑھا دیا۔ عقیل کو بریانی کے ساتھ آلو کا رائتہ بہت پسند تھا۔ اس نے رائتہ بھی تیار کر لیا۔ یہ سب کرنے کے بعد اس نے شیر خرما بنا کر ٹھنڈا ہونے کے لیے فریج میں رکھ دیا۔
سالن رات کا بچا ہوا تھا۔ اس نے دو چپاتیاں بھی بنا لیں۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ بریانی کے ہوتے ہوئے کوئی ان کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ مگر اس کا دل چاہ رہا تھا کہ دسترخوان پر کسی چیز کی کمی نہ ہو۔
دھول' مٹی اور پسینے سے اس کا برا حال ہو گیا تھا۔ گھر تو چمک گیا تھا۔ مگر وہ خود میلی کچیلی ہو گئی تھی۔
کام چونکہ نپٹ چکے تھے' اس لیے اس نے اپنی طرف توجہ دی۔ الماری سے عقیل کی پسند کا سوٹ نکالا۔ جو اس نے اس کی سالگرہ پر تحفے میں دیا تھا۔ وہ اکثر اس سے شکایت کرتا تھا کہ تم نے کبھی میرا لایا ہوا سوٹ نہیں پہنا۔ اس نے سوٹ استری کیا اور شاور لے کر فریش ہو گئی۔ اس نے گیلے بالوں میں برش کیا۔ ہلکا سا پرفیوم لگایا۔ اماں کے اصرار پر اس نے شادی والا سونے کا سیٹ نکال کر پہنا۔ ہلکا ہلکا میک اپ کیا۔ آج وہ خود کو بہت مکمل اور پرسکون محسوس کر رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ لمبی مسافت طے کر کے آئی ہو۔
ان چند مہینوں میں اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا تھا۔ اب وہ زندگی نئے سرے سے شروع کرنا چاہتی تھی اور اس نے اماں کا دل جیتنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ اماں بھی اپنے کیے پر شرمندہ تھیں۔ اسی لیے اسے میکے سے لینے خود پہنچ گئی تھیں۔
اماں نے اس کا بھرم رکھ لیا تھا۔ اس کا مان نہیں ٹوٹنے دیا۔ اسے اس کے میکے والوں کے سامنے' اس کی بھابیوں کے سامنے جس محبت اور چاہت سے متاثر کر

لائی تھیں، جس طرح اس کی لاج رکھی تھی۔ وہ ان کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔

عقیل کی طرف سے اس کے دل میں ابھی عجیب عجیب وسوسے جنم لے رہے تھے، مگر اسے یقین تھا، اللہ اس کی اس معاملے میں بھی مدد کرے گا۔

وہ ان ہی سوچوں میں گم تھی کہ دروازے پر بیل بجی۔ یقیناً "یہ عقیل ہی ہوگا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

وہ کمرے میں رہی۔ اماں نے اسے منع کیا تھا کہ جب تک میں نہ کہوں تم باہر مت آنا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی عقیل کو کسی مانوس سے احساس نے گھیر لیا۔ اسے گھر کا ماحول کچھ بدلا بدلا سا لگا۔

صحن میں پڑے پودوں کی مٹی گیلی تھی۔ لگ رہا تھا انہیں کسی نے پانی دیا تھا۔ ان کے سبز پتے جو گرد کی وجہ بدرنگ ہوگئے تھے۔ آج اجلے اجلے اور نکھرے نکھرے لگ رہے تھے۔

صحن بھی صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ کوئی چیز بکھری ہوئی نہیں تھی۔ وہ اندر آیا تو سارا گھر چمک رہا تھا۔ کسی چیز پر اسے گرد نظر نہ آئی۔ کچن کی طرف نظر گئی تو وہ بھی لشکارے مار رہا تھا۔ کچن سے رنگ برنگ کھانوں کی خوشبوئیں آرہی تھیں۔ اسے آج اپنا گھر، اپنا نہیں لگ رہا تھا۔ اماں اس کی کیفیت سمجھ رہی تھیں۔

"اماں! یہ سب آپ نے کیا ہے؟ کس قدر صاف شفاف گھر لگ رہا ہے آج۔ کیسے کرلیا آپ نے؟"

"ارے بیٹا! میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم کہاں کہ ایک ہی دن میں یہ سب کرلوں۔"

"تو پھر کس نے کیا یہ سب کچھ؟" عقیل نے حیرانی سے پوچھا۔

"میری بیٹی نے۔" اماں نے فخریہ انداز میں کہا۔

"کیا نبیلہ آپی آئی ہیں؟ کہاں ہیں وہ؟ نبیلہ آپی، نبیلہ آپی!" وہ زور سے آوازیں دینے لگا۔

"ارے نہیں! نبیلہ نہیں آئی۔ میری دوسری بیٹی نے۔ نبیلہ تو جن کی بیٹی تھی وہ لے گئے۔ یہ سب تو میری اصل بیٹی نے کیا ہے۔"

"اصل بیٹی؟" عقیل کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔

"بتاتی ہوں، بلکہ دکھاتی ہوں۔ باہر آجاؤ بھئی اب۔"

اماں نے اس کے کمرے کی طرف منہ کرکے آواز دی۔ ٹھک کی آواز سے دروازہ کھلا اور مائرہ سامنے کھڑی تھی۔ عقیل نے دیکھا کہ آج وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ اس نے اس کی پسند کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ محبت سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گوکہ اس کی مسکراہٹ دل کو پگھلا دینے والی تھی، مگر عقیل کے دل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔

"تم؟ تم کب آئیں؟ کون لینے گیا تھا تمہیں؟" وہ بے زاری سے بولا۔

"میں لے کر آئی ہوں اسے۔" اماں نے مائرہ کی طرف سے جواب دیا۔

"کیوں گئی تھیں آپ اس کو لینے؟ کس نے کہا تھا آپ کو جانے کو، جب میں نے منع کیا تھا؟"

"ضرورت تھی، اسی لیے گئی تھی۔ نہیں دیکھ سکتی تھی میں اپنے بیٹے کا اجڑا ہوا گھر۔"

"تو کیا اب بس جائے گا آپ کے بیٹے کا گھر؟ کیا اب یہ سونے کی بن گئی ہے یا آپ بدل گئی ہیں؟ کیا ضرورت تھی اس کے گھر والوں کے سامنے اس کی منتیں کرکے لانے کی؟ خود آتی تو اسے ہمیشہ یہ احساس رہتا کہ گھر سے نکلنے سے پہلے ہزار دفعہ سوچنا چاہیے کہ اس گھر کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لیے بند بھی ہوسکتے ہیں۔"

عقیل غصے میں بولتا گیا۔ اس سے پہلے کہ اماں کچھ کہتیں، مائرہ بول پڑی۔

"عقیل! اگر آج اماں مجھے لینے نہ جاتیں تو شام تک ابا مجھے ضرور یہاں چھوڑ جاتے۔ یہ تو اماں کا بڑا پن تھا، جو وہ مجھے لینے چلی گئیں اور انہوں نے میری سب گھر والوں کے سامنے عزت رکھ لی۔ میری نظر میں ان کی عزت اور قدر اور بڑھ گئی۔ گھر سے نکل کر میں بہت پچھتائی ہوں۔ لیکن اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ سو میرا ایک دفعہ گھر چھوڑ کر جانا، ہمیشہ کے لیے واپس آنے کے لیے ضروری تھا۔ میں اگر اب اس گھر میں واپس آئی ہوں تو میری نیت اس گھر کو بسانے کی ہے۔ میرا وعدہ ہے آپ سے میں اب آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ آپ پلیز! مجھے ایک دفعہ معاف کردیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"دیکھو عقیل بیٹا! صبح کا بھولا اگر شام کو واپس آجائے تو اس کو بھولا نہیں کہتے۔ ہم دونوں سے ہی کچھ غلطیاں اور کوتاہیاں ہوئی ہیں، مگر ہمیں اب اپنی غلطیوں کا احساس ہوگیا ہے تو تم بھی سب باتیں بھول کر نئی زندگی کا آغاز کرو۔" مائرہ مسلسل روئے جارہی تھی۔

"اچھا! تم رونا تو بند کرو۔" عقیل اس کے آنسوؤں سے گھبرا گیا۔

"اماں! چپ کروائیں نا اسے۔ اسے کہیں میں نے اسے معاف کردیا ہے۔ اب یہ رونا دھونا بند کرے۔" عقیل کو مائرہ کے رونے سے الجھن ہو رہی تھی۔ اماں نے آگے بڑھ کر مائرہ کو گلے سے لگالیا۔

"بھئی! مجھے تو بہت زوروں کی بھوک لگی ہے۔ کیا کچھ کھانے کو بھی ملے گا یا صرف آج باتوں پر ہی گزارہ کرنا ہے؟"

"آپ نہا کر فریش ہوجائیں۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔"

مائرہ آنسو پونچھ کر بولی اور الماری سے عقیل کا کلف لگا سوٹ جو اس نے تھوڑی دیر پہلے بڑے پیار سے استری کرکے رکھا تھا، نکال لائی۔

"واہ بھئی! آج تو بڑا خیال رکھا جارہا ہے ہماری پسند کی چیزوں کا۔" عقیل کا اشارہ اس کے کلف لگے سوٹ کے ساتھ ساتھ مائرہ کے پہنے ہوئے سوٹ کی طرف بھی تھا، جو وہ اپنی پسند سے لایا تھا۔

مائرہ اس کی بات کا مطلب سمجھ کر مسکرادی۔

"چلیں! اب جلدی کریں۔ کھانا ٹھنڈا ہوجائے گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ کچن کی طرف چلی گئی۔

عقیل کے نہا کر نکلنے تک مائرہ نے کھانا لگادیا۔

کھانے کی ٹیبل پر عقیل کو محبتوں کا ایک اور جھٹکا لگا۔ اس کی پسند کی ڈشز کا خیال رکھا گیا تھا۔ بریانی کے ساتھ آلو کا رائتہ اور میٹھے میں ٹھنڈا ٹھنڈا شیر خرما۔ سب نے مل کر کھانا شروع کیا۔ اماں نے نوٹ کیا کہ آج وہ بڑے دنوں بعد اس طرح کھل کر ہنس رہا تھا، ورنہ مائرہ کے جانے کے بعد تو اس کو ایک چپ سی لگ گئی تھی اور گم صم سا رہنے لگا تھا۔

وہ بار بار کبھی اماں کو چھیڑتا اور کبھی مائرہ سے کوئی شرارت کرتا۔ آج خلاف توقع اماں کو بریانی میں بھی کوئی خامی نہ نظر آئی، کیونکہ کچھ تو اس میں مائرہ کا خلوص شامل تھا اور کچھ اماں کے اندر بھی محبتوں کی چاشنی اتر آئی تھی، اس لیے آج سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔

"اماں! آج بریانی کیسی ہے؟" عقیل کو شرارت سوجھی، کیونکہ جب بھی گھر میں بریانی بنتی تھی، اماں یہ کہہ کر مائرہ کا دل جلاتیں کہ تمہارے ہاتھ میں نبیلہ والی لذت نہیں ہے۔

"بہت اچھی ہے۔" اماں اس کی شرارت سمجھ گئیں۔

"بالکل نبیلہ باجی کی بریانی جیسی؟" عقیل فوراً بولا۔

"نہیں! اس سے اچھی۔ وہ کریاں والی ہر دفعہ گھی زیادہ ڈال دیتی تھی۔ میں ہزار دفعہ کہتی، مگر مجال ہے جو اس پر اثر ہوتا۔"

عقیل ہنس پڑا۔ مائرہ اور اماں سے بھی ضبط نہ ہوسکا۔ تھوڑا سا دل بڑا کرنے سے خوشیوں نے ان کے گھر کا راستہ دیکھ لیا تھا۔

ایلیا یقین

میرے دوست سالار، شبیر اور عون سب ہی اپنے گھر والوں کے ساتھ "تقریباً" خوش ہیں۔ لیکن میری زندگی کے عذاب کی وجوہات کچھ عرصہ پہلے تک میرے لیے نامعلوم ہی تھیں۔ میں نے رویوں پر غور کرنا اب شروع کیا ہے۔

میری آنکھیں کھلیں تو پتا چلا کہ امی کو تنقید اور واویلا کرنے کی بری عادت ہے۔ انہیں ذرا' ذرا سی بات کو بڑے مسئلے کی شکل دینا آتا ہے' چاہے وہ برتن کو مقررہ جگہ سے دو انچ ادھر رکھنے کی بات ہو یا بہو اپنی مرضی کا سوٹ پہن لے۔ نگہت بدلحاظ بھی ہے اور چغل خور بھی۔ سیما جب آتی ہے تو وہ رو' رو کر الگ واویلا مچاتی ہے۔ اسے عروبہ اور سجاد کے لیے ہر وہ چیز چاہیے ہوتی ہے جو عبید کے پاس ہو اور نغمہ کو یہ سب باتیں گراں گزرتی ہیں۔ وہ ایک روایتی لڑکی ہے جو اپنے بچے کی چیزیں کسی کو لیتے نہیں دیکھ سکتی اور اپنے شوہر کے تندو تیز لہجے پر دل مسوس کر رہ جاتی ہے۔

میں نے پچھلی لڑائیوں کی فلم ذہن میں چلائی تو زیادہ تر وہ خاموشی میں پناہ گزین نظر آئی۔ اس میں اتنا حوصلہ نہیں کہ وہ امی کی باتوں کا جواب دے سکے۔ سو وہ ہار جاتی ہے اور رونے لگتی ہے۔

☼ ☼ ☼

میں شام میں گھر جانے سے پہلے اپنی سسرال گیا کہ نغمہ کو لے لوں۔ میری ساس کا موڈ بہت آف تھا اور نغمہ الجھی بیٹھی تھی۔ انہوں نے نغمہ کو منظر سے ہٹا کر امی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ آخر سترہ دن تک ان کی بیٹی کیوں میکے میں بیٹھی رہی ہے۔ اس کی کیا غلطی ہے' انہیں بھی تو پتا چلے۔

میں نے معذرت کرکے ٹالنے کی کوشش کی تو ان کی آنکھیں بھیگ گئیں کہ انہوں نے اپنے جگر کا ٹکڑا کاٹ کر مجھے دیا ہے اور وہ مجھے میرے ماں' باپ سے الگ ہونے کا مشورہ دے کر خود کو گناہ گار نہیں کرنا چاہتی' لیکن ان کی بیٹی بھی انسان ہے۔ اسے انسانوں والے سلوک کا مستحق کیوں نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی صحت کیوں خراب ہو رہی ہے۔ وہ فون پر ان سے بات کیوں نہیں کرتی؟ میں سترہ دن بعد کیوں آیا ہوں' پہلے کیوں نہیں آیا' وغیرہ وغیرہ۔

میں نے بہت ہی مشکل سے انہیں راضی کیا اور نغمہ کو ساتھ لے آیا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ ہی جھگڑے دوبارہ شروع ہوتے' میں نے روایتی مرد بننا شروع کر دیا۔ پہلے پہل تو امی نے مجھے زن مریدی اور جورو کی غلامی کے طعنے دے کر میرا بائیکاٹ کر دیا۔ میں نے اسی میں عافیت جانی' لیکن پھر اس کا نزلہ نغمہ پر گرنے لگا۔ میں نے پھر بھی توجہ نہ دی۔ گھر میں ہر وقت ہنگامہ رہنے لگا۔ میرے آتے ہی شور مچتا۔ بیٹی اور بہو کا موازنہ با آواز بلند ہوتا۔ مگر میں کان نہ دھرتا۔ کمرے سے باہر میں بہرا بنا رہتا۔ نہ امی کی سنتا' نہ نغمہ کی۔

مجھے سالار کی طرف سے ایسا ہی کرنے کا حکم تھا۔ بابا کو میں پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ میں دونوں طرف سے سخت عاجز ہوں۔ سو انہوں نے مجھے کسی موقع پر بھی امی کی

نے پر مجبور نہیں کیا۔

ایک روز میں گھر آیا تو امی نغمہ پر برس رہی تھیں اور نگہت رو رہی تھی۔ شاید نغمہ نے نگہت کی کسی بات پر کوئی تیکھا جواب دے دیا تھا اور امی نگہت کے دفاع میں اس پر انتقامی حملوں میں مصروف تھیں۔

میں نظر بچا کر موقع سے غائب ہونے لگا۔ مگر امی نے مجھے دیکھتے ہی گھسیٹ لیا۔

میری بیوی نے ان کی بیٹی کو چغل خور کہا تھا۔

جی تو چاہا کہہ دوں' اس میں غلط کیا ہے؟ اور سسرال جا کر بھی یہ ہی حرکتیں کرے گی تو آپ وہاں بھی لڑنے جائیں گی؟

☼ ☼ ☼

"عذرا! میں خولہ سرفراز بات کر رہی ہوں۔ حیدر آباد سے۔"

اس نے بے حد رسمی انداز میں تعارف کرایا' اپنے شوہر کے نام کے ساتھ۔ وہ یقیناً "بہت وفادار بیوی

تھی۔ اس نے استدعا کی کہ میں نغمہ کو گھر لے آؤں۔ میں نے ہمیشہ کی طرح اس کی یہ بات ماننے کی بھی ہامی بھرلی۔

سچ تو یہ ہے کہ زندگی بڑی تلخ ہے۔ پہلے کمپنی میں کام کرو' پھر گھر جا کر امی اور نگہت کی باتیں سنو اور اس کے بعد نغمہ کے آنسو اور سسکیاں۔

ہر ہفتے دھواں دار لڑائی' جس کے بعد ظاہر ہے چھٹی کا پورا دن شدید سرد جنگ کا ماحول رہتا ہے۔ سونے پہ سہاگہ اس وقت ہو جاتا ہے' جب سیما بھی آجاتی ہے۔ سیما آجائے تو پھر جنگ نئے رخ اختیار کرلیتی ہے۔

گھر میں میرے علاوہ بابا ہیں' امی' نغمہ اور نگہت ہیں' سیما اور صدف کی شادی ہو چکی ہے اور میں اکلوتا بھائی اور اکلوتا بیٹا — ہوں۔ گھر میں جھگڑوں کا سبب امی' نگہت اور سیما کی متفقہ رائے میں نغمہ ہے۔ صدف جھگڑوں سے دور رہتی ہے' میں پسا ہوا اور بابا عاجز۔

پچھلے ہفتے ہونے والی لڑائی کے بعد نغمہ نے مجھ سے کہا کہ اسے میکے جانا ہے۔ امی نے بھی مجھے مجبور کرنا شروع کردیا کہ اسے "فوراً" چھوڑ آؤں۔ وہ عبید کو لے کر جانے لگی تو امی نے اسے روک لیا اور نغمہ کو زبردستی اکیلے بھجوا دیا۔

وہ دن ہے اور آج کا دن' پچیس دن بعد بھی میں اسے نہیں لاسکا۔ پہلے تو امی نے مجھے سختی سے منع کردیا کہ وہ اب یہاں نہیں آئے گی' پھر میری کم ہمتی — پھر خولہ سرفراز آگئی۔ وہ چند دن رہی۔ اس کے بعد میرا جی چاہا کہ گھر کی روزانہ کی چخ چخ سے بہتر ہے کہ وہ وہیں رہے۔

میری بے حسی اور بزدلی!

"آخر تم نے مجھے کیوں ٹھکرایا؟"

میں نے پچھلے کئی برس کے شکوے کو لفظوں کی شکل دی۔ وہ نہایت اطمینان سے ڈیش بورڈ پر کینو کے چھلکے رکھ کر پھانکیں الگ الگ کرکے صائم کے منہ میں ڈالتی جارہی تھی۔ چند لمحے اور گاڑی کچھ آگے سرکی تو اس نے سر کو معمولی سا اونچا کیا اور سناٹے بھرے لہجے میں گویا ہوئی۔

"اس لیے کہ نغمہ آج اپنے میکے میں بیٹھی ہے۔"

وہ طنز کررہی تھی یا نہیں' میں سمجھ نہیں سکا۔

"مگر وہ نغمہ ہے' تم تو نہیں ہو نا۔" مجھے بھی ذلیل ہونے کا شوق چرایا تھا۔

"بیوی ہی ہے نا تمہاری۔" اب کے وہ جھجک گئی۔

"اور میں تمہاری ماں' بہنوں کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں' ساتھ ساتھ تمہیں بھی۔" اس نے دعوا جڑ دیا۔

میں چونک کر اسے دیکھنے لگا کہ اسے کیسے معلوم تھا کہ نغمہ اور میری ماں' بہنوں میں کوئی بات ہوئی ہے اور آخر وہ میری ماں' بہنوں کو کتنا اور کیسے جانتی ہے۔

پھر تمام راستہ خاموشی رہی۔

گھر پہنچنے کے بعد میں بابا کو اسپتال لے گیا۔ شام کو وہ پھوپھو کے گھر چلی گئی۔

دو دن بعد کھڑے کھڑے الوداع کہنے آئی اور حیدر آباد روانہ ہو گئی اور میں' ہمیشہ کی طرح اپنی قسمت پر افسوس کرتا رہ گیا کہ آخر وہ میرا نصیب کیوں نہیں۔

☆ ☆ ☆

تین دن بعد ہی ایک انجانے نمبر سے اس کی کال آگئی' حالانکہ میرے اظہار محبت کے بعد اس کا گریز اتنا شدید ہو گیا تھا کہ وہ کبھی مجھ سے بات کرنا تو درکنار' میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرتی' جبکہ ہم نے بچپن ساتھ کھیل کر گزارا تھا۔ تب میں ٹین ایجرز کی طرح مجنوں بن کر اس کے التفات کے لیے آگے پیچھے پھرا کرتا تھا۔

ہاں تو اس کی کال آگئی۔ مگر میں چپ رہا' کیونکہ پلان یہ ہی تھا۔

جب امی بول چکیں تو نگہت کی سسکیاں بلند ہو گئیں۔ میں نے نوٹس نہ لیا۔ امی نے پھر مجھے بے غیرت کہہ کر غیرت دلانے کی کوشش کی تو میں نے کہا۔

"میں کیا کروں؟ آپ ہی نے اسے پسند کیا تھا۔ اب کوئی لو میرج تو ہے نہیں' جو مجھے ذمے دار ٹھہرایا جائے۔ مجھے کیا معلوم آپ لوگ کیا کرتے ہیں سارا دن' میں تو نہیں دیکھتا ناں۔"

"تمہاری بیوی ہے' تمہاری شہہ پر ہی زبان چلاتی ہے۔ تمہیں تو خون کے رشتوں کا' ماں' بہن کا درد نہیں۔"

اب کے امی نے گلوگیر آواز میں مجھے کوسنا شروع کردیا۔

"میں نہ اسے کچھ کہوں گا' نہ آپ کو۔ اپنی لڑائیاں خود لڑیں' مجھے بیچ میں نہ گھسیٹیں۔" میں نے طیش میں آتے ہوئے آواز کو اونچا کیا۔

"ورنہ اب میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ نغمہ کو بھی اس کی امی کے گھر چھوڑ دوں گا — اور جب میں ادھر رہوں گا ہی نہیں' یہ گھر مجھے سکون نہیں دے سکتا تو میں خرچہ بھی نہیں دوں گا۔ نغمہ اور عبید کا خرچ اسے دوں گا۔ کیونکہ بیوی شوہر کی ذمہ داری ہوتی ہے۔"

امی کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ میری آخری بات نہیں سن سکیں' کیونکہ میری دھمکی سے ان کو جھٹکا لگا۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز چھٹی کا دن تھا۔ واش بیسن کے سامنے کھڑے برش کرتے ہوئے میں نے سنا کہ امی چپکے چپکے نگہت سے کہہ رہی تھیں۔

"وہ کلموہی خولہ ہی یہ سب کچھ کرکے گئی ہے۔ اسی کو بڑا شوق آرہا تھا بھابھی سے ملنے کا۔ عبید پر اسے ہی ترس آرہا تھا۔ ہمیشہ سے عادت ہے اسے اور اس کی ماں کو (پھوپھو کو) دوسروں کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی۔ یہ عذیر اسی سے شادی کرلیتا ناں تو میں مزا چکھا دیتی اسے۔"

امی کے لہجے میں بڑا ہی تنفر تھا۔ میرے اندر دکھ اور شکر ساتھ ہی گھل رہا تھا۔ ٹوتھ پیسٹ کا جھاگ حلق کے اندر چلا گیا' کیونکہ میں اتنا نہیں جانتا تھا۔

سالار نے ٹھیک کہا تھا کہ بہت کم عورتیں ہی رشتوں کے معاملے میں کھلے دل کی ہوتی ہیں۔ وہ امی جو خولہ کے سامنے ہر وقت "خولہ' خولہ" کرتی رہتی تھیں۔ اب کتنے آرام سے اس کے خلاف بول رہی تھیں۔

خولہ نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ میری ماں' بہنوں کو جانتی ہے۔ یقیناً" آٹھ برس پہلے خولہ اگر یہ سب کچھ مجھ سے کہتی تو میں کبھی تسلیم نہ کرتا' کیونکہ تب امی میرا آئیڈیل تھیں۔ اس نے یقیناً" بہترین فیصلہ کیا جو مجھے ٹھکرا دیا۔ اگرچہ وہ میری محبت —

میں بھی تو کانوں کا کچا ہوں' جو پہلے امی' نگہت اور سیما کی باتوں میں آکر نغمہ سے بازپرس کرنے لگتا تھا۔ خولہ ہی تھی جس نے مجھ پر ثابت کیا کہ میں دنیا میں انسانوں کی بنائی ہوئی جہنم میں رہتا ہوں اور وہ اس میں نہیں آنا چاہتی تھی۔

جب میں نے سالار سے یہ سارا معاملہ ڈسکس کیا تو اس نے مجھے اس جہنم سے آزادی کے گُر بتائے۔ میں جو خولہ کی نرم دلی اور مسکراہٹ کی وجہ سے اس سے متاثر رہتا تھا' اب اس کی سمجھ داری کی وجہ سے بھی عزت کرنے لگا ہوں۔

یقین جانئے! زندگی کچھ سہل ہو گئی ہے۔ میری طرح کے بے وقوف مرد آنکھیں کھول کر اور (بھڑکانے والی باتوں سے) کان بند کرکے کسی حد تک صحیح غلط کا پتا لگا سکتے ہیں اور زبان کو بتیس دانتوں کی چار دیواری میں بند کرکے لبوں کو مقفل کرنے میں سچ مچ بڑی عافیت ہے۔

کیا خیال ہے آپ کا؟

☆

مکمل ناول

نگہت سیما

"میں نے اسے روتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے گھٹنوں کو چھوتے ہوئے۔۔۔ اور اس کی اوڑھنی اس کے دائیں کندھے پر جھول رہی تھی جس کا ایک سرا اس کے دائیں پاؤں کو چھو رہا تھا اور اس کی بے انتہا خوب صورت آنکھوں سے آنسو اتنی آہستگی سے بہہ رہے تھے جیسے کوئی سبک خرام ندی دھیمے دھیمے ایک تواتر سے بہے۔ اس کے رخساروں پر کنپٹی کے پاس ناک کے قریب ادھر ادھر آنسوؤں کے نشان تھے جیسے وہ ابھی روتے روتے چپ ہوئی ہو اور آنسوؤں کے نشان اس کے رخساروں پر رہ گئے ہوں۔ یوں جیسے کوئی ننھا بچہ اپنی میلی مٹھیوں سے اپنے آنسو پونچھے اور آنکھوں سے بہہ کر آنے والے سرمے یا کاجل کی وجہ سے رخساروں پر ملگجے سے نشان رہ جائیں۔۔۔

نہ جانے وہ کب روتے روتے چپ ہوئی تھی اور جانے کب اس نے پھر رونا شروع کیا تھا۔۔۔ آنسو تواتر سے اس کے میلے ملگجے رخساروں پر بہہ رہے تھے لیکن

میرا دھیان اس کے آنسوؤں کی طرف نہیں تھا۔ میں تو صرف اس کی آنکھیں دیکھ رہا تھا۔ اتنی حسین۔۔۔ اتنی نشیلی آنکھیں۔۔۔ شاید ساری دنیا کی عورتوں کی آنکھوں سے زیادہ حسین اور پتا نہیں کیوں میرے کانوں میں قانی کا قصیدہ گونج رہا تھا۔ قانی کا یہ قصیدہ مجھے ہمیشہ سے ہی پسند تھا۔ حالانکہ اس قصیدے کا اس کے آنسوؤں سے تو کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ تو کسی خوب صورت منظر کا بیان تھا لیکن شاید کوئی تعلق تھا۔۔۔

بنفشہ رستہ از زمین ز طرف جوئبارہا
وہا گستہ حور عین زلف خویش تارہا

(ندی کے کناروں پر بنفشہ اگا ہوا ہے یا خوب صورت آنکھوں والی حور نے اپنی زلفیں بکھیر دی ہیں)

"حور عین!"

میرے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا۔

حور عین۔۔۔ خوب صورت آنکھوں والی حور۔

ہاں شاید میں یہی یاد کر رہا تھا۔ یہی تعلق تھا اس قصیدے کا اس سے۔

میں بے ساختہ ایک قدم اس کی طرف بڑھا تھا۔ اس نے چونک کر ایک ناراض نظر مجھ پر ڈالی تھی۔ شاید اس کے انہماک میں فرق پڑا تھا' پھر وہ یوں ہی ناراضی سے مجھے دیکھتے ہوئے چلی گئی۔ اس کی اوڑھنی اس کے پاؤں میں الجھ رہی تھی۔

"حور عین!"

میں اس کے پیچھے لپکا اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔!"

ہمدان مصطفیٰ نے قہقہہ لگایا۔

جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے ایبک فلک شاہ نے ایک لاپروا نظر اس پر ڈالی اور اسی بے نیازی سے حاضرین مجلس کی طرف توجہ دیے بغیر دوبارہ بولا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن اس سے پہلے اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور کہا تھا۔۔۔

"میں۔۔۔ حور عین نہیں زمن ہوں۔ زمن' دھرتی۔ زمین۔۔۔"

عاشی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی بے ساختہ ہنسی کو روکا۔

زمین۔۔۔ یعنی آسمان کی اپوزٹ (متضاد) مگر زمین تو اتنی خوب صورت نہیں ہوتی مونی آپا! اور وہ بھلا کوئی انسان ہوتی ہے کہ روئے اور پھر یہ زمین۔۔۔ یہ ہماری زمین۔۔۔ کتنی گندی ہے' کوڑے کرکٹ کے ڈھیر' کچرا' الابلا سب کچھ تو لوگ اس پر پھینکتے ہیں۔"

اس نے منیبہ شاہ کے کانوں میں سرگوشی کی اور اسی طرح اتنی ہی مدھم آواز میں رابیل نے اریب فاطمہ کے کان میں کہا۔

"یہ اس کا پرانا طریقہ ہے۔ یوں ہی سسپنس کری ایٹ کر کے سب کو اپنی طرف متوجہ کرنا۔"

"مگر کیا اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ایسے کسی ڈرامے کی ضرورت ہے۔ وہ تو خود ہی سب کی توجہ کھینچ لیتا ہے۔" اریب فاطمہ نے چوری چوری دیکھا۔ اپنے رف حلیے میں بھی وہ سب سے منفرد اور شان دار لگ رہا تھا۔

"کیا یہ کسی نئی کہانی کا پلاٹ ہے؟" عمر احسان نے اس کی طرف مٹھی بھر چلغوزے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"نئی کہانی۔۔۔" اس کی آنکھیں یکایک چمک اٹھیں۔

"اس کی آنکھیں کتنی لَو دیتی ہیں۔" اریب فاطمہ نے پھر چپکے چپکے اسے دیکھا۔

"ہاں! نئی کہانی کا پلاٹ تو نہیں' آغاز ضرور ہو سکتا ہے۔" اس کے اندر جیسے لفظ بننے اور بگڑنے لگے۔

"حور عین کے آنسو۔۔۔ نہیں' زمین کے آنسو۔۔۔" عنوان خود بخود ہی تشکیل ہو گیا تھا۔

"تھینکس عمر!" اس نے مٹھی میں دبے چلغوزے منہ میں ڈالے۔

"اور یہ عمر۔۔۔" رابیل نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"اسے پتا نہیں کیا شوق ہے' اس ایبک فلک شاہ کی خدمتیں کرنے کا اور یہ جو اتنی دیر سے چلغوزے چھیل چھیل کر مٹھی میں رکھ رہا تھا۔ یہ اس ڈرامے باز ایبک شاہ کے لیے تھے۔ حالانکہ اس گھونچو کو پتا بھی ہے کہ مجھے یعنی اس کی پیاری آپی رابیل احسان کو چلغوزے چھیلنے سے کتنی کوفت ہوتی ہے۔ جبکہ چلغوزے مجھے بہت پسند ہیں۔"

اس نے آدھی بات سوچی تھی اور آدھی منیبہ شاہ کے کندھے پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے اس کے کان میں انڈیلی تھی اور پھر پتا نہیں اس کی سماعتیں ہی اتنی تیز تھیں یا پھر وہ کوئی جادوگر تھا۔ دلوں کا بھید جاننے والا کہ اس نے باقی بچے ہوئے چلغوزے جھک کر رابیل کا ہاتھ پکڑ کر اس کی مٹھی میں منتقل کر دیے۔

"یہ لیجیے رابیل جی! اتنی محنت سے چھیلے گئے ان چلغوزوں پر آپ کا بھی تو حق بنتا ہے کچھ۔ آخر آپ کے پیارے بھائی نے چھیلے ہیں۔"

اور رابیل کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا تھا۔

"میں خیرات نہیں لیتی۔"

اس نے ایبک کا ہاتھ جھٹک کر چلغوزے کارپٹ پر

جھٹکے اور کھڑے ہوتے ہوئے ایک حقارت بھری نظر ایبک فلک شاہ پر ڈالی پھر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

ایبک نے نہ سمجھنے والے انداز میں کندھے اچکائے تو عمر نے خجالت سے ایبک شاہ کو دیکھا۔

"یہ رابی آپی بھی یوں ہی کبھی کبھی بلاوجہ۔۔۔"

باقی کا جملہ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر چپ ہو گیا تھا۔ حالانکہ یہ بات تو سب ہی جانتے تھے کہ رابیل احسان کبھی کبھی نہیں بلکہ ہمیشہ ہی ایبک فلک شاہ کو دیکھ کر ایسا ہی کوئی نہ کوئی رد عمل ظاہر کرتی ہے۔ پتا نہیں اسے ایبک کی کس بات سے چڑ تھی۔ اس کی شان دار شخصیت سے۔ اس کی بے نیازی سے۔ اس کی ذہانت اور شہرت سے' یا پھر اس کا عمارہ پھپھو کا بیٹا ہونا۔ عمارہ پھپھو جن سے بیگم احسان کی کبھی نہیں بنی تھی اور شاید وہی نفرت جو انہیں عمارہ پھپھو سے تھی' انہوں نے اپنی لاڈلی بیٹی میں بھی منتقل کر دی تھی۔

"پتا نہیں چچی جان کو عمارہ پھپھو سے اتنی چڑ کیوں تھی کہ انہوں نے ہمیشہ ہی ان کا ذکر بڑی نفرت اور حقارت سے کیا تھا۔"

منیبہ شاہ نے ایک نظر ایبک فلک شاہ کو دیکھتے ہوئے سوچا' جو عاشی کو کارپٹ پر گرے چلغوزے چن چن کر دے رہا تھا اور وہ منہ میں ڈالتی جا رہی تھی۔ ایبک ہمدان مصطفیٰ سے پوچھنے لگا۔

"تو پھر آج رات پروفیسر صاحب کے ہاں چل رہے ہو؟"

"آج رات؟" ہمدان مصطفیٰ نے لحہ بھر سوچا اور پھر پوچھا۔ "تو کیا آج رات تم یہاں "المریان" میں رکو گے؟"

"ہاں اگر تمہارا رات کا پروگرام ہو' جانے کا تو رک جاتا ہوں' ورنہ چلوں گا۔"

وہ ہمدان مصطفیٰ سے ہمکلام تھا' جبکہ اریب فاطمہ نے کئی بار نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"شاید آج رات میں نہ جا سکوں گا' بلکہ یقینا" نہیں۔"

ہمدان مصطفیٰ کو اچانک یاد آیا کہ آج رات تو رابیل احسان کی سالگرہ کی خوشی میں سب نے باہر ڈنر کرنا تھا اور یہ "المریان" کی پرانی روایت تھی کہ سب کے یوم پیدائش پر بابا جان کی طرف سے ایک زبردست ساڈنر ہوتا تھا لیکن کچھ عرصہ سے اس روایت میں اتنی تبدیلی آئی تھی کہ اب یہ کھانا باہر کھایا جاتا تھا۔

"تم بھی چلو نا ایبک!" منیبہ شاہ کو اخلاق نبھانے آتے تھے۔

"میں؟" وہ مسکرایا اور مڑ کر منیبہ شاہ کی طرف جتاتی نظروں سے دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو' کیا تم رابیل احسان کو نہیں جانتیں اور منیبہ اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر یک دم بولی۔

"یہ ڈنر تو بابا جان کی طرف سے ہے اور "المریان" میں جب بھی کسی کا برتھ ڈے ہو تو بابا جان ہی ڈنر دیتے ہیں۔"

اسے "المریان" میں آتے دن ہی کتنے ہوئے تھے سو منیبہ نے اسے بتانا ضروری سمجھا۔ وہ یہاں کی بہت سی باتوں سے لاعلم تھا اور عموما" منیبہ ہی اسے اطلاعات فراہم کیا کرتی تھی۔

"او ہاں! بابا جان کی طبیعت اب کیسی ہے؟" اسے یاد آیا کہ پچھلی بار جب وہ آیا تھا تو بابا جان کی طبیعت خراب تھی۔

"اب تو ٹھیک ہیں۔" جواب عمر نے دیا۔ "پاپا کے ساتھ کسی کے ہاں تعزیت کے لیے گئے ہیں۔"

"اوکے۔۔۔ تو پھر میں چلتا ہوں۔"

وہ اس گھر میں صرف انہی کی خاطر تو آتا تھا۔ صرف ان سے ملنے۔ انہیں دیکھنے کہ یہ اس کی ماں کی خواہش تھی۔ وہ جب بھی لاہور آتا' اماں اپنی آنکھیں جیسے اس کے ہمراہ کر دیتی تھیں اور وہ ان کی آنکھوں سے بابا جان کو دیکھتا تھا اور جب واپس بہاول پور جاتا تو ان کی نظریں بار بار اس کے چہرے کا طواف کرتی تھیں۔ شاید انہیں تسلی ہوتی تھی کہ انہوں نے نہیں تو ان کے بیٹے نے تو انہیں دیکھا ہے۔

پہلی بار وہ ہمدان مصطفیٰ کے ساتھ آیا تھا۔ اس گھر

میں ہمدان مصطفیٰ ہی وہ واحد شخص تھا جو کبھی کبھار بہاول پور ان سے ملنے آتا تھا اور پچیس سال کی عمر تک اس نے سوائے ہمدان مصطفیٰ کے اپنے کسی ننھیالی رشتہ دار کو نہیں دیکھا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ "الریان" میں رہنے والے سب افراد کی رائے اس کے متعلق مختلف ہے۔ کچھ اسے پسند کرتے ہیں اور کچھ ناپسند' لیکن اپنی ناپسندیدگی کا اظہار رابیل احسان کے سوا کسی نے نہیں کیا تھا اسے رابیل احسان کی اس واضح ناپسندیدگی کی وجہ کبھی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور اس نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ اس کے پاس کرنے کو اور بہت کام تھے۔

"پھر کب آؤ گے؟" ہمدان مصطفیٰ ساتھ ہی کھڑا ہوگیا۔

"پتا نہیں' کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اگر وقت ملا تو جانے سے پہلے بابا جان سے ملنے آؤں گا۔"

"ایبک بھائی! آپ کتنے دن یہاں ٹھہریں گے؟" عمر احسان اسے بہت پسند کرتا تھا۔

"شاید تین' چار روز۔"

"تو پھر آپ ادھر ہی کیوں نہیں رہ جاتے۔"

"نہیں یار۔۔۔!" ایبک نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "مجھے کچھ کام ہیں۔"

"تو کیا میں آپ سے ملنے آسکتا ہوں۔"

"کیوں نہیں یار!"

"آپ وہیں ٹھہریں گے نا کرنل شیردل کے گھر؟" ایبک نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"یہ آپ کے بھی تو نانا ابا کا گھر ہے نا پھر آپ کو ادھر رہنا اچھا کیوں نہیں لگتا؟" عاشی معصومیت سے سر اٹھائے پوچھ رہی تھی۔

"جہاں آپ جیسی پیاری سی گڑیا رہتی ہو' وہاں رہنا بھلا ہمیں اچھا کیوں نہیں لگے گا۔" ایبک نے جھک کر اس کے رخساروں کو دو انگلیوں سے چھوا۔

"میں پیاری ہوں؟" اس کی نیلی آنکھیں جگمگانے لگیں۔

"بالکل۔۔۔" ایبک نے تائید کی۔

"لیکن زویا ماما تو کہتی ہیں کہ میں بدصورت بلا ہوں۔" اس کی نیلی جھیلیں یک دم پانیوں سے بھر گئیں۔

"جھوٹ بولتی ہیں آپ کی زویا ماما۔"

ایبک نے یک دم گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس کی پیشانی چومی۔

"ارے آپ تو "الریان" کی ساری لڑکیوں سے زیادہ حسین ہو بےبی!"

"سچ۔۔۔؟"

اس نے تائیدی نظروں سے پہلے ایبک اور پھر سب کی طرف دیکھا۔ سب نے ہی سرہلایا تھا۔ بھیگی آنکھیں پھر جھلملانے لگی تھیں۔ جیسے نیلے پانیوں میں کسی نے دیے جلا دیے ہوں۔

"ویسے مجھے خود بھی پتا تھا کہ میں "الریان" کی ساری لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت ہوں۔"

نو سالہ عاشی نے اتراتے ہوئے کہا تو ایبک اور ہمدان بے ساختہ ہنس دیے اور اریب فاطمہ مبہوت سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ اس نے اس طرح کھل کر ہنستے ہوئے ایبک کو پہلی بار دیکھا تھا۔ ایسی بے ساختہ ہنسی اس کے چہرے پر کتنی سجتی تھی۔

مگر "الریان" میں قیام کے ان چھ مہینوں میں صرف چار بار ہی تو اس نے اسے دیکھا تھا۔ ہاں ایک مبہم سی مسکراہٹ ضرور اس کے لبوں پر آجاتی تھی اور وہ ہر بار اس مسکراہٹ کے معنی ہی تلاش کرتی رہ جاتی تھی۔

ایبک کھڑا ہوگیا۔

"ویسے ایبک بھائی سے پہلے تمہیں یہ بات کس نے بتائی تھی عاشی!" عمر نے سرگوشی کی۔

"نانا ابو نے۔" وہ اترائی۔ "اور نانا ابو کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن رالی آپی کے سامنے یہ بات کبھی نہ کہنا' کیونکہ وہ خود کو "الریان" کی ساری لڑکیوں سے زیادہ حسین سمجھتی ہیں۔" عمر کی آنکھوں میں شرارت

تھی۔

ایبک لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ لیے مڑا تو اس کی نظریں اریب فاطمہ کی نظروں سے ٹکرائیں۔ اریب نے گھبرا کر نگاہیں جھکالیں۔ ایبک بے دھیانی میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے رخساروں پر سرخی بکھر گئی اور پیشانی پر پسینے کے چند ننھے ننھے قطرے نمودار ہوگئے تھے۔ وہ نگاہیں جھکائے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی اور اس کی بے حد لانبی پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔

ایبک کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ اس نے اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹالیں۔ لاؤنج سے باہر نکلتے ہوئے اس نے سوچا۔

"یہ لڑکی "الریان" کی ان ساری لڑکیوں کے درمیان یوں لگتی ہے' جیسے جنگل میں بھٹکی ہوئی کوئی سہمی سہمی سی ہرنی ہو۔ اس کی غزال آنکھوں میں ایسا ہی سہم ہے۔۔۔ غزال۔" اس نے زیرلب کہا۔

"نہیں حور عین۔۔۔ نہیں' اس کی آنکھیں تو بالکل۔۔۔" اس نے ہولے سے سرجھٹکا اور الریان سے باہر نکل گیا۔

"تم میں سے کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ اسے روک لیتے۔ وہ کوئی غیر تو نہیں' ہماری پھپھو کا بیٹا ہے' بابا جان کا نواسا ہے اور یہ ڈنر بابا جان کی طرف سے ہے۔"

اس کے لاؤنج سے نکلتے ہی سب کچھ نہ کچھ بولنے لگے تھے اور اس کے پیچھے جاتا ہمدان دروازے میں ہی رک گیا تھا۔

منیبہ کی آواز پر سب ہی خاموش ہوگئے تھے۔ وہ لاء کر رہی تھی اور اسے ناانصافی کے خلاف اور حقوق کی حمایت میں بولنے کا بے حد شوق تھا۔

"سوائے ہومی کے کسی نے اسے ڈنر کے متعلق بتایا تک نہیں۔"

اس کے لہجے سے تاسف جھلکنے لگا تھا۔ اسکول سے لے کر اب تک مختلف مقابلوں میں تقریریں اور مباحثے کر کر کے اسے الفاظ کے اتار چڑھاؤ اور لہجے پر دسترس حاصل تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے ہمارے کہنے سے وہ رک جاتا؟"
یہ حفصہ مصطفیٰ تھی، جو ہر طرف سے بے نیاز ڈرائی فروٹ کی ٹرے گود میں رکھے بہت انہماک سے کاجو کھا رہی تھی۔
"گڑیا جی! آپ کیوں اپنے کام میں خلل پیدا کر رہی ہیں۔ اپنا کام جاری رکھیں۔" زبیر بھی پہلی بار بولا تھا۔
"ویسے جس رفتار سے آپ ڈرائی فروٹ کھا رہی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنے والے دنوں میں بجلی، پانی اور کئی دوسری چیزوں کی طرح ڈرائی فروٹ بھی ناپید ہو جائے گا۔"
"ناپید ہو جائے گا نہیں بلکہ ناپید ہو چکا ہے غریبوں کے لیے۔" عادل عثمان نے عمر احسان کے کان میں سرگوشی کی تھی، جسے کسی نے نہیں سنا۔ حفصہ نے مٹھی بھر کاجو اٹھا کر ٹرے زبیر احسان کی طرف بڑھائی۔
"لو تم بھی کھا لو، دور بیٹھے کیوں کڑھ رہے ہو؟"
"میں کچھ کہہ رہی ہوں؟" منیبہ کو غصہ آ رہا تھا۔ کسی نے بھی اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔
"کیا ایبک فلک شاہ کو "الریان" کی تقریبات میں شامل ہونے کا حق نہیں ہے؟"
"مگر یہ تقریب "الریان" میں تو نہیں ہو رہی۔" حفصہ منمنائی۔
"مگر یہ تقریب "الریان" کی ہی ہے۔ "الریان" کی شہزادی رابیل احسان کی برتھ ڈے ہے آج۔"
منیبہ کو ایبک کے جانے کے بعد احساس ہوا تھا کہ انہوں نے بڑی بدتہذیبی کی، جبکہ تہذیب تو "الریان" کا ورثہ تھی۔ اکثر ایبک کے جانے کے بعد ہی کسی نہ کسی کو احساس ہوتا تھا کہ ایبک کے ساتھ "الریان" میں ناانصافی ہو جاتی ہے۔
"یہ ہمدان مصطفیٰ اس کا یار غار اور یہ عمر احسان اس کا فین۔ بقول اس کے چاند کا چکور۔۔۔" منیبہ کا موڈ تقریر کا بن چکا تھا اور وہ صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔
"یہ سراسر ناانصافی ہے کہ یہاں "الریان" میں ہم سب جو بابا جان کے پوتے، پوتیاں ہیں، آج رات ڈنر اڑائیں۔۔۔ جہاں سیکڑوں قسم کی ڈشنز ہوں اور ان کا اکلوتا نواسا کرنل شیر دل کی انیکسی میں بازار سے لائے نان چھولے کھا رہا ہو۔"
"بابا جان کا یہ اکلوتا نواسا ہم جیسے ہزاروں کو اس سے شاندار ڈنر کھلا سکتا ہے منیبہ بی بی!"
عمر احسان کو اس کی بات بالکل پسند نہیں آئی تھی کہ اس کی پسندیدہ ہستی کے متعلق کسی کو خصوصاً اریب فاطمہ کو یہ گمان گزرے کہ وہ کوئی غریب شخص ہے۔ سوائے اریب فاطمہ کے سب ہی جانتے تھے کہ ایبک فلک شاہ کوئی گیا گزرا بندہ نہیں ہے۔
"بہر حال یہ ناانصافی ہے۔"
منیبہ نے دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر صوفے کی پشت پر احتیاط سے مارا اور دروازے کے پاس کھڑے ہمدان مصطفیٰ کو یاد آیا کہ وہ تو ایبک کو گیٹ تک خدا حافظ کہنے جا رہا تھا۔ وہ تیزی سے مڑا اور اندر آتی مرینہ عثمان سے زور سے ٹکرایا۔ مرینہ نے بمشکل ناک سے پھسلتی عینک کو سنبھالتے ہوئے حیرت سے اسے دیکھا۔
"یہ ہمدان مصطفیٰ کو کیا ہو گیا ہے؟"
اس نے اونچی آواز میں سوچا اور اپنی ناک سہلاتے ہوئے باری باری سب کی طرف دیکھا لیکن شاید کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ہمدان مصطفیٰ اچانک باہر کی طرف کیوں بھاگا ہے۔ سب ہی اندازے لگا رہے تھے اور گیٹ سے باہر کھڑا ہمدان دور، دور تک سنسان سڑک کو مایوسی سے دیکھ رہا تھا، پھر تاسف سے سر ہلاتے ہوئے وہ واپس اندر کی طرف مڑا۔
اکثر ہی ایسا ہوتا تھا کہ کوئی نہ کوئی اسے باتوں میں الجھا لیتا تھا اور وہ جو ایبک فلک شاہ کو خاص مہمانوں کی سی اہمیت دیتے ہوئے گیٹ تک چھوڑنے کی چاہ ہوتی تھی، وہ یوں ہی رہ جاتی تھی۔
وہ سر جھکائے واپس لاؤنج میں آیا تو مرینہ ابھی تک کھڑی اپنی ناک سہلا رہی تھی۔ حفصہ، منیبہ کے کان میں گھسی کچھ کہہ رہی تھی اور عمر احسان اب چلغوزے چھیل چھیل کر عاشی کو دے رہا تھا۔ اسے

بچپن سے ہی سب کی خدمتیں کرنے کا شوق تھا۔ پتا نہیں یہ کس پر پڑا ہے۔ ہمدان نے سوچا اور تھکا تھکا سا صوفے پر بیٹھ گیا۔
"کیا ایبک شاہ تمہاری کوئی قیمتی چیز لے کر بھاگ گیا تھا۔" زبیر احسان نے آج تک کبھی ڈھنگ کی بات نہیں کی تھی۔
"بکو مت۔" پتا نہیں کیوں ہمدان کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ شاید اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے ایبک کو نہ روک کر اچھا نہیں کیا اور یہ منیبہ صحیح ہی تو کہتی ہے کہ مجھے اسے ڈنر تک رکنے کے لیے اصرار کرنا چاہیے تھا۔
"کیا ایبک آیا تھا؟" مرینہ کی آواز خاصی اونچی تھی۔
"اور تم لوگوں نے مجھے بتایا تک نہیں اور تم حفصہ! تمہیں تو پتا تھا نا کہ میں پچھلے تین ماہ سے کتنی شدت سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔" وہ حفصہ کے پاس ہی دھپ کر کے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔
"نہیں آیا تو تھا تمہارے خواب میں تمہیں بتانے، لیکن تم۔۔۔" زبیر نے احسان جتایا۔
"تم سارے اچھے کام خواب میں ہی کرتے ہو، کبھی جیتے جاگتے بھی کر لیا کرو۔" عمر نے چڑایا۔
"مجھے کتنا ضروری کام تھا ایبک سے۔" مرینہ کا دکھ کم نہیں ہو رہا تھا۔
"مثلاً" کیا کام؟" زبیر نے بھنویں اچکائیں۔
"وہ میری فرینڈز نے ملنا تھا اس سے اور میں۔۔۔"
"نہیں کیا کے۔ای میں لڑکوں کا کال پڑ گیا ہے؟" زبیر اچھلا۔
"بکو مت۔۔۔ ایک سے ایک لڑکا ہے وہاں، لیکن جب میں نے ایبک کا بتایا کہ وہ میرا کزن ہے تو ہائے۔۔۔! تمہیں کیا پتا وہ سب میرے پیچھے ہی پڑ گئیں کہ ہمیں ایبک سے ملواؤ اور وہ میرب تو ہر روز دعا مانگتی ہے کہ اللہ کرے ایبک جلد آئے اور وہ اس سے آٹو گراف لے سکے۔" مرینہ کو بہت تیز تیز بولنے کی عادت تھی۔
"پتا نہیں، یہ ایبک فلک شاہ کیا ہے، جو عمر احسان اس کی تعریفیں کرتا تھکتا نہیں۔۔۔ ہمدان اس کے لاہور آنے کا سن کر بے چین ہو کر اس سے ملنے بھاگتا ہے اور اب مرینہ اور اس کی فرینڈ۔۔۔" اریب فاطمہ نے سوچا۔
اسے یہاں "الریان" میں آئے صرف چھ ماہ ہوئے تھے اور ان چھ ماہ میں اسے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ ایبک عمارہ پھپھو کا بیٹا ہے، جو بہاول پور میں رہتی ہیں۔ برسوں پہلے بابا جان کسی بات پر فلک شاہ سے ناراض ہو گئے تھے اور فلک شاہ نے قسم کھائی تھی کہ وہ اور ان کی بیوی کبھی "الریان" میں نہیں آئیں گے اور یوں عمارہ پھپھو پھر کبھی "الریان" نہیں آئی تھیں اور اب اتنے برسوں بعد کوئی سال بھر پہلے ہمدان مصطفیٰ ایبک کو اپنے ساتھ الریان لایا تھا۔
اپنی ذاتی حیثیت میں وہ کیا تھا۔ کوئی شاعر، صحافی، ادیب، وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ ٹی وی نہیں دیکھتی تھی، کیونکہ ابا ٹی وی کے خلاف تھے۔ اخبار وغیرہ پڑھنے سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی اور یہاں "الریان" میں آ کر بھی اس نے ٹی وی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ یہاں سب کی محفل ٹی وی لاؤنج میں ہی لگتی تھی یا پھر لونگ روم میں۔۔۔ اس وقت بھی وہ سب ٹی وی لاؤنج میں تھے۔ اگرچہ ٹی وی آن نہیں تھا۔ عموماً جب سب ٹی وی دیکھ رہے ہوتے تو وہ اٹھ جاتی تھی۔
"اگر فلک مراد شاہ نے کوئی قسم کھائی تھی تو کیا اس کا کفارہ نہیں ہو سکتا تھا۔" اس نے سر جھٹک کر سب کی طرف دیکھا تو عمر بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔
"ہمدان! کیا ایسا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا کہ ایبک سلطان اپنا نام بدل کر کچھ اور رکھ لے؟"
"مگر کیوں؟"
ہمدان مصطفیٰ ابھی تک اس تاسف میں بیٹھا تھا کہ وہ آج بھی ایبک کو خاص مہمانوں والا پروٹوکول نہیں دے سکا۔
"بس میرا جی چاہتا ہے کہ ایبک نام صرف ایک ہی ہستی کا ہو۔۔۔ اور وہ صرف ایبک فلک شاہ ہو۔"
"عمر! تم کب بڑے ہو گے آخر۔" حفصہ نے

تاسف سے اسے دیکھا۔

عمر احسان اگر بڑا ہو بھی جاتا تب بھی ایبک شاہ کے ساتھ اس کی عقیدت کم نہیں ہونا تھی اور یہ بات حفصہ خود بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ کچھ اتنا ہی دیوانہ تھا وہ ایبک کا۔

"اوئے! تم لوگوں نے چائے پی لی؟"

تاسف سے سر ہلاتے ہلاتے اچانک ہی مرینہ کو خیال آیا تھا۔ وہ چائے کی بے حد رسیا تھی اور بقول منیبہ کے اس کے جسم میں خون کی جگہ چائے ہی دوڑ رہی تھی۔

"چائے... اوہ... ہاں چائے۔" منیبہ شاہ صوفے کے پیچھے سے ہٹ کر صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔

"کس قدر احمق ہو تم سب۔ یعنی ایک پورے چالیس منٹ یہاں کھڑا رہا اور تم میں سے کسی نے اسے چائے کے لیے بھی نہیں پوچھا۔ حد ہو گئی بد اخلاقی کی۔"

"یہ فریضہ تم بھی تو انجام دے سکتی تھیں۔"

حفصہ جانتی تھی کہ منیبہ صرف اسے ہی سنا رہی ہے کیونکہ الریان میں اگر کسی کو کچن سے دلچسپی تھی تو وہ صرف حفصہ ہی تھی۔

"میں... دراصل میں تو اتنی محو ہو گئی تھی اس کی اسٹوری میں کہ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔" منیبہ نے سر کھجایا۔

"اسٹوری... کیا ایبک نے کوئی اسٹوری سنائی تھی؟" مرینہ نے بے حد اشتیاق سے باری باری سب کو دیکھا اور ناک سے پھسلتی عینک کو سنبھالا۔

"فار گاڈ سیک... اب تم اسٹوری سنانے نہ بیٹھ جانا۔" زبیر نے ہاتھ جوڑے۔ "پانچ بج رہے ہیں حفصہ رانی! تم چائے پلواؤ اور پھر سب تیاری شروع کرو۔"

"کیسی تیاری؟" مرینہ پھر چونکی۔

"تمہیں تو اس میڈیکل کی تعلیم نے بالکل ہی بونگا کر دیا ہے رینا! آج رانی کا برتھ ڈے ہے۔" "پتا نہیں کیوں حفصہ نے چڑ کر کہا تھا۔

"لیکن ہمیں تو آٹھ بجے جانا ہے نا۔ بابا جان نے کہا تھا آٹھ بجے سے ایک منٹ لیٹ نہ ہوں۔"

"تو چائے پیتے پیتے چھ بج جائیں گے اور تم لوگ چھ بجے سے تیاری شروع کرو گی تب کہیں آٹھ بجے تک تیار ہونے کا چانس ہے۔" زبیر نے ٹرے میں پڑا آخری کاجو منہ میں ڈالا۔

"اب اتنی بھی غلط بیانی نہ کرو۔" حفصہ نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

"چلو یار! اب چائے تو پلواؤ۔" مرینہ نے آہستگی سے سر دبایا۔

"پڑھ پڑھ کے عینک تو لگ چکی ہے اب یہ سر کا درد بھی پال لیا ہے تم نے۔ آخر کیا ضرورت تھی میڈیکل میں جانے کی۔"

"ہاں ضرورت تو نہیں تھی بس..." مرینہ نے کسی قدر حیرت سے حفصہ کو دیکھا۔

"کسی دور میں تمہیں بھی جنون تھا ڈاکٹر بننے کا۔ یہ الگ بات کہ تم انٹری ٹیسٹ کلیر نہ کر سکیں۔"

حفصہ نظریں چرا کر باہر نکل گئی۔ یہ دکھ ہمیشہ کے لیے اس کے دل میں ثبت ہو گیا تھا کہ اتنی محنت کے باوجود وہ میڈیکل میں نہ جا سکی تھی اور مرینہ جس نے محض اس کا ساتھ نبھانے کے لیے ایف ایس سی میں بائیولوجی تھی اب کے ای کی اسٹوڈنٹ تھی۔

"شاید اسے ہی قسمت کہتے ہیں۔"

منیبہ نے اسے نظریں جھکائے جاتے دیکھا تو اٹھ کر کارپٹ پر پڑی پلیٹیں اور ڈرائی فروٹ ٹرے اٹھانے لگی اور عمر احسان نے کارپٹ پر پڑا ریموٹ اٹھا لیا۔ پھر سب ہی ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

رات بارش ٹوٹ کر برسی تھی اور یہ موسم سرما کی پہلی بارش تھی۔ ورنہ لگتا تھا جیسے نومبر کی طرح دسمبر بھی یوں ہی سوکھا سوکھا گزر جائے گا۔ لیکن دسمبر کے اس آخری ہفتے میں یہ بارش فلک شاہ کو خوش کر گئی

تھی۔

وہ بہت دیر سے اپنی وہیل چیئر پر بیٹھے کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ ان کے بیڈ روم کی اس کھڑکی سے باہر لان کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ صبح سے ہی وقفے وقفے سے ہلکی ہلکی پھوار برسنے لگتی تھی۔ پھول بوٹے درخت سب دھل کر نکھر گئے تھے۔ ورنہ ہر طرف دھول اڑ رہی تھی۔

لان میں مالی کے دونوں بچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر یوں ہی بے دھیانی سے انہیں دیکھتے رہے، پھر یکایک ایک خیال حسرت کی طرح ان کے دل میں پیدا ہوا کہ وہ بھی ان بچوں کی طرح لان میں دوڑتے بھاگتے پھریں اور آسمان سے برستی ان بوندوں کو اپنی ہتھیلیوں کی اوک میں اکٹھا کریں، بالکل ایسے ہی جیسے... پھر ایک بھولا بسرا منظر ان کی آنکھوں کے آئینے میں آ ٹھہرا۔

وہ بارش میں یوں ہی ان بچوں کی طرح لان میں بھاگتے اور بھیگ کر خوش ہوتے تھے۔ ماڈل ٹاؤن کے اس وسیع و عریض گھر کا وہ بڑا سا لان جسے بڑے بڑے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ آم، لیچی، جامن، انار، امرود اور سفیدے کے درخت... پتا نہیں اب بھی وہاں یہ سب درخت ہیں یا راحت بھابھی نے کٹوا دیے ہیں... وہ کتنا چڑتی تھیں۔

"ان پھل دار درختوں پر صبح صبح ہی پرندے جمع ہو کر کتنا شور کرتے ہیں اور پھلوں سے لان میں کتنی گندگی ہو جاتی ہے... جب دیکھو کچے پکے پھل نیچے گرے ہوتے ہیں۔ بس میں اس سال مصطفیٰ سے کہہ کر یہ سب درخت کٹوا دوں گی۔"

وہ ہر سال کہتی تھیں اور ہر سال بابا جان منع کر دیتے۔

"نہ، نہ بچے! اللہ ناراض ہو گا۔ بھلا پھل دار درختوں کو بھی کوئی کاٹتا ہے۔ منع ہے بچے! ان درختوں کو کاٹنا۔"

"آپ کو ان درختوں کا اتنا خیال تھا بابا جان! لیکن ہمارا ذرا خیال نہیں کیا آپ نے... کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کیسا دل پتھر کر لیا آپ نے۔ ہم تو آپ کے کوئی نہیں تھے لیکن عمارہ تو آپ کی اپنی تھی۔ آپ کی لاڈلی تھی۔ بہت پیار تھا آپ کو اس سے۔ ہم سے اگر غلطی ہو گئی تھی تو آپ تو آ سکتے تھے نا ہمارے پاس... آپ ہی ہمیں معاف کر دیتے۔ ہمارے لیے نہ سہی، عمو کے لیے ہی۔ ہمارے لیے "الریان" کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ یہ ظلم ہم نے خود اپنے آپ پر کیا تھا لیکن فلک مراد شاہ کے "مراد پیلس" کے دروازے تو ہمیشہ آپ کے لیے کھلے رہے کہ شاید... شاید آپ کبھی اپنی عمو سے ملنے آئیں... عمو کی آنکھیں تو ہمیشہ دروازے پر ہی لگی رہیں۔ ہر اہم موقع پر، لیکن بابا جان! آپ اتنے ظالم بھی ہو سکتے ہیں۔"

ان کے لبوں سے بے اختیار ایک سسکی نکل گئی۔ انہوں نے پوری شدت سے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا ڈالا۔ پتا نہیں کیوں انہیں لگا تھا کہ اگر انہوں نے خود کو نہ سنبھالا تو یہ سسکی چیخوں میں ڈھل جائے گی۔

ہونٹ کو دانتوں تلے دبائے انہوں نے پھر ایک نظر باہر لان پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے بچوں کو دیکھا۔ ہلکی پھوار اب موٹی بوندوں میں ڈھل گئی تھی لیکن بچے اس سے بے پروا لان میں ایک دوسرے کے پیچھے یوں ہی بھاگ رہے تھے۔

"اس سردی میں بھیگنے سے بچے بیمار نہ ہو جائیں۔ پتا نہیں یہ مالی کہاں غائب ہے، انہیں منع بھی نہیں کرتا۔"

انہوں نے تیزی سے ہینڈل گھما کر اپنی کرسی کا رخ بدلا تو ان کی نظریں اندر آتی عمارہ سے ٹکرائیں، جو ہاتھوں میں گرم گرم بھاپ اڑاتی چائے کا کپ لیے آ رہی تھیں۔

عمارہ سے ہوتی ہوئی ان کی نظریں بے اختیار سامنے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف اٹھیں۔ دس بج رہے تھے۔ عمارہ کبھی نہیں بھولتی تھیں کہ وہ دس بجے ایک کپ چائے کا ضرور پیتے ہیں۔ خود انہیں بھی آج وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ناشتے کے بعد

سے وہ یونہی کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔
عمارہ نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھا۔ وہ آسانی سے ہاتھ بڑھا کر کپ اٹھا سکتے تھے۔ عمارہ کپ رکھ کر بنا کچھ کہے واپسی کے لیے مڑ گئیں۔
پتا نہیں کیوں انہیں لگا کہ عمارہ کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں اور پلکیں بھیگی سی ہیں۔ تو کیا عمارہ کو بھی اس برستی بارش میں "الریان" کی یاد آرہی ہے۔ ایک گہرا دردان کے دل کو چیرتا چلا گیا۔
"کیا الریان کو یاد کرنے کے لیے عمارہ کا دل کسی موسم کا محتاج ہے؟ وہ الریان کو کبھی بھول سکتی ہیں۔ جہاں انہیں نے آنکھ کھولی تھی، جہاں ان کا بچپن گزرا، لڑکپن آیا، جوانی آئی۔ جہاں کتنے خوب صورت دن بیتے ماہ و سال انہوں نے اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ گزارے تھے۔ جہاں سے رخصت ہو کر وہ "مراد پیلس" آئی تھیں۔
"عمو!"
وہ بے اختیار انہیں پکار بیٹھے تھے۔ وہ مڑ کر دیکھنے لگیں۔
"اپنے لیے چائے نہیں لائیں؟"
"آپ کو پتا ہے نا میں اس وقت چائے نہیں پیتی گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔"
"لیکن اس موسم میں ذرا سا ساتھ دے دو یا اس معذور کی رفاقت نے تمہیں اکتا دیا ہے۔"
"فلک!" عمارہ تڑپ کر آگے بڑھیں۔
"کیا آپ کو ایسی بات کرنا چاہیے۔ کیا میں نے کبھی کوئی کوتاہی کی۔ کیا میری محبت میں کبھی کوئی کمی محسوس کی آپ نے؟"
وہ بے اختیار شکوہ کر بیٹھیں۔ ان کی خوب صورت آنکھیں نم ہو گئیں۔
"سوری عمو!" فلک شاہ شرمندہ ہو گئے۔
"میں یہ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ کم از کم میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو دراصل اس خوبصورت موسم میں تھوڑی دیر کے لیے تمہاری رفاقت کا خواہاں تھا۔ پتا نہیں کیا کیا یاد آرہا ہے۔"

عمارہ ان کی ڈھیل چیئر کے پاس ہی بیڈ کے کنارے پر ٹک گئیں۔
"عمو! ناراض ہو گئی ہو؟" فلک شاہ انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔
"نہیں۔" عمارہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ذرا سا جھک کر چائے کا کپ اٹھا کر ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے شکریہ کہہ کر کپ عمارہ کے ہاتھ سے لے لیا۔
"عمو! مجھے معاف کر دو پلیز میری جلد بازی، میرے غصے کی وجہ سے "الریان" تمہارے لیے شجر ممنوعہ ہو گیا۔ سارے اپنے بچھڑ گئے۔"
"آپ بار بار کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ اتنی عمر گزر گئی بچے جوان ہو گئے۔ کبھی میں نے آپ سے گلہ کیا، کبھی کہا کچھ؟"
"تو کہو نا؟" انہوں نے کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔
"گلہ کرو۔ لڑو جھگڑو۔ برا بھلا کہو۔ مجرم ہوں میں تمہارا، تمہیں تمہارے اپنوں سے جدا کرنے کا مجرم۔"
"مجھے کبھی آپ سے گلہ ہوا ہی نہیں فلک!" عمارہ کا لہجہ دھیما تھا اور نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔
"آپ کو باباجان کی بات پر غصہ آگیا تھا۔ آپ نے دانستہ تو ایسا نہیں کیا تھا نا۔ اور غصہ تو یوں بھی انسان کا دماغ خراب کر دیتا ہے۔" عمارہ نے وہیل چیئر کے ہتھے پر رکھے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ انہوں نے ایک گہری سانس لی۔
"داداجان ہمیشہ مجھے کہتے تھے فلک شاہ! اپنے غصے پر کنٹرول کر۔ سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے تو اپنی۔ کہیں غصے میں اپنا ہی کوئی نقصان نہ کر بیٹھے۔ اور میں نے کتنا بڑا نقصان کر دیا عمارہ! تمہارا، اپنا بچوں کا۔ میں تو مجرم ہوں تم سب کا۔ تم مجھے دل سے معاف کر دو عمو!"
وہ دونوں ہاتھ جوڑے معافی مانگ رہے تھے اور عمارہ کا دل جیسے پانی ہو کر آنکھوں سے بہہ نکلا تھا۔ انہوں نے بے اختیار ان کے جڑے ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں بھینچ لیا اور اب ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے روئے چلی جا رہی تھیں۔

آج بہت دنوں بعد فلک شاہ پر یہ قنوطیت اور دل گرفتی کا دورہ پڑا تھا اور ایسے وقت میں صرف ایک ہی تھا جو انہیں اس ڈپریشن سے باہر لاتا تھا اور ایک پتا نہیں کب واپس آئے گا تب تک فلک شاہ یونہی بے چین رہیں گے۔ عمارہ نے تاسف سے سوچا اور فلک شاہ کے ہاتھوں پر اپنی گرفت اور سخت کر دی۔

"آپ نے غصے میں بہت غلط بات کر دی تھی اور یہ آپ کا فعل تھا' آپ کی غلطی تھی۔ ہم "الریان" نہیں جا سکتے لیکن بابا جان کو کس چیز نے یہاں آنے سے روکے رکھا فلک! کیا والدین اور بچوں کے درمیان بھی انا ہوتی ہے اور وہ سب جو میرے ماں جائے تھے جن کے ساتھ میں نے اپنا بچپن' اپنا لڑکپن گزارا تھا۔ ان سب نے بھی مجھے یوں جھٹک کر پھینک دیا جیسے میں کوئی اچھوت تھی جیسے۔۔۔"

عمارہ کی ہچکی بندھ گئی۔ پچیس سالوں میں پہلی بار عمارہ نے اپنوں کی بے حسی کا گلہ کیا تھا۔

"زارا اور اماں جان کے بعد تو میں جیسے "الریان" کے باسیوں کے لیے ایک بھولا بسرا خواب بن گئی ہوں۔ کیوں کیا انہوں نے میرے ساتھ ایسا۔ کیوں موی! کیوں۔۔۔؟"

وہ ان کے ہاتھ چھوڑ کر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ فلک شاہ نے بے اختیار اپنا بازو پھیلا کر عمارہ کا سر اپنے ساتھ لگا لیا۔ آج بڑے عرصہ بعد انہوں نے انہیں "موی" کہہ کر بلایا تھا۔ ان کے کندھے پر سر رکھے عمارہ پھر سسک رہی تھیں۔

"کیوں مجھے الگ کر دیا انہوں نے۔"

اور اس کیوں کا جواب تو ان کے پاس بھی نہیں تھا۔

نو سال پہلے زارا کی موت کے بعد تو جیسے "الریان" کی طرف کھلنے والا ہر دروازہ بند ہو گیا تھا۔ زارا ان کے لیے وہ روزن تھی' جس کے طفیل وہ "الریان" کے ہر دکھ سکھ کو جان لیتے تھے۔ "مراد پیلس" میں رہ کر بھی وہ "الریان" کے ہر دکھ پر دکھی ہوتے اور ہر سکھ پر خوش ہوتے۔

"یہ زندگی اتنی ظالم کیوں ہوتی ہے موی! یہ ہم جیسے کمزور انسانوں سے ایسے امتحان کیوں لیتی ہے؟"

عمارہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ فلک مراد شاہ بے حد مضطرب اور بے چین ہو گئے تھے۔

"اب کے ایبک لاہور سے آئے تو میں اسے کہوں گا کہ وہ عثمان بھائی' مرتضیٰ بھائی' مصطفیٰ بھائی سب کو یہاں لے کر آئے۔ میں خود انہیں فون کروں گا۔ منت کر لوں گا۔ ہاتھ جوڑ کر بابا جان سے معافی مانگ لوں گا۔"

"نہیں ہرگز نہیں۔ اگر انہیں خود مجھ سے ملنے کی چاہ نہیں' میرا خیال نہیں تو پھر میں کیوں۔۔۔ نہیں پلیز آپ ایبک سے کچھ نہیں کہیں گے۔"

"ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ والدین اور بچوں کے درمیان کیسی انا۔ تو تم ہی اس جھوٹی انا کا بت توڑ دو۔ عمو! اپنے اوپر ظلم مت کرو۔ اتنے سالوں سے تم خود کو اپنوں سے جدائی کی سزا دے رہی ہو لیکن اب۔۔۔ میری طرف سے اجازت ہے تم مجھے چھوڑ کر۔۔۔"

"آپ جانتے ہیں نا فلک! میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر مجھے چھوڑنا ہوتا تو اس وقت چھوڑ دیتی۔ اب تو آپ کو میری اور مجھے آپ کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے' پھر آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں۔"

آنسو پھر ان کی آنکھوں میں مچلنے لگے اور فلک شاہ چپ چاپ عمارہ کو دیکھے چلے گئے۔ غلطی تو ساری ان کی تھی اور اس غلطی کا خمیازہ عمارہ بھگت رہی تھیں پچھلے پچیس سال سے۔ کوئی مر جائے تو صبر آ جاتا ہے لیکن یہ جیتے جی جدائیوں کے عذاب۔۔۔ انہوں نے پل پل عمارہ کو مرتے دیکھا تھا۔ اگر عمارہ ان کی غلطی کی وجہ سے "الریان" نہیں جا سکتی تھیں تو پھر وہ کون سی مصلحتیں تھیں' جنہوں نے مصطفیٰ' مرتضیٰ' عثمان' احسان اور بابا جان کو پچیس سالوں سے یہاں آنے سے روکے رکھا تھا۔

"ارے! چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ میں اور بنا کر لاتی ہوں۔" عمارہ نے دائیں ہاتھ کی پشت سے رخسار صاف کیے اور کپ لینے کو ان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں بس ٹھیک ہے۔" فلک شاہ نے ٹھنڈی چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا اور یہ ان کا حد سے زیادہ بڑھا ہوا ڈپریشن تھا کہ انہوں نے ٹھنڈی چائے چند گھونٹوں میں پی لی ورنہ عام حالت میں وہ ٹھنڈی چائے کبھی نہیں پیتے تھے۔ عمارہ چپ چاپ انہیں دیکھے گئیں۔ وہ بے چینی سے اپنی انگلیاں مروڑ رہے تھے۔

"چاہے تم کچھ بھی کہو عمارہ! لیکن میں اس کے لیے خود کو کبھی معاف نہیں کر سکتا کہ میں تمہارے پیاروں کی دوری کا سبب بنا ہوں۔"

"ہمارے درمیان بہت پہلے یہ بات طے ہو گئی تھی کہ ہم اس موضوع پر کبھی بات نہیں کریں گے پھر آپ کیوں خود کو اذیت دیتے ہیں۔" عمارہ نے افسردگی سے انہیں دیکھا۔

فلک شاہ کی نظریں ان کے چہرے کا طواف کر کے اب وہیل چیئر کے ہتھے پر جمی تھیں۔

وہ عمارہ کو یہ نہ بتا سکے کہ جب سے ایبک نے الریان میں جانا شروع کیا تھا اور جس بے چینی سے عمارہ وہاں کے ایک ایک فرد کے بارے میں دس دس بار پوچھتی تھیں۔ وہاں کی ایک ایک چیز کی تفصیل جاننے کی خواہاں ہوتی تھیں۔ ایسے میں تو ان کا احساس جرم بڑھ جاتا تھا۔ کبھی کبھی کچوکے لگاتا یہ احساس اس وقت ناقابل برداشت ہو جاتا تھا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ وقت کی طنابیں کھینچ لیں۔ وقت کو واپس لے آئیں وہیں سے جہاں سے زندگی نے پلٹا کھایا تھا اور سب کچھ پہلے جیسا ہی ہو جائے۔

وہ "الریان" کی اسٹڈی میں بابا جان سے لمبی لمبی بحثیں کرنا۔ عثمان اور احسان کے ساتھ مال پر گھومنا۔ شام کے وقت لان میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے دنیا جہان کی باتیں کرنا۔ اماں جان سے لاڈ اٹھوانا۔ زارا کی ذرا ذرا سی فرمائش پوری کرنا۔۔۔ یہ سب وہ کیسے واپس لاتے۔

انہوں نے افسوس سے ہاتھ ملے اور عمارہ پر ایک بے بسی سی نظر ڈالی جو چائے کا خالی کپ اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ "میں گرم چائے لاتی ہوں۔"

"نہیں رہنے دو۔ جی نہیں چاہ رہا۔"

انہوں نے آنکھیں موند کر سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا اور پھر سینما کی اسکرین کی طرح کئی منظر آنکھوں کے سامنے آتے چلے گئے۔

وہ دادا جان کی انگلی پکڑے "الریان" کے سیاہ گیٹ پر کھڑے حیرت اور خوف سے اس خوفناک کتے کو دیکھ رہے تھے' جو گیٹ کے دائیں طرف بنی باڑ کے اوپر سے جھانک رہا تھا۔ اس کی لمبی زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور اس کی سرخ سرخ آنکھیں جیسے انہیں ہی دیکھ رہی تھیں۔ غیر ارادی طور پر انہوں نے دادا جان کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ یہ غالباً "الریان" کے ساتھ والے گھر کے لان کی باڑ تھی اور باڑ کے اس طرف وہ خوفناک کتا تھا۔

وہ سید عبدالرحمٰن کا گھر تھا جو اس کے پاپا کے دوست تھے اور دادا جان سے ان کی کوئی دور کی رشتہ داری بھی تھی۔ دادا جان نے انہیں بتایا تھا کہ انہیں اب کچھ عرصہ یہاں رہنا ہے۔ وہ بہت روئے تھے۔ وہ اپنا گھر چھوڑ کر یہاں نہیں آنا چاہتے تھے لیکن دادا جان نے انہیں سمجھایا تھا کہ صرف چند ماہ کی بات ہے۔ اس کے پاپا کا آپریشن ہو جائے گا تو پھر وہ واپس لے جائیں گے۔

"پاپا ٹھیک تو ہو جائیں گے نا۔ آپ انہیں ساتھ لے کر آئیں گے پہلے کی طرح وہاں تو نہیں چھوڑ آئیں گے۔"

"نہیں میری جان! اللہ نے چاہا تو ہم جلد ہی واپس آئیں گے اور آپ کے پاپا میرے ساتھ ہوں گے بالکل صحت مند۔ آپ بس دعا کرنا۔"

"لیکن وہاں گھر میں دادو بھی تو اکیلی ہوں گی نا' میں ان کے پاس کیوں نہیں رہ سکتا۔" وہ سات آٹھ سال کے تھے لیکن بلا کے ذہین تھے۔ ایسے ایسے سوال کرتے کہ دادا جان بھی کبھی کبھی زچ ہو جاتے۔

"کوئی مسئلہ ہے نا بیٹا! آپ کی دادو ایک کمزور

عورت ہیں۔ آپ یہاں زیادہ محفوظ رہیں گے۔ مجھے اور آپ کے پاپا کو وہاں بہت فکر رہے گی آپ کی اور پاپا پریشان ہوئے تو جلدی صحت مند نہیں ہوں گے۔"

"اچھا۔" پاپا کی خاطر وہ مان گئے تھے۔ لیکن وہاں اس بڑے سے سیاہ گیٹ کے پاس کھڑے کھڑے انہوں نے پھر ایک جواز تراشا تھا۔

"دادو تو مجھے یاد کر کے روتی رہیں گی۔ آپ ایسا کریں مجھے واپس ان کے پاس ہی لے جائیں۔ میں انہیں بالکل تنگ نہیں کروں گا۔"

"مجھے پتا ہے میرا بیٹا بہت اچھا ہے، بہت پیارا۔ وہ تو کسی کو بھی تنگ نہیں کرتا۔ اور آپ کے انکل عبدالرحمٰن آپ کو دادو سے ملانے بھی لے جائیں گے اور آپ ان سے فون پر بھی بات کرتے رہنا۔"

اس وقت وہ آٹھ سال کے بھی نہیں ہوئے تھے لیکن یہ سب کچھ انہیں اس طرح یاد تھا جیسے ابھی کل کی بات ہو اور وہ "الریان" کے باہر دادا جان کی انگلی پکڑے کھڑے ہوں اور باڑ کے اوپر سے وہ خوفناک کتا اپنی لمبی زبان باہر نکالے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے انہیں گھور رہا ہو۔

اور پھر منظر بدلا۔

وہ "الریان" کے ٹی وی لاؤنج میں سید عبدالرحمٰن سے مل رہے تھے۔ جنہیں بعد میں وہ سب کی طرح بابا جان کہنے لگے تھے۔ بابا جان انہیں اتنے والہانہ انداز میں ملے تھے جیسے برسوں سے جانتے ہوں۔

"کب روانگی ہے آپ کی اور سلجوق کی۔" اسے اپنے ساتھ لگائے لگائے انہوں نے دادا جان سے پوچھا تھا اور پتا نہیں کیوں انہیں لگا تھا جیسے ان کی آنکھیں یکبارگی نم ہو گئی تھیں اور دادا جان نے ہولے سے ان کا ہاتھ دبایا تھا۔

"عبدالرحمٰن بیٹا! اپنے دوست کے لیے دعا کرنا۔"

اور پھر لاؤنج لوگوں سے بھر گیا تھا اور بابا جان ان کا تعارف کروا رہے تھے۔

"یہ آپ کے بھائی ہیں اور اب یہ کچھ عرصہ یہاں رہیں گے۔" انہوں نے اپنے سامنے موجود چاروں لڑکوں سے کہا تھا۔

"ہمیشہ کیوں نہیں؟" یہ بھوری آنکھوں والا احسان تھا، جو ان چاروں میں چھوٹا اور "تقریباً" ان کا ہم عمر تھا۔ اس نے بہت بے تکلفی سے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ان سے دو سال بڑے عثمان اور ان سے بڑے مرتضیٰ اور ان سے بڑے مصطفیٰ تھے۔ جو بڑے سنجیدہ اور بردبار لگ رہے تھے اور ان کے ہاتھ میں کتاب بھی تھی۔

"بابا جان! میں جاؤں میرا کل ٹیسٹ ہے اکیڈمی میں؟"

وہ یکدم ہی اس دبلے پتلے لمبے سے لڑکے سے مرعوب ہو گئے تھے، جو چھٹیوں میں بھی پڑھتا تھا۔

احسان سے چھوٹی عمارہ تھی، جو دو چھوٹی چھوٹی پونیاں کیے مصطفیٰ کے ساتھ جڑی کھڑی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چاکلیٹ اور دوسرے میں گڑیا تھی۔

"ماشاءاللہ بہت پیارے بچے ہیں۔" دادا جان نے سب کو پیار کیا تھا اور جب وہ عمارہ کو پیار کر رہے تھے تو اس نے بتایا تھا۔

"ہماری ایک اور بہن بھی ہے۔ اللہ میاں نے فرشتوں کے ساتھ ہمارے لیے گفٹ بھیجا ہے اور جب وہ بڑی ہو گی تو ہمارے ساتھ کھیلے گی۔ فرشتے اسے ٹوکری میں رکھ کر اماں جان کو دے گئے تھے۔"

"بے وقوف۔" احسان نے اسے ٹوکا۔ "اماں جان اسے ہسپتال سے لائی ہیں اور اس کا نام زارا ہے۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔ وہ اماں جان کے کمرے میں سو رہی ہے۔" احسان نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

زارا صرف پندرہ دن کی تھی اور "الریان" میں ان بچوں، اماں جان اور بابا جان کے علاوہ مروہ پھپھو، عبداللہ چچا اور دادی اماں تھیں، جنہیں سب بڑی اماں کہتے تھے۔ عبداللہ چچا کی دلہن، بینا چچی جن کی سب بچوں سے بے حد دوستی تھی مگر خود شادی کے سات سال کے بعد ابھی تک بے اولاد تھیں۔ مروہ پھپھو کی ایک دو ماہ تک شادی ہونے والی تھی۔ عنایت بی بی کچن کا کام سنبھالتی تھیں۔ "الریان" کے پچھلے لان کی طرف تمام ملازموں کے کوارٹرز تھے۔

دادا جان اسی شام واپس چلے گئے تھے۔ "الریان" بہت اچھا لگا تھا۔ حالانکہ بہاول پور میں ان کی اپنی حویلی بھی کم شاندار نہ تھی۔ آرائشی آئینوں والی چھتیں، رنگین شیشوں والے دروازے اور کھڑکیاں، حویلی سے ملحق چھوٹا سا باغ، بڑے سے لکڑی کے نفیس گیٹ کے اوپر لگی نیم پلیٹ پر سنہری حرفوں میں لکھا "مراد پیلس۔" یہ سب انہیں بہت اچھا لگتا تھا۔ لیکن "الریان" آنے کے بعد تو انہیں صرف "الریان" ہی اچھا لگنے لگا۔ شاید اس لیے کہ "الریان" میں اتنے سارے لوگ تھے اور "مراد پیلس" میں صرف وہ تھے۔ دادا جان اور دادی جان تھیں اور پاپا جو بہت کم بولتے تھے۔

ان کا دل "الریان" میں لگ گیا تھا۔ مصطفیٰ، عثمان، احسان سب ہی چند دنوں میں ان سے گھل مل گئے تھے۔ بس زارا کو گود میں لینے کے لیے سب کی معصوم سی لڑائیاں ہوتیں۔ مگر مصطفیٰ بڑا ہونے کا فائدہ اٹھا کر اسے اچک لیتے۔ وہ ابھی گیارہ بارہ سال کے تھے لیکن وہ ان کا بہت خیال کرتے تھے اور پھر ایک دن مصطفیٰ نے بہت فراخدلی سے زارا کو ان کی گود میں دیتے ہوئے اعلان کیا تھا۔

"آج سے زارا فلک مراد شاہ کی بہن ہے۔ ہم تو اتنے سارے بھائی ہیں اور پھر ہمارے پاس عمارہ بھی ہے لیکن فلک کے پاس کوئی نہیں ہے تو آج سے زارا کو صرف فلک ہی گود میں اٹھائے گا۔"

"کبھی کبھی عثمان اور احسان بھی اٹھالیں گے۔" انہوں نے بھی فراخدلی سے اعلان کیا تھا۔

اس روز دادا جان کا فون آیا تو بڑی خوشی سے انہوں نے دادا جان کو بتایا تھا کہ زارا کو مصطفیٰ نے مجھے دے دیا ہے۔ اور دادا جان نے وعدہ کیا تھا کہ وہ زارا کے لیے بھی بہت سی چاکلیٹ لائیں گے۔ بس وہ اپنے پاپا کے لیے بہت سی دعائیں کریں۔ اس روز ان کا آپریشن تھا۔ "الریان" میں محبتیں ہی محبتیں تھیں ان سب نے پاپا کے لیے بہت سی دعائیں کی تھیں۔

وہ ہر بار انہیں یاد دلاتے تھے کہ انہیں پاپا کو ساتھ لے کر آنا ہے۔ وہاں ہسپتال میں ہی نہیں چھوڑنا۔ انہیں پاپا بہت یاد آتے تھے۔

دادا نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ وہ پاپا کو اپنے ساتھ ہی لائے تھے لیکن اس طرح نہیں جیسے وہ گئے تھے بلکہ تابوت میں بند۔ خاموش آنکھیں بند کیے وہ پرسکون نیند سو رہے تھے۔

ایک اور منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔

"الریان" کے لان میں وہ عمارہ کا ہاتھ تھامے ٹہل رہے تھے اور عمارہ انہیں بتا رہی تھی کہ وہ پڑوسیوں کے ڈوگی سے بالکل نہیں ڈرتی اور ابھی ڈوگی باہر نکلے گا تو دونوں اسے دیکھنے چلیں گے۔ تب ہی مصطفیٰ اندرونی دروازہ کھول کر "تقریباً" بھاگتے ہوئے لان میں آئے تھے۔

"موی۔۔۔ موی آپ کے۔۔۔"

یہ نام احسان نے انہیں دیا تھا۔ اسے فلک مراد شاہ بہت مشکل نام لگتا تھا۔

مصطفیٰ ان کا ہاتھ پکڑے انہیں اندر لے گئے تھے۔

لونگ روم میں سب جمع تھے۔ بینا چچی، بڑی اماں، عبداللہ چاچو، اماں جان اور مرتضیٰ۔۔۔ بابا جان رو رہے تھے اور بڑی اماں ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے انہیں تسلی دے رہی تھیں۔

"وہ میرا بہت پیارا دوست تھا اماں جان! بہت اچھا بہت حساس دل۔" پھر ان کی نظر فلک پر پڑی اور وہ تڑپ کر اٹھے اور اسے اپنے دونوں بازوؤں میں بھر لیا اور پہلے سے زیادہ شدت سے رونے لگے تھے۔

ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں رو رہے ہیں۔ انہونی کا احساس ان کے دل میں پنجے گاڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بابا جان کے بازوؤں میں دبکے سہمے سہمے سب کی پرنم آنکھوں کو دیکھ رہے تھے تب عبداللہ چاچو نے انہیں عبدالرحمٰن کے بازوؤں سے نکالا تھا۔

"بھائی! حوصلہ کریں۔ آپ نے فلک کو پریشان کر دیا ہے۔ بچہ خوف زدہ ہو گیا ہے۔" بڑی اماں ان کے پاس بیٹھے ہولے ہولے ان کی پیٹھ سہلا رہی تھیں۔ اور نرم لفظوں میں انہیں تسلی دے رہی

تھیں۔
"عبداللہ تم ـــ تم بتادو فلک کو۔ میں نہیں بتاسکتا۔"

وہ تیز تیز چلتے لونگ روم سے نکل گئے تھے اور عبداللہ چچا نے انہیں اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بہت نرمی سے اور دھیمے لہجے میں دنیا کی سب سے سفاک حقیقت بتائی تھی۔

پھر ایک اور منظر آنکھوں کے سامنے سے آکر گزر گیا۔ وہ اپنے دادا جان کے ہمراہ "مراد پیلس" آگئے۔

وہ "الریان" جانا چاہتے تھے۔ انہیں سب یاد آرہے تھے۔ عثمان، حسان، زارا، عمارہ، لیکن وہ دادا جان اور دادی جان کے ساتھ بھی رہنا چاہتے تھے۔ دادا جان نے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں کبھی کبھی "الریان" میں سب سے ملانے لے جایا کریں گے اور ابھی ان کے پاپا کو اس دنیا سے گئے ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ آگئیں۔

"میں زریں ہوں، سلجوق کی سابقہ بیوی۔ میں نے تین چار ماہ پہلے فون کیا تھا کہ میں اپنے بچے کو لینے آرہی ہوں لیکن آپ اور سلجوق بچے کو لے کر غائب ہی ہوگئے۔"

"ہم غائب نہیں ہوئے تھے۔ میں سلجوق کو علاج کے لیے انگلینڈ لے کر چلا گیا تھا اور ـــ"

"بچے کو کہیں چھپا دیا۔" زریں نے بات کاٹی۔ "جب بھی میں نے فون کیا کہ میں اپنے بچے سے ملنے آرہی ہوں، سلجوق کی والدہ نے جواب دیا کہ بچہ فی الحال یہاں نہیں ہے۔ اب کہاں ہے میرا بچہ۔"

اس وقت وہ اور دادا جان پاپا کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر آرہے تھے۔ وہ گیٹ کے پاس ہی انہیں ملی تھی۔ غیر ارادی طور پر دادا جان کی گرفت ان کے ہاتھ پر مضبوط ہوگئی تھی۔ "آپ اندر چل کر بات کریں اور موی بیٹا! آپ اندر جائیں۔"

تب اس خاتون نے پہلی بار غور سے انہیں دیکھا تھا۔

"یہ ـــ میرا بیٹا ہے نا!" اور پھر جیسے یقین نے ان کی آنکھوں میں چمک پیدا کردی تھی۔ وہ بے اختیار ان کی طرف بڑھی تھی۔

"کیا۔ کیا نام ہے اس کا۔"

"فلک ـــ فلک مراد شاہ۔" دادا جان کے لبوں سے نکلا تھا مگر وہ اس کی پھیلی بانہوں کو نظر انداز کرکے اندر بھاگ گئے تھے۔

پھر ایک اور منظر بدلا۔

ان کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھی وہ عورت اور عاجزی سے بات کرتے دادا جان، خاموش بیٹھی دادی جان اور دادی جان سے جڑے بیٹھے وہ ـــ

"زریں بیٹا! آپ نے سلجوق کو لکھ کر دیا تھا کہ آپ کا اپنے بیٹے سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے اور آپ اپنی مرضی سے اسے اس کے باپ سلجوق کے حوالے کررہی ہیں۔" دادا جان کا لہجہ دھیما تھا۔

"لیکن اب سلجوق مرچکا ہے اور یہ میرا بیٹا ہے۔ ماں سے زیادہ کس کا حق ہے بیٹے پر۔"

اس کے لہجے کی بے رحمی انہیں بہت بری لگی تھی۔

"اس وقت یہ ممتا کہاں گئی تھی، جب صرف دو دن کا چھوڑ کر چلی گئی تھیں تم۔ صرف آٹھ دن کا تھا یہ، جب میری گود میں سلجوق نے اسے ڈالا تھا۔ میں نے راتوں کو جاگ کر اسے پالا ہے۔ اب تم حق دار بن کر آگئی ہو۔ جاؤ راہ دیکھو اپنی ـــ دھکے مار کر نکلوا دوں گی باہر۔ میرے بیٹے کی قاتل ہو۔ مار دیا تم نے میرے بیٹے کو۔"

دادی جان یک دم غصے میں آگئی تھیں اور وہ سہم کر دادا جان کے پاس جا بیٹھے تھے۔ دادا جان نے معذرت طلب نظروں سے زریں کو دیکھا تھا۔

"جوان بیٹے کی موت کا صدمہ ابھی تازہ ہے۔ آپ ان کی باتوں کا برا مت ماننا۔ جب آپ کا فون سلجوق کے پاس آیا تھا کہ آپ اپنے بیٹے سے ملنا چاہتی ہیں تو اس کے صرف تین دن بعد ہماری لندن روانگی تھی۔ سلجوق زندہ رہتا تو وہ ضرور آپ سے آکر رابطہ کرتا۔ اب بھی آپ جب چاہیں آکر ملیں۔ جتنے دن چاہیں حویلی میں رہیں لیکن اسے ہم سے جدا نہ کریں۔ یہ ہمارا اکلوتا پوتا ہے۔ سلجوق کا وارث۔" دادا جان اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہے تھے۔ منتیں کررہے تھے۔

اور پھر ایک اور منظر ـــ وہ عورت جس کے متعلق دادا جان نے بتایا تھا کہ وہ ان کی ماما ہیں اور انہیں لینے آئی تھیں۔ ان کے دل میں اس کے لیے کوئی جذبہ پیدا نہ ہوا تھا۔ وہ دادی جان سے لپٹے جارہے تھے۔

"میں نہیں جاؤں گا کبھی بھی۔"

دادی جان زارو قطار روئے جارہی تھیں۔ بار بار انہیں لپٹاتی، چومتی تھیں۔ دادا جان خاموش کھڑے تھے۔ اور وہ عورت لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ لیے انہیں دیکھ رہی تھی۔ دادی نے اس سے صاف کہہ دیا تھا کہ اس کا بچے پر کوئی حق نہیں ہے۔ اس روز تو وہ چلی گئی تھی لیکن پھر اس نے بچے کی کسٹڈی کے لیے کیس کردیا تھا۔

وہ ماں تھی۔ اس کا حق صائب تھا۔ پھر وہ برطانوی شہری تھی۔ اس کی پشت پر اس کا سفارت خانہ تھا۔ انہوں نے بہت بڑا وکیل کیا تھا لیکن عدالت نے زریں کے حق میں فیصلہ کیا تھا اور اس دن وہ بڑے غرور سے سر اٹھائے یوں دادی جان کو روتے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی تماشا ہو۔ پھر اس نے انہیں دادی کی آغوش سے کھینچ لیا۔

"بس کریں یہ ڈراما۔"

"بیٹا! ابھی بھی ہم اس سے بات کرسکتے ہیں؟"

دادا جان سراپا التجا بنے کہہ رہے تھے۔

"نہیں۔" اس نے سختی سے منع کردیا تھا۔

"آپ چاہتے ہیں کہ یہ کبھی وہاں ایڈجسٹ نہ ہوسکے۔" تب انہوں نے اس عورت کے لیے اپنے دل میں بڑی نفرت محسوس کی تھی۔

پھر یکے بعد دیگرے کئی منظر نگاہوں کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔ فلک شاہ نے دونوں ہاتھوں سے سر کی کنپٹیوں کو دبایا۔ لندن میں اس شاندار اپارٹمنٹ میں فیروز خان جھگڑ رہا تھا۔

"اسے کسی چائلڈ کیئر ہوم میں بھیج دو۔ میں اسے برداشت نہیں کرسکتا۔"

"تم ہی نے کہا تھا اسے لے کر آؤ۔" زریں اس سے زیادہ اونچی آواز میں چیخی تھی۔

"ہاں لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ سر پر سوار کرلو۔ میں نے کہا تھا جو شخص لندن جیسے شہر میں اس مہنگے ترین علاقے میں دو دن کے بچے کے عوض اتنا لگژری اپارٹمنٹ دے سکتا ہے، وہ بچہ مانگنے پر مزید بہت کچھ دے سکتا ہے۔"

"لیکن ـــ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ سلجوق مرچکا ہے۔"

"تو تم احمق عورت! بجائے اس کے کہ اس کے دادا سے سودا کرتیں، اسے اٹھا کر لے آئیں۔ اتنی بڑی حویلی جائیداد دیکھ کر رال ٹپک پڑی ہوگی تمہاری اور تم نے سوچا ہوگا کہ اس کے توسط سے اتنی دولت کی مالک بن جاؤ گی۔"

"تو یہ راہ بھی تم نے دکھائی تھی۔ تم ہی نے کہا تھا لے آؤ۔ بالغ ہونے پر وراثت کا دعوا کردینا۔"

"میں نے تمہیں یہ بھی تو بتایا تھا کہ قانوناً تم دعوا کرکے کچھ حاصل نہیں کرسکتیں کیونکہ اسلام میں باپ کی زندگی میں بیٹا فوت ہوجائے تو وراثت ختم ہوجاتی ہے۔ اس لیے یوں ہی بات چیت اور سودے بازی سے حاصل کرلو کچھ لیکن آٹھ سالوں بعد ممتا ابل پڑی تھی تمہاری۔ دے دو اسے کسی یتیم خانے میں یا اس کے دادا سے اس کا خرچہ مانگو۔"

یہ باتیں ہر تین چار دن کے وقفے سے دہرائی جاتیں پھر فیروز پاؤں سے ٹھوکریں مارتا غصے سے باہر چلا جاتا۔ زریں بھی کبھی فیروز کے غصے سے سہم جاتی۔ اسے چیزوں کے ٹوٹنے کا بہت دکھ ہوتا تھا جو فیروز کی ٹھوکروں کی زد میں آتی تھیں۔ اور پھر وہ بھی فیروز کی طرح غصہ کرنے لگے۔

کھانا پسند کا نہ ہوتا تو برتن پھینک دیتے۔ اسکول جانے کا جی نہ چاہتا تو بیگ کو ٹھوکر مار کر اپنے کمرے میں گھس جاتے۔ زریں بھی کبھی حیران ہوجاتی۔

"سلجوق تو ایسا نہ تھا تم کس پر چلے گئے۔ وہ تو بہت دھیمے مزاج کا تھا۔"
لیکن ان چار سالوں میں جو انہوں نے زریں کے ساتھ گزارے تھے، وہ بہت غصیلے اور چڑچڑے ہو گئے تھے۔
تین سال بعد زریں اور فیروز کا زبردست جھگڑا ہوا تھا۔ زریں نے فیروز کو گھر سے نکلنے کو کہہ دیا۔
"یہ میرا گھر ہے۔ تم جہاں چاہو چلے جاؤ۔"
اس روز زریں نے تین سال بعد ان کی دادا جان اور دادی جان سے بات کروائی تھی۔
اور پھر ایک اور منظر۔
وہ ایرپورٹ پر اس عورت کو خدا حافظ کہہ رہے تھے جو ان کی ماں تھی لیکن کبھی بھی انہیں ماں کی طرح نہیں لگی تھی لیکن اس وقت ایرپورٹ پر اسے خدا حافظ کہتے ہوئے وہ اداس تھے۔
"مجھے یقین ہے تم وہاں بہت خوش رہو گے۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت ظلم کیا کہ تمہیں وہاں سے لے آئی۔ مجھے معاف کر دینا۔"
"آپ بھی پاکستان چلیں اور وہاں ہمارے ساتھ رہیں۔ دادا جان کبھی منع نہیں کریں گے۔" پہلی بار انہوں نے اس عورت کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ محسوس کیا تھا۔
"ہاں! مجھے علم ہے، وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ تمہارے بابا بھی بہت اچھے تھے۔ میں دراصل بہت بیمار ہوں۔ اگر میں صحت یاب ہو گئی تو تم سے ملنے آؤں گی۔"
لیکن وہ ٹھیک نہیں ہوئی اور ان کے پاکستان آنے کے صرف چھ ماہ بعد اس کا انتقال ہو گیا تھا اپنی موت سے صرف دو دن پہلے اس نے ان سے بات کی تھی اور ان سے دعا کرنے کے لیے کہا تھا۔
"المریان" سے سب ہی انہیں ملنے آئے تھے "مراد پیلس" میں ان کی واپسی پر جشن کا سماں تھا۔
وہ واپس آکر خوش تھے۔ دادا جان نے انہیں اسکول میں بھی داخل کروا دیا تھا۔ چھٹیوں میں وہ "المریان" جاتے اور دو ہفتے وہاں ٹھہرتے۔
ایک گہری سانس لے کر انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ باہر سے عمارہ کی آواز آرہی تھی۔ وہ کسی سے بات کر رہی تھیں۔ پھر ان کے کانوں میں انجم کی آواز آئی۔
تب ہی عمارہ اور انجم اندر داخل ہوئیں۔ انجم نے بڑی وارفتگی کے ساتھ ان کے ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیے۔ "کیسے ہیں بابا!"
"بالکل ٹھیک۔" وہ مسکرائے اور اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چوم لی۔
"اور تم ٹھیک ہو نا۔ جواد کیسا ہے۔"
"ہم دونوں ٹھیک ہیں۔ جواد مجھے گیٹ پر ہی چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ کھانے تک آجائیں گے۔" عمارہ نے مسکرا کر انجم کو دیکھا۔
"اگر تم نہ آتیں تو میں خود فون کرنے والی تھی۔ تمہارے بابا آج بہت اداس ہو رہے تھے۔ اب تم دونوں باپ بیٹی باتیں کرو۔ میں ذرا رقیہ بی کو کھانے کا بتا دوں کہ کھانے پر جواد بھی ہوگا۔"
وہ جو کچھ دیر پہلے پریشان ہو رہی تھیں اب مطمئن سی ہو کر باہر نکل گئیں اور فلک مراد شاہ انجم کی طرف متوجہ ہو گئے۔

☆ ☆ ☆
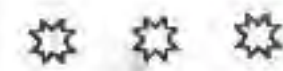
برش کرتے ہوئے اس نے آئینے میں اپنا بغور جائزہ لیا اور اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ وہ بلاشبہ ایک خوب صورت نوجوان تھا۔ نیلی آنکھیں، براؤن بال۔ پہلی نظر میں تو وہ کوئی غیر ملکی لگتا تھا۔
"یہ آپ کیوں مسکرایا جا رہا ہے؟" سمیرا نے برآمدے میں بچھی ٹیبل پر ٹرے رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔
احمد رضا نے برش آئینے کے سامنے لگے ریک پر رکھتے ہوئے بغیر مڑے جواب دیا۔

"یوں ہی۔" اور پھر مڑ کر ٹیبل کے قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔
اس نے احمد کو مکھن لگا کر سلائس پکڑایا اور اپنے لیے سلائس کے اندر تھوڑا سا آملیٹ بھر کر رول سا بنا لیا۔ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے احمد نے سمیرا کی طرف دیکھا۔
"سمو! کیا تم اپنی زندگی سے مطمئن ہو؟"
"ہاں ۔۔۔ غیر مطمئن ہونے والی کون سی بات ہے۔" سمیرا نے اپنے کپ میں چائے انڈیلی اور احمد کی طرف دیکھا۔
"کیا تم مطمئن نہیں ہو رضی؟"
احمد رضا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا، پھر اس نے خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے سمیرا کی طرف دیکھا۔
"پتا نہیں میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں یا نہیں لیکن میں ایک اور زندگی کے متعلق ضرور سوچتا ہوں۔ ایک ایسی زندگی جو اس زندگی سے مختلف ہو، جو میں جی رہا ہوں۔"
آج پتا نہیں کیوں اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے احساسات کسی سے شیئر کرے اور سمیرا سے بہتر سامع اور کون ہو سکتا تھا۔
"کیسی زندگی رضی!"
"پتا نہیں کیسی زندگی ابھی میرے سامنے کوئی واضح خاکہ نہیں ہے لیکن میرے اندر خاکے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ گڈمڈ ہوتے رہتے ہیں۔"
سمیرا نے حیران ہو کر اپنا کپ ٹیبل پر رکھا اور الجھی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
"اس زندگی میں کیا برائی ہے رضی۔"
وہ اس سے چار سال بڑا تھا لیکن دونوں میں اتنی دوستی تھی کہ وہ اسے اکثر اس کا نام لے کر ہی بلاتی تھی۔
"برائی۔۔؟"
اس کے لبوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا۔ یہ گھر ویسا ہی تھا جیسا ایک عام متوسط طبقے کا گھر ہوتا ہے۔
صاف ستھرا صحن اور برآمدہ۔ گراؤنڈ فلور پر تین کمرے تھے۔ جس میں ایک کمرا جس کا دروازہ گلی کی طرف بھی کھلتا تھا ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہ گھر اس کے دادا کا بنایا ہوا تھا۔ ایک کمرا اماں ابا کا تھا اور ایک کمرا کافی عرصہ پہلے تک اس کا اور سمیرا کا مشترکہ تھا لیکن چند سال پہلے جب ابا نے اوپر کی منزل بنوائی تھی تو وہ اوپر منتقل ہو گیا تھا۔ اوپر جدید فیشن کے مطابق دو بیڈ روم مع اٹیچڈ باتھ تھے اور ایک ٹی وی لاؤنج تھا۔ اس کے ابا حسن رضا گریڈ سترہ کے افسر تھے اور وہ ٹھیک ٹھاک اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے بچوں کو کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔
سمیرا رضا اور احمد رضا دو ہی بچے تھے ان کے۔ انہوں نے اچھے اداروں میں انہیں تعلیم دلوائی تھی۔ وہ یو ای ٹی میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا جبکہ سمیرا نے ابھی ابھی کینئرڈ میں ایڈمیشن لیا تھا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔
بچپن سے ہی دونوں بہن بھائی پوزیشن ہولڈر رہے تھے۔ گھر میں اگر ماں باپ کی محبت ملی تھی تو اسکول کالج میں بھی وہ ہمیشہ نمایاں رہے تھے۔ ساتھی طلبا اور اساتذہ نے ہمیشہ انہیں سراہا اور محبت دی تھی۔ سمیرا کو اس زندگی سے کبھی کوئی گلہ نہیں رہا تھا۔ بلکہ ایک طرح سے وہ اپنی زندگی کو شاندار کہہ سکتی تھی۔
پھر۔ پھر بھلا یہ رضی اس طرح کیوں کہہ رہا ہے۔
وہ ابھی بھی الجھی الجھی سی اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے خاموش دیکھ کر اس نے اپنی بات دوہرائی۔
"بتاؤ نا کیا برائی ہے۔"
"کچھ نہیں۔" اس نے چونک کر سر جھٹکا۔
"تم نہیں سمجھو گی سمو! جو میں سوچتا ہوں، تم نے بھلا زندگی کو دیکھا ہی کب ہے، جو تم جان سکو کہ اس زندگی میں کیا برائی ہے۔ تمہاری زندگی تو گھر اور کالج

تک محدود ہے اور بس۔"

"اچھا ٹھیک ہے لیکن تم مجھے بتاؤ تو سہی تم کیسی زندگی کے خواب دیکھتے ہو۔"

"میں نے کہا نا ابھی کچھ بھی واضح نہیں ہے میرے سامنے لیکن میں ایسی گمنام زندگی بھی نہیں جینا چاہتا۔ اللہ نے مجھے خصوصی ذہانت سے نوازا ہے۔ مجھے ایک شاندار پرسنالٹی عطا کی ہے۔ جانتی ہو وہاں یونیورسٹی میں لڑکیاں تو لڑکیاں لڑکے بھی مجھے دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے ٹھٹک جاتے ہیں۔"

سمیرا کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اس کے دل میں خود بخود ہی اپنے بھائی کے لیے ایک فخر سا آگیا تھا۔

"تمہیں تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ نے تمہیں یہ سب عطا کیا ہے۔ تم خوش نصیب ہو رضی! کہ لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں' چاہتے ہیں۔"

"لیکن سمو۔۔۔ میں چاہتا ہوں صرف چند لوگ میری تعریف نہ کریں' بلکہ ایک دنیا مجھے جانے اور پہچانے اور میرے بعد بھی لوگ صدیوں تک میرا نام لیتے رہیں۔"

"ہو سکتا ہے رضی!" سمیرا خالی برتن ٹرے میں رکھنے لگی۔ "تم ایک بڑے انجینئر بن جاؤ اور اپنے شعبے میں کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دو۔ کوئی اہم ایجاد کر لو' ایسی کہ تاریخ کے صفحوں میں تمہارا نام ہمیشہ کے لیے امر ہو جائے۔"

سمیرا کی آنکھیں بھی چمکنے لگی تھیں۔ جیسے اس کا خواب اس کی آنکھوں میں اتر آیا ہو۔ لیکن اسے ایجادات وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ کوئی چھڑی گھمائے اور راتوں رات اس کا نام پوری دنیا میں پھیل جائے لیکن ایسا کیا ہو۔۔۔ کیسے ہو۔۔۔ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

وہ صرف اپنے ڈپارٹمنٹ کا ہی نہیں' پوری یونیورسٹی کا پاپولر اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ تیسرے سال میں تھا۔ لیکن اسے پوری یونیورسٹی کے طلبا طالبات جانتے اور پہچانتے تھے۔ پروفیسرز اسے سراہتے تھے۔ وہ پڑھائی کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی آگے آگے ہوتا تھا۔ اللہ نے اسے بے حساب صلاحیتوں سے نوازا تھا اور اب وہ ان صلاحیتوں کا استعمال کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کیسے۔۔۔ یہ اسے ابھی تک سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اس نے کرسی دھکیلی اور کھڑا ہو گیا۔

"اوکے سمو! میں اب چلتا ہوں۔ تم کب سے کالج جا رہی ہو۔"

"ابھی تو اسٹوڈنٹ ویک ہی چل رہا ہے۔ پڑھائی تو ہوتی نہیں۔ جب پڑھائی شروع ہو گی تو جاؤں گی۔"

اس نے سر ہلا کر اسی ڈائننگ ٹیبل پر پڑی اپنی فائل اٹھائی اور اس کی طرف دیکھا۔

"یار! تم کیوں نہیں حصہ لیتیں ان ایکٹیویٹیز میں۔"

"مجھے نہیں پسند' خوامخواہ ٹائم ویسٹ ہوتا ہے۔" سمیرا نے ٹرے اٹھائی۔

"پاگل ہو تم۔۔۔ کوئی ٹائم وائم ویسٹ نہیں ہوتا۔ بلکہ کانفیڈینس پیدا ہوتا ہے۔ خیر اگلی دفعہ تم ضرور پارٹی سپیٹ کرنا۔"

"اچھا بھائی! اب جاؤ دیر ہو رہی ہے۔" سمیرا نے کچن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ اور وہ صحن میں کھڑی اپنے بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

"وہ سڑک کے کنارے چلتے چلتے بھاگنے لگی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور بالکل غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ وہ پتا نہیں کون تھی۔ میں نہیں جانتا تھا۔ وہ کیوں بھاگ رہی تھی۔ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا' پھر بھی پتا نہیں کیوں میں اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ شاید وہ کسی مشکل میں تھی۔ شاید کوئی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔۔۔ بھاگتے بھاگتے میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا لیکن میرے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ تو کیا وہ مجھ سے خوف زدہ ہو کر بھاگ رہی تھی۔۔۔ لیکن میں تو اسے نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ میں تو صرف اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور اس سنسان دوپہر میں تن تنہا اکیلی اس ویران سڑک پر کہاں جا رہی ہے۔۔۔

میں لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ بھی بھاگتے بھاگتے شاید تھک گئی تھی۔ اس کی چٹیا کے بال بھاگنے سے کھل گئے تھے۔ وہ مجھے رکتے دیکھ کر خود بھی رک گئی اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ میں ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو دیکھا اس کے لانبے سیاہ بالوں نے پوری طرح اسے ڈھانپ رکھا تھا۔ پشت پر' کندھوں پر' بازوؤں پر اس کے بالوں کا آبشار گرا ہوا تھا۔ میرا جی چاہا میں ریشم کے ان گچھوں کو چھو کر ان کی نرماہٹ محسوس کروں لیکن میں یوں ہی کھڑا رہا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کیا کہوں۔۔۔ کیا پوچھوں۔۔۔ پھر مجھے اس کی سسکیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔۔۔ وہ رو رہی تھی اور اس کی سسکیاں مجھے بے چین کر رہی تھیں۔

"تم کون ہو پیاری لڑکی! اور کیوں رو رہی ہو۔" میں نے بے حد نرمی سے پوچھا تو اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اس کے رخسار اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ سیاہ آنکھوں میں بلا کا حزن تھا۔

"حور عین!"

بے اختیار میرے لبوں سے نکلا تھا۔ "تم کیوں بھاگ رہی تھیں اور کس سے۔"

"پتا نہیں۔۔۔ شاید اپنے آپ سے' لیکن بھلا کوئی اپنے آپ سے بھی کہاں تک بھاگ سکتا ہے۔"

اس طرح روتے ہوئے مجھے وہ لطیفہ حدانیہ لگی۔ جسے اپنے محبوب کی قبر پر بال بکھرائے روتے دیکھ کر ہارون الرشید اپنا دل ہار بیٹھا تھا لیکن وہ لطیفہ حدانیہ نہیں تھی اور نہ ہی میں ہارون الرشید تھا۔"

عمر احسان کلپ بورڈ پر لگے کاغذوں کو پڑھنے میں اتنا منہمک تھا کہ اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ کب ایک فلک شاہ واش روم سے بال پونچھتے ہوئے باہر آگیا ہے۔ ایک نے بال پونچھ کر تولیہ صوفے پر پھینکا تو عمر احسان نے چونک کر کلپ بورڈ واپس رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی اور وہ بہت عقیدت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"تم بور تو نہیں ہوئے عمر!"

"نہیں بالکل نہیں۔۔۔ بلکہ میں آپ کی کہانی پڑھ رہا تھا۔ ابھی یہ مکمل تو نہیں ہے۔"

"ہاں یار!" اب وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے بال سنوار رہا تھا۔

"دراصل میں نے تمہارے دیے ہوئے عنوان پر رات لکھنے کی کوشش کی تھی' لیکن بات نہیں بنی۔"

"میرے؟" عمر احسان کو از حد حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں۔۔۔" ایبک کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"یاد ہے کل شام تم نے کیا کہا تھا۔"

عمر احسان کو یاد آیا۔ "وہ جو آپ نے اپنا خواب سنایا تھا تو میں سمجھا کوئی نئی کہانی ہے۔"

اور تمہاری بات سے ایک نئی کہانی کا عنوان تشکیل پا گیا تھا۔ زمین کے آنسو۔۔۔ اور میں نے سوچا میں اس پر ایک کہانی لکھوں گا۔ سو رات لکھنے کی کوشش کی لیکن پتا ہے پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ میرا قلم رک گیا۔ ورنہ جب میں قلم اٹھا لیتا ہوں تو پھر خود بخود ہی کہانی بنتی چلی جاتی ہے۔"

عمر احسان بہت اشتیاق سے اس کی بات سن رہا تھا۔ "پہلے تو آپ کے ذہن میں ایک پورا پلاٹ بنتا ہو گا نا' لیکن اس طرح عنوان پر لکھنا مشکل ہوتا ہو گا۔"

"تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں' جب میں چھوٹا تھا نا تقریباً" دس سال کا' تو میں نے عنوان پر ہی لکھنا اسٹارٹ کیا تھا۔ ہمارے ٹیچر ہمیں ایک عنوان دیتے تھے اور ہمیں اس پر کچھ لکھنا ہوتا۔ مثلاً "ظالم' عدل' موت وغیرہ۔ سب بچے چند جملے لکھتے اور میں ایک پوری کہانی تخلیق کر دیتا۔"

عمر احسان جو ہمیشہ ہی اس سے مرعوب رہتا تھا۔ کچھ اور مرعوب ہو گیا تھا کہ اس نے کتنی کم عمری میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ تب ہی آج وہ اتنے بلند مقام پر

تھا۔

"کیا خیال ہے اب چلیں؟"

"کہاں۔۔۔" عمر احسان نے بے خیالی میں پوچھا۔

"کیا تم نے ابھی کچھ دیر پہلے یہاں آتے ہی یہ نہیں کہا تھا کہ بابا جان کو بہت افسوس ہے کہ کل میں "الریان" آیا اور ان سے ملے بنا ہی چلا گیا اور یہ کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"وہ ہاں۔۔۔" عمر احسان کو یاد آیا کہ اس نے کچھ ایسی ہی بات کہی تھی کہ رات ڈنر کرتے ہوئے جب منیبہ شاہ نے اس کی آمد کا بتایا تھا تو بابا جان نے اس کے ملے بغیر چلے جانے پر اچھے خاصے افسوس کا اظہار کیا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ افسوس کرنے کے بعد جو کچھ انہوں نے کہا' وہ ہرگز ایسا نہیں تھا کہ ایبک فلک شاہ کو بتایا جاتا۔ منیبہ سے بات کرتے کرتے وہ احسان کی طرف مڑے تھے اور بہت آہستگی سے کہا تھا۔

"اپنے باپ کی طرح ہی ظالم اور کٹھور ہے۔"

احسان نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تھے لیکن صرف "بابا جان!" کہہ کر پلیٹ پر جھک گئے تھے اور عمر احسان' جس کا ایبک فلک شاہ سے بات کرکے جی نہیں بھرا تھا اور جسے منیبہ شاہ کی طرح اس بات کا ازحد دکھ تھا کہ رابیل احسان کے برتھ ڈے ڈنر میں شریک نہیں ہو سکا۔ سو کل رات کی تلافی کی خاطر آج وہ اپنے کالج سے دو پیریڈ لے کر ہی نکل آیا تھا اور پورے راستے دعا مانگتا آیا تھا کہ ایبک فلک شاہ کہیں چلا نہ گیا ہو اور واقعی ایبک' کرنل شیر دل کی انیکسی میں اپنے بیڈ پر نیم دراز کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ اس کے تکیے کے پاس کتابوں اور اخباروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ایبک نے کتاب تکیے کے پاس اوندھی کرکے رکھ دی۔ اس کے لبوں پر بڑی پرخلوص سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے عمر احسان نے ایک بار پھر دعا کی تھی کہ ایبک اس کی بات نہ ٹالے اور اس کے ساتھ الریان چلا آئے اور شاید یہ کوئی قبولیت کا دن تھا کہ ایبک بنا کچھ کہے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اس نے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ کمرے میں حدت تھی۔ شاید کچھ دیر پہلے ہی ہیٹر بند کیا گیا تھا۔ وہ اس انیکسی میں پہلے بھی تین' چار بار آچکا تھا۔ کرنل شیر دل نے یہ کمرا بہت پہلے سے ہی ایبک کے لیے مختص کر دیا تھا اور جب وہ بہاول پور ہوتا تھا تو تب یہ کمرا بند رہتا تھا۔ بیگم شیر دل اس کی غیر موجودگی میں اس کی صفائی وغیرہ کروا دیتی تھیں۔ عموماً" یہ انیکسی گیسٹ روم کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ کرنل شیر کے فرینڈز یہاں آکر ٹھہرتے تھے۔ لیکن جب چند سال پہلے ایبک فلک شاہ یونیورسٹی میں تھا اور ہاسٹل میں رہتا تھا تو ایک شام فلک مراد شاہ نے انہیں فون کیا تھا۔ ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ جیسے ڈھیروں آنسوؤں نے ان کے حلق کو بھر دیا ہو۔

"شیری! میرا ایبک یونیورسٹی ہاسٹل کے کمرے میں زخمی پڑا ہے اور میں دور ہوں۔۔۔"

نہ فلک مراد شاہ نے مزید کچھ کہا تھا اور نہ ہی کرنل شیر دل نے مزید کچھ پوچھا تھا۔ وہ اسی وقت ایبک کو لے آئے تھے اور پھر جب ایبک کے زخم بھر گئے اور وہ یونیورسٹی جانے لگا' تب بھی انہوں نے ایبک کو ہاسٹل میں واپس جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ تب سے اب تک یہ انیکسی ایبک کے لیے مختص ہو گئی تھی۔ وہ وقت بے وقت جب بھی آئے اسے یہیں ٹھہرنا ہے۔ یہ کرنل شیر دل کا حکم تھا اور یہ بات سب ملازم بھی جانتے تھے۔ مگر پتا نہیں وہ اتنا بھلکڑ کیوں تھا۔

اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا اور کھڑا ہو گیا۔ پتا نہیں وہ سچ مچ بھلکڑ تھا یا ایبک فلک شاہ کے سامنے بہت سی باتیں بھول جاتا تھا۔ کئی کئی دن وہ سوچتا رہتا تھا کہ اب کے ایبک آیا تو وہ اس سے یہ یہ باتیں کرے گا' لیکن جب بھی ایبک آتا وہ اس کی شخصیت کے سحر میں ایسا گرفتار ہوتا کہ سب کچھ بھول جاتا تھا۔

"یہ لطیفہ حدانیہ کون ہے۔" بائیک کو کک مارتے ہوئے اس نے ایبک فلک شاہ سے پوچھا۔

"احمصی ایک مشہور شاعر تھا۔ لطیفہ حدانیہ اس کی محبوبہ تھی۔" اس کے پیچھے بیٹھتے ہوئے ایبک فلک

شاہ نے بتایا اور عمر احسان نے سوچا۔ وہ جو کوئی بھی تھا جیسا بھی تھا لیکن لطیفہ حدانیہ یقیناً" بہت خوب صورت رہی ہوگی۔

"ایبک بھائی! آپ نے جب بھی یہ کہانی مکمل کی، سب سے پہلے مجھے پڑھنے کے لیے دیجیے گا۔" بائیک روڈ پر لاتے ہوئے اس نے ایبک فلک شاہ سے یقین دہانی چاہی اور وہ کبھی بھی عمر احسان کی بات نہیں ٹالتا تھا۔ اسے اپنا یہ کزن جو عمر میں اس سے کافی چھوٹا تھا اور اسے لیول کر رہا تھا' بے حد عزیز تھا۔ اس کی سب اونگی بونگی باتیں وہ بہت دھیان سے سنتا تھا مگر پتا نہیں کیا بات تھی کہ اسی عمر احسان کی بڑی بہن رابیل احسان کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ پہلے روز ہی جب وہ ہمدان مصطفیٰ کے ساتھ "الریان" آیا تھا اور ہمدان مصطفیٰ نے اس کا تعارف کروایا تھا۔

"یہ ہیں ایبک فلک شاہ' عمارہ پھپھو کے بیٹے۔"

اور رابیل احسان جو ٹی وی لاؤنج میں اسی وقت داخل ہوئی تھی' کسی قدر نخوت سے اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر ہمدان مصطفیٰ سے اسی نخوت بھرے انداز میں کہا تھا۔

"یہ اتنے سالوں بعد آج تمہیں عمارہ پھپھو کے بیٹے کو "الریان" میں لانے کا خیال کیونکر آگیا' جبکہ آج سے پہلے تو کبھی کسی نے "الریان" میں ایبک فلک شاہ کا ذکر کیا نہ ہی عمارہ پھپھو کا۔" منیبہ شاہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھی تھی اور اس نے رابیل احسان کو غصے سے دیکھا تھا۔

"یہ ضروری تو نہیں ہے کہ ہر شخص تمہیں سنا سنا کر عمارہ پھپھو اور ایبک فلک شاہ کا ذکر کرے اور عمارہ پھپھو کا نام تو "الریان" کی اینٹ اینٹ پر لکھا ہے اور اس گھر کے در و دیوار نے اتنی بار عمارہ پھپھو' فلک مراد شاہ' ایبک فلک شاہ اور انجم فلک شاہ کا ذکر سنا ہے کہ تم انہیں انگلیوں پر گن بھی نہیں سکتیں۔"

ایبک فلک شاہ جو رابیل احسان کی بات پر خاصا بددل ہو کر سوچ رہا تھا کہ اسے "الریان" نہیں آنا چاہیے تھا' مسکرا کر اپنی اس مخلص سی کزن کی طرف متوجہ ہو گیا' جو بہت نرمی اور محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ منیبہ شاہ اس کے سب سے بڑے ماموں مصطفیٰ عبدالرحمٰن شاہ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی اور اس نے پہلے ہی روز اس کے دفاع میں بول کر گویا ہمیشہ کے لیے اس کے دفاع کی ذمہ داری سنبھال لی تھی اور ہر لحہ اس کی وکالت پر کمربستہ رہتی تھی۔

کرنل شیر دل کی انیکسی سے لے کر "الریان" تک کے سفر میں عمر احسان نے کل شام کی ساری روداد اس کے کانوں میں انڈیل دی تھی اور "الریان" کے اندر داخل ہوتے ہوئے ایبک فلک شاہ کے لبوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی۔ اس نے دعا کی تھی کہ کم از کم آج کے دن اس کا رابیل احسان سے ہرگز سامنا نہ ہو' کیونکہ آج وہ بہت دیر بابا جان کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا اور اسے آج ان سے بہت کچھ کہنا بھی تھا۔ بہت ساری باتیں تھیں' جو پچھلے کئی ماہ سے ان سے کہنا چاہتا تھا لیکن ہر بار کہتے کہتے رہ جاتا تھا۔ کل شام بھی رابیل احسان کی واضح ناگواری محسوس کر کے وہ جلدی چلا آیا تھا۔۔۔ ورنہ اس کا ارادہ رات الریان میں ہی ٹھہرنے کا تھا۔

لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اسے احساس ہوا تھا کہ کبھی کبھی دعائیں پوری نہیں ہوا کرتیں۔ رابیل احسان اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ لاؤنج میں چائے کا بڑا سا مگ لیے کھڑی تھی۔

"ارے آپی! آج آپ یونیورسٹی نہیں گئیں۔" عمر احسان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ وہ اپنی سرخ ہوتی ناک کو ٹشو سے صاف کرتے ہوئے عمر احسان کی بات کا جواب دیے بغیر اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی۔ عمر احسان خجالت سے سر کھجانے لگا۔

"ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا۔" ایک مدھم مسکراہٹ کے ساتھ ایبک نے ہولے سے اس کا کندھا دبایا تھا اور پھر یوں ہی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے رکھے وہ بابا جان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز اخبار دیکھ رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی یک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے ان کی آنکھوں اور ان کے چہرے سے خوشی جھلکنے لگی تھی۔ ہونٹ بے اختیار کھل گئے تھے۔ عمر نے دیکھا تھا کہ رات والے غصے اور ناراضی کے ان کے چہرے پر کوئی بھی آثار نہ تھے۔

"آؤ۔۔۔ آؤ بیٹا! بیٹھو میرے پاس ادھر۔"

انہوں نے ٹانگیں سمیٹ کر اس کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ ایبک نے بیٹھنے سے پہلے جھک کر ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بہت عقیدت سے بوسہ دیا تھا اور عبدالرحمٰن شاہ کی آنکھیں یک دم گیلی ہو گئیں۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بے اختیار اس کی پیشانی چوم لی۔

"کل تم آئے اور چلے بھی گئے۔ تم کم از کم ڈنر تک تو رک جاتے۔ رابی کے برتھ ڈے پر سب کو باہر جانا تھا۔" اس کے بیٹھتے ہی انہوں نے گلہ کیا تھا۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر معذرت کر دی۔

"میں ضرور رک جاتا کم از کم آپ سے تو مل کر ہی جاتا' لیکن مجھے ضروری کام سے جانا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں آپ سے ملے بغیر بہاول پور چلا جاتا۔ اگلے دو دن میں بہت مصروف ہوں اور پھر پرسوں واپس جانا تھا تو اس لیے آج آگیا۔ حالانکہ اس وقت ماموں جان وغیرہ سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔"

"لیکن بیٹا! رابی کی برتھ ڈے پارٹی میں شرکت کر لیتے۔ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی۔"

"لیکن بابا جان! کوئی بن بلائے کیسے کسی فنکشن میں شرکت کر سکتا ہے۔" عمر احسان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں سے یک دم غصہ اور ناراضی جھلکنے لگی تھی۔

"کل شام ایبک بھائی کو کسی نے بھی ڈنر میں شرکت کے لیے نہیں کہا۔۔۔ ہاں انفارم ضرور کیا تو؟" اس نے سوالیہ نظروں سے بابا جان کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں نمی سی پھیل گئی اور اندر کہیں کسی گہرے دکھ نے دل کو اپنی گرفت میں لیا۔

"کیا "الریان" کے مکینوں کے لیے ایبک فلک شاہ ہمیشہ اجنبی اور غیر رہے گا۔ کیا الریان پر میری عمارہ کا کوئی حق نہیں رہا۔ کیا چھبیس سال پہلے کی گئی غلطی کا خمیازہ ہمیں ساری عمر بھگتنا ہو گا۔ کاش! ہم عمارہ کو یہاں لاسکنے پر قادر ہوتے۔۔۔ کاش!

شاید یہ سارا ہمارا ہی قصور ہے۔ ساری غلطی ہماری ہے کہ آج ہماری عمو کا بیٹا اس گھر میں اجنبیوں کی طرح آکر چلا جاتا ہے اور اس گھر کے کسی فنکشن یا کسی خوشی میں کبھی کسی نے اسے شرکت کے لیے نہیں کہا۔ کاش! اس رات ہم نے ہی صبر کر لیا ہوتا۔ ہمیں اتنا غصہ نہ آتا۔ ہم اس طرح اسے گھر سے نکل جانے کو نہ کہتے۔ روز محشر ہم مراد شاہ کو کیا منہ دکھائیں گے اور اگر سلجوق نے ہم سے پوچھ لیا۔ "عبدالرحمٰن! تم تو میرے بھائیوں جیسے دوست تھے۔ پھر تم نے میرے بیٹے کو یوں خود سے الگ کر کے کیوں پھینک دیا اور وہ صرف میرا بیٹا ہی نہیں' تمہاری عمارہ تمہاری پیاری عمو کا شوہر بھی تو تھا۔" پھر ہم کیا جواب دیں گے ہم سے غلطی ہوئی تھی تو وہ ہی اتنے غصے میں نہ آتا۔"

ان کا جی چاہا وہ دھاڑیں مار مار کر روئیں۔

ہر بار کی طرح اس بار بھی ان کا جی چاہا کہ وہ اپنی ساری انا اور مصلحتیں ایک طرف رکھ کر اڑتے ہوئے مراد پیلس جا پہنچیں اور اپنی عمو کو سینے سے لگا کر اتنا روئیں کہ چھبیس سالوں کی جدائیاں ان آنسوؤں میں بہہ جائیں۔ لیکن بیچ میں چھبیس سالوں کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ پاٹنے کے لیے جس حوصلے کی ضرورت تھی' وہ خود میں یہ حوصلہ نہیں پا رہے تھے۔

کاش انہوں نے یہ رابطے ختم نہ کیے ہوتے۔ آخر رابطے توڑنے میں کون سی مصلحتیں تھیں۔ فلک مراد شاہ اور عمارہ شاہ بھلے "الریان" نہ آتے لیکن رابطے اس طرح تو نہ ٹوٹتے کہ آج ایبک فلک شاہ ان کا اکلوتا نواسا "الریان" کے لیے اجنبی ہوتا۔ ایسا کیا تھا جس نے انہیں مراد پیلس سے ہر رابطہ توڑ کر دور کر دیا تھا۔

انہوں نے تنہائی میں کتنی ہی بار سوچا تھا اور ہر بار کئی حقیقتوں کا انکشاف ہوا تھا۔ لیکن انہوں نے ہر بار ہی اپنا وہم سمجھ کر انہیں جھٹک دیا تھا اور خود ہی کو

قصوروار گرداناتھا۔

ایبک نے ان کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو بغور دیکھا تھا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہولے سے دبایا تھا۔

"کل ہومی سے بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی تمہاری؟" انہوں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"ارے باباجان! ہومی بھائی بھی تو وہیں تھے۔ ہومی بھائی اور منیبہ آپا کو ہمیشہ کی طرح ان کے جانے کے بعد یاد آیا تھا کہ انہیں ایبک بھائی کو ڈنر پر انوائٹ کرنا چاہیے تھا۔" غصہ اب بھی عمر احسان کی آنکھوں میں بل کھا رہا تھا۔

"اب غصہ تھوک بھی دو یار!" ایبک مسکرایا۔ "تم اپنے برتھ ڈے پر مجھے انوائٹ کرنا' میں ضرور آؤں گا۔" عمر مسکرا دیا تھا۔

ایبک عبدالرحمٰن صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا جو بہت محبت اور شفقت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"باباجان اور ماما جانی بالکل ٹھیک ہیں۔" اس نے ان کی آنکھوں میں ابھرتے اس سوال کو پڑھتے ہوئے کہا تھا۔ جسے وہ ہزار کوششوں کے باوجود بھی زبان سے ادا نہ کر پا رہے تھے۔

"انجی بھی مزے میں ہے' خوش ہے۔"

"انجی... ان کی عمو کی بیٹی' جسے انہوں نے دیکھا تک نہ تھا اور کیا اس کا حق نہیں بنتا تھا کہ اس گھر کے اتنے لڑکوں میں سے کوئی ایک لڑکا..."

انہوں نے دل میں اٹھنے والے درد کو بے اختیار ہونٹ بھینچ کر برداشت کرنے کی کوشش کی۔

"کبھی انجی آپا کو بھی لے کر آئیے نا یہاں؟" عمر احسان نے جیسے ان کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

"ہاں ضرور... جواو سے کہوں گا' بھئی اب انجی پر ہمارا اختیار کہاں؟" وہ مسکرایا تھا اور ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"انجی کے سسرال والے کیسے ہیں ایبک! اور جواو خود؟" آج پہلی بار انہوں نے خود سے کوئی سوال کیا تھا۔

"سب بہت اچھے ہیں باباجان!" اور تب ہی دروازہ کھول کر ثنا مامی اندر داخل ہوئی تھیں۔

"السلام علیکم مامی!" وہ احتراماً" کھڑا ہو گیا۔

"ارے ایبک تم..." ثنا مامی کو سچی خوشی ہوئی تھی اسے دیکھ کر۔

"بیٹھو... بیٹھو بیٹا! کیسے ہو؟"

"جی ممانی جان! اللہ کا شکر ہے ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"اور عمو کیسی ہے اور فلک بھائی؟" وہ جب بھی آتا ثنا مامی سب کے متعلق بہت محبت سے پوچھتی تھیں۔

"بہت یاد آتی ہے عمو۔ بہت جی چاہتا ہے اس سے ملنے کو۔"

انہوں نے کبھی اپنے جذبے چھپائے نہیں۔ ہمیشہ برملا ان کا اعتراف کرتی تھیں۔ انہوں نے ہی ہمدان مصطفیٰ کو بہاول پور بھیجا تھا اور بتایا تھا کہ بہاول پور میں تمہاری ایک بہت پیاری پھپھو رہتی ہیں۔

ثنا مامی مصطفیٰ ماموں کی بیوی تھیں۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ عرفان اور ان سے چھوٹی رانیہ کی شادیاں مرتضیٰ کے گھر ہوئی تھیں اور وہ دونوں ہی فرانس میں رہتے تھے۔ خود مرتضیٰ اپنی فیملی کے ساتھ بہت سال پہلے فرانس چلے گئے تھے۔ سال دو سال بعد ان کا چکر لگتا تھا۔ مرتضیٰ کے چار بچے تھے۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں' شادی شدہ تھیں۔ جبکہ منیبہ شاہ سب سے چھوٹی تھی اور کئی سال پہلے دادی جان نے اسے الریان میں ہی رکھ لیا تھا۔ رانیہ سے چھوٹا ہمدان مصطفیٰ اور پھر حفصہ تھی۔

"کل مجھے پتا ہی نہیں چلا اور تم آکر چلے بھی گئے۔ اب تو رکو گے نا... کھانا کھا کر جانا۔" باتیں کرتے کرتے وہ عمر کے قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔

"جی ابھی کچھ دیر باباجان سے گپ شپ لگاؤں گا۔ کھانے کی خیر ہے۔"

"ہومی بتا رہا تھا کہ آج کل کرنل شیردل اپنے گاؤں گئے ہوئے ہیں' تمہیں کھانے وغیرہ کی تکلیف ہوتی ہوگی۔"

"یہ ہومی بھی بس..." ایبک فلک شاہ نے دل ہی دل میں کہا۔

"آخر تم اتنی غیریت کیوں برتتے ہو بیٹا! تمہیں سیدھا ادھر ہی آنا چاہیے تھا اور اب جتنے دن ہو ادھر ہی رکو..." پھر اس کا جواب سنے بغیر وہ باباجان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ایبک فلک شاہ کے پاس کوئی جواب تھا بھی نہیں۔

"باباجان! آج آپ کے لیے کیا پکواؤں۔"

"جو جی چاہے بیٹا! بنوالو۔"

"کتنے دن ہو گئے ہیں آپ کو سبزیاں کھاتے ہوئے۔ اب تک تو یورک ایسڈ صحیح ہو گیا ہوگا۔ سبزی کے ساتھ تھوڑی سی یخنی نہ بنوالوں؟" وہ کھڑی ہو گئی تھیں اور پھر جیسے انہیں یاد آیا۔

"رات عثمان بھائی کا فون آیا تھا۔ شاید وہ اگلے مہینے تک چکر لگائیں۔ میرا خیال ہے وہ عادل اور حفصہ کی منگنی یا نکاح کرنا چاہ رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے آکر باباجان سے بات کروں گا۔"

"ہاں بات ہوئی تھی میری اس سے۔" باباجان نے آہستگی سے کہا۔ "اس نے عادل کے لیے وہاں جاب کا انتظام کر لیا ہے تو چاہ رہا تھا کہ یہ کام بھی ہو جائے۔"

عادل عثمان اور مرینہ عثمان' عثمان عبدالرحمٰن کے دو ہی بچے تھے۔ خود عثمان تو دبئی میں بینک آف انگلینڈ میں جاب کرتے تھے اور دونوں بچے تعلیم کی غرض سے "الریان" میں تھے' جبکہ وہ خود ہر سال دو ماہ کی چھٹی پر گھر آتے تھے۔ جبکہ گرمیوں کی چھٹیوں میں عادل اور مرینہ وزٹ ویزے پر دبئی چلے جاتے تھے۔ عادل نے اکنامکس میں ماسٹر کیا تھا اور چھ ماہ سے یہاں ایک پرائیویٹ بینک میں جاب کر رہا تھا۔ مرینہ میڈیکل کے تیسرے سال میں تھی۔

"رانی نے ناشتا کیا؟" باباجان نے ثنا مامی سے پوچھا تو ایبک نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"اس نے صرف چائے لی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اٹھی ہے۔ بھابھی بتا رہی تھیں اسے کچھ فلو کی شکایت ہے۔"

انہیں اپنی یہ پوتی بہت پیاری تھی۔ جب بھی وہ اسے دیکھتے تو انہیں ایبک کا خیال آتا تھا۔ اس وقت بھی جب ایبک الریان نہیں آتا تھا' وہ اس کے متعلق سوچتے ضرور تھے۔

"باباجان! مما بتاتی ہیں کہ میرے دادا جان آپ کے بہت گہرے دوست تھے۔" ثنا مامی کے ساتھ ہی عمر احسان بھی چلا گیا تھا۔

انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ جب سے وہ الریان آ رہا تھا کہ آج پہلی بار اسے یوں باباجان کے پاس اکیلے بیٹھنے کا موقع ملا تھا اور آج وہ ان سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔ اس کے پاس بہت سارے سوال تھے' جنہیں وہ بابا اور ماما سے نہیں کر سکتا تھا یا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"سلجوق میرا دوست تھا۔ میرا بھائی تھا۔ بہت ہی پیارا' بہت ہی عزیز تھا مجھے۔ اس سے رشتہ داری تو بہت دور کی تھی لیکن دلی تعلق بہت قریبی تھا۔ بہت خوب صورت تھا وہ۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ کیا کوئی مرد بھی اتنا خوب صورت ہو سکتا ہے' اتنا حسین' اس پر اس کے مزاج میں بلا کا تحمل تھا۔ عجب دل موہ لینے والی عاجزی تھی۔ جو بھی اس سے ملتا تھا' اس کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ فلک تو اس کے پاسنگ بھی نہیں ہے۔"

باباجان کا بھی بڑے دنوں بعد جی چاہا تھا کہ وہ کسی کو اپنا سینہ کھول کر دکھائیں۔ وہاں کیسی خوب صورت اور المناک یادیں رقم تھیں اور ایبک فلک شاہ سے بہتر سامع اور کون ہو سکتا تھا۔ کتنے سارے سال ہو گئے تھے انہوں نے کسی سے سلجوق' عمارہ اور موی کی باتیں نہیں کی تھیں۔

آج ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ یادوں کا پٹارہ کھول کر ایک ایک یاد ایبک فلک شاہ کے سامنے رکھتے جائیں اور پھر اس سے پوچھیں کہ بتاؤ کیا سب ہمارا قصور تھا؟ اگر تھا تو ہم کہاں اور کتنے قصوروار ہیں؟

کیا یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم نے اپنی لاڈلی بیٹی عمو کا ہاتھ فلک شاہ کے ہاتھوں میں دیا تھا محض ایک پرانے عہد کو نبھاتے ہوئے؟

یا پھر یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم موی کو اپنا سمجھ بیٹھے تھے۔ اس لیے ہم نے اسے ان غلط سرگرمیوں میں حصہ لینے سے روکا تھا‘ سمجھایا تھا؟
اور اگر یہ ہماری غلطی نہیں تھی تو پھر عمو کی ماں سے ہم ساری زندگی کیوں نظر ملا کر بات نہیں کر سکے۔ کیوں ہمیں لگتا رہا کہ ہم ان کے مجرم ہیں؟
ان کی آنکھوں میں یک دم ہی نمی اتری تھی اور ایبک فلک شاہ نے جو بہت گہری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا‘ ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اس کے فون کی بیل بج اٹھی۔۔۔ اس نے فون نکال کر دیکھا۔ فلک شاہ کا نمبر تھا۔ لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ لیے اس نے بابا جان کی طرف دیکھا۔
”بہاول پور سے فون ہے۔ شاید ماما کا۔“ اس نے جان بوجھ کر ان کا نام لیا تھا۔
عبدالرحمٰن شاہ کے چہرے پر سایہ سا آکر گزر گیا۔
”جی بابا! کیسے ہیں آپ؟“ اس نے فون کان سے لگایا۔ لیکن پھر یکایک ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ ایک دم گھبرا کر کھڑا ہوا۔ دوسری طرف فلک شاہ رو رہے تھے۔
”ایبک! جلدی آجاؤ‘ تمہاری ماما اسپتال میں ہیں۔“
”کیا۔۔۔ کیا ہوا ماما کو۔۔۔ وہ اسپتال میں کیوں ہیں۔“
اس نے قدرے بلند آواز میں پوچھا تو عبدالرحمٰن شاہ کا دل یک دم جیسے ڈوب کر ابھرا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے لیکن وہ انہیں نہیں دیکھ رہا تھا۔
”بابا! بابا! پلیز بولیں نا۔“ دوسری طرف سے بمشکل تمام فلک شاہ نے کہا تھا۔
”بس تم آجاؤ۔۔۔ جانتے ہو نا‘ میں بہت کمزور ہوں۔“
”لیکن ماما۔۔۔“
مگر فلک شاہ نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ فون جیب میں ڈالتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس نے مڑ کر عبدالرحمٰن شاہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ جن کے اٹھے ہوئے ہاتھوں پر ان کے آنسو گر رہے تھے۔ زارا کے بعد اب عمارہ۔۔۔ نہیں میرے اللہ!
”یا اللہ! میری بچی کو صحت و زندگی دینا۔“
ایبک فلک شاہ ادھر ادھر دیکھے بغیر تیزی سے لاؤنج کا دروازہ کھول کر پورچ کی سیڑھیاں پھلانگتا گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ عمر احسان نے اسے ماما کے بیڈ روم کے کھلے دروازے سے باہر جاتے دیکھا تو تیزی سے اس کے پیچھے لپکا اور جب وہ گیٹ تک پہنچا تو وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔
وہ سر جھکائے واپس پلٹا۔ آج کتنا اچھا موقع تھا کہ وہ جی بھر کر ایبک فلک شاہ سے باتیں کرتا لیکن مما نے بلاوجہ ہی اسے روک لیا تھا۔ پتا نہیں مائرہ احسان کو اس کا ایبک شاہ کے ساتھ ملنا اتنا ناپسند کیوں تھا۔
”شا چچی تو کہہ رہی تھیں کہ ایبک لنچ ہمارے ساتھ ہی کرے گا۔ پھر ایسا کیا ہو گیا تھا کہ وہ اس سے ملے بغیر ہی نکل گیا تھا۔“ یہی سوچتا ہوا عمر جب بابا جان کے کمرے میں آیا تو وہ اپنی آنکھیں پونچھ رہے تھے۔
”کیا ہوا بابا جان! اور یہ ایبک بھائی اس طرح اچانک کیوں چلے گئے؟“
انہوں نے اس کی طرف دیکھا تو آنسو ایک بار پھر ان کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
”عمر! تم مجھے لے چلو گے۔۔۔ پلیز مجھے لے چلو۔“ انہوں نے عمر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
”کہاں۔۔۔ کہاں بابا جان! میں آپ کو لے چلتا ہوں بابا جان! پلیز ریلیکس۔“
”میری بچی۔۔۔!“
لفظ ان کے ہونٹوں میں ہی رہ گئے اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہوئے۔ اٹھارہ سالہ عمر نے انہیں سہارا دینے کی کوشش کی لیکن وہ گرتے ہی چلے گئے۔ عمر نے بمشکل انہیں سنبھالا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ عمر کو ان کا جسم بے جان ہوتا لگا تو وہ بری طرح چیخنے لگا۔
”مما۔۔۔ مما۔۔۔ چچی جان۔۔۔ رابی آپی۔۔۔!“

☼ ☼ ☼
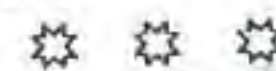
وہیل چیئر کے ہتھے پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے انہوں نے ایبک فلک شاہ کی طرف بے چینی سے دیکھا جو اپنی آستین کے کف لگاتے ہوئے اندر آیا تھا۔
”بابا! میں اب چلتا ہوں۔“
”یار! مجھے بھی لے چلو عمارہ کے پاس‘ وہ ٹھیک ہے نا۔“
وہ ان کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے تھوڑا سا جھکا۔
”ماما بالکل ٹھیک ہیں بابا! ابھی ابھی جواد کا فون آیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ ہم انہیں لے جا سکتے ہیں۔“
ان کے پژمردہ چہرے پر ہلکی سی رونق آگئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھر پریشان نظر آنے لگے۔
”لیکن پھر جواد اسے لے کر کیوں نہیں آیا۔ تم کیوں جا رہے ہو۔۔۔ انجی اور جواد وہاں تھے نا تمہاری ماما کے پاس۔ ڈاکٹر نے جب اجازت دے دی تھی تو پھر وہ وہاں کیوں رکے ہوئے ہیں۔“
”اوہ بابا! آپ بہت وہمی ہو گئے ہیں۔“ ان کے کندھے سے ہاتھ اٹھا کر سیدھا ہوتے ہوئے ایبک مسکرایا۔ ”دراصل ماما کے جو ڈاکٹر ہیں نا انہوں نے کہا ہے ڈاکٹر مہدی آجائیں تو ایک بار ان سے بھی چیک کروالیں اور کچھ انسٹرکشن وغیرہ لے لیں۔“
”ڈاکٹر مہدی وہی نا جو ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں۔“ انہوں نے ایبک فلک شاہ کی طرف دیکھا۔
”جی بالکل وہی۔ جواد کہہ رہا تھا۔ گیارہ بارہ بجے تک آجائیں گے۔ ویسے بابا! ماما کو پہلے تو کبھی ہارٹ کی تکلیف نہیں ہوئی۔“
”گوشت کا ایک ننھا سا لوتھڑا ہی تو ہے نا۔ کتنا جبر برداشت کر سکتا ہے۔“
انہوں نے ایک گہری سانس لی اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا‘ لیکن پھر محض سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئے۔ ایبک نے ٹیبل پر سے گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے بغور انہیں دیکھا۔ وہ جانتا تھا وہ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ تین دن سے ان کی نظروں میں کیا سوال چھپا ہوا ہے۔ لیکن وہ کیا کہتا‘ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں تھا۔ خود اس نے بھی کئی بار سوچا تھا کہ الریان سے کسی کا فون کیوں نہیں آیا اور نہیں تو کم از کم ہمدان مصطفیٰ کو تو پوچھنا چاہیے تھا۔ آخر بابا جان نے بتایا کہ تو ہو گا کہ میں اچانک وہاں سے کیوں چلا آیا تھا اور عمر احسان۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے تین دن ان کے فون کا انتظار کیا تھا۔ بلکہ ایک‘ دو بار اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ کیا خبر بابا جان ہی ماما کی بیماری کی خبر سن کر انہیں دیکھنے آجائیں۔ اتنے دنوں کی جمی برف پگھل جائے‘ لیکن۔۔۔
”بیٹا! تم نے کیا بتایا تھا انہیں۔۔۔ تم اس وقت بابا جان کے پاس تھے‘ جب میں نے فون کیا تھا۔“
اتنے دنوں سے دل میں اٹھتے سوال کو آج اذن گویائی مل ہی گیا تھا۔
ایبک چونکا تھا۔ ”جی میں الریان میں ہی تھا تب۔ لیکن بابا! اتنا کمزور دل ہے آپ کا۔۔۔ آپ نے تو مجھے بھی بوکھلا دیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا وہ سب جو آپ نے اپنے متعلق بتایا ہے۔۔۔ وہ شاہی قلعہ کی قید۔۔۔ وہ کوٹ لکھپت کی اذیتیں۔۔۔ وہ سب آپ نے برداشت کی ہیں۔“
”دیمک۔۔۔ اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیتی ہے بیٹا! اور مجھے بھی دکھ کی دیمک ہولے ہولے اندر سے چاٹ رہی ہے۔ الریان سے جدائیوں کا دکھ‘ تمہاری ماما کے رشتے چھن جانے کا دکھ۔۔۔“ ان کے چہرے سے کرب جھلکنے لگا تھا۔
”وہ بھی ایک دور تھا جب فلک مراد شاہ شیر کی طرح دھاڑتا تھا اور پولیس والے بھی اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ایک بار سوچتے تھے۔ جب زمین اس کے قدموں کی دھمک سے کانپتی تھی اور۔۔۔“
”بابا! پلیز لیواٹ (چھوڑیں) وہ سب جو گزر چکا‘ بھول جائیں اسے۔“
”بھولنا ہی تو مشکل ہوتا ہے جان پدر۔۔۔ خدا نہ کرے کہ تمہیں کبھی کچھ بھولنا پڑے۔ وہ سب لوگ جن کے ساتھ آپ کھیل کود کر بڑے ہوئے ہوں۔

جن کی محبتیں آپ کے لہو میں خون کے ساتھ گردش کر رہی ہوں۔ ان محبتوں کو جوانی کے جوش میں جھٹک کر آپ آ تو جاتے ہیں، لیکن بھلا خون میں گردش کرتی محبتیں بھلائی جا سکتی ہیں۔ میں تمہاری ماما کا مجرم ہوں۔"

"پلیز بابا! آپ خود کو سنبھالیں۔" اس نے ان کے بازو کو ہولے سے تھپتھپایا۔

"کوئی کسی کا مجرم نہیں ہے۔ یہ سب ایسا ہی ہونا تھا۔ یہی تقدیر میں لکھا تھا۔"

"دیکھو نا ایبک! یہ الریان والے کتنے ظالم ہیں۔ عمارہ کی اتنی بیماری کا سن کر کوئی آیا تک نہیں۔ فون بھی نہیں کیا۔ ہیں نا۔ ہمدان نے بھی نہیں پوچھا اپنی پھپھو کا حال۔"

انہوں نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔

"ہو سکتا ہے بابا جان کی سمجھ میں ہی نہ آیا ہو۔ میں تو آپ کا فون سنتے ہی باہر نکل آیا تھا۔ آپ کے رونے نے مجھے بالکل حواس باختہ کر دیا تھا۔ انہوں نے شاید کچھ پوچھا تو تھا لیکن میں نے ہی مڑ کر انہیں جواب نہیں دیا تھا۔"

اس نے ان سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔ حالانکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے خاصی بلند آواز میں بات کی تھی۔ لیکن فلک مراد شاہ رنجیدہ ہو چکے تھے۔ اس کے یہ لفظ بالکل کھوکھلے لگے تھے۔ انہوں نے اس کی اس وضاحت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ ایبک نے ان کے بازو کو تسلی دینے کے انداز میں ایک بار پھر تھپتھپایا۔

"بابا! میں جا رہا ہوں اور آپ نے کچھ نہیں سوچنا پلیز۔"

لیکن سوچوں پر بھی کبھی کسی کا اختیار رہا ہے۔ جو ان کا ہونا... ایبک چلا گیا تھا۔ اور وہ سوچوں ہی سوچوں میں الریان جا پہنچے تھے۔

"الریان" میں زندگی تھی۔ رونق تھی۔ خوشیاں تھیں اور محبتیں تھیں۔ جبکہ مراد پیلس میں خاموشیاں راج کرتی تھیں۔ دادی جان اور دادا جان کی بے تحاشا محبتوں کے باوجود کبھی کبھی ان کا دل مراد پیلس میں بے حد گھبرا جاتا تھا اور وہ الریان میں جانے کے لیے مچل اٹھتے تھے۔

زریں کے ساتھ قیام کے چار سالوں نے انہیں ضدی بھی بنا دیا تھا۔ دادا جان ان کی ضد پر انہیں ساتھ لے کر الریان آ جاتے۔

"عبدالرحمٰن بیٹا! سنبھالو اپنے بیٹے کو۔ اسے یہ بوڑھا دادا اب اچھا نہیں لگتا۔" وہ عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دیتے ہوئے ہنسے تھے۔

"ایسا کرو اسے اپنا بیٹا ہی بنا لو۔"

"یہ میرا بیٹا ہی ہے چچا جان۔"

عبدالرحمٰن شاہ اسے گلے سے لگا لیتے۔ پھر الریان میں دن کیسے پر لگا کر اڑ جاتے تھے۔ "تمہاری دادی جان بہت اداس ہو رہی ہیں موی! کہو تو لینے آ جاؤں۔ رات بھی وہ رو رہی تھیں تمہیں یاد کر کے۔" دادا جان اسے جذباتی طور پر بلیک میل کرتے۔ وہ دادی جان اور دادا جان سے ملنے کو بے تاب ہو جاتے۔

"آ جائیں دادا جان! ابھی آ جائیں۔" وہ واپس مراد پیلس جانے کو بے چین ہو جاتے۔

"مت جاؤ یار! تمہارے بغیر دل نہیں لگتا۔" احسان اسے روکتا۔

"تو اب تم آ جاؤ میرے ساتھ وہاں مراد پیلس۔"

عمارہ تو ان کے جانے کا سن کر جو رونا شروع کرتی تو پھر اس کے جانے تک روتی رہتی تھی۔ الریان میں ان کا زیادہ وقت احسان، عمارہ اور زارا کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ عثمان، مرتضیٰ، مصطفیٰ تو اپنی پڑھائی میں مصروف رہتے تھے لیکن وہ تینوں بھی اس سے محبت کرتے تھے۔ وقت ملتا تو اس سے گپ شپ لگاتے تھے۔ وہ سب گھومنے بھی جاتے تھے۔ غرض الریان میں مزے ہی مزے تھے۔ لیکن وہ دادا جان اور دادی جان کے بغیر بھی تو زیادہ عرصہ نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ دو دنیاؤں میں بٹ چکے تھے۔ اس کے لیے آدھی دنیا الریان تھا تو آدھی مراد پیلس۔

وقت گزرتا رہا، وہ ایف اے میں پہنچ گئے۔ لیکن الریان سے ان کی محبتیں کم نہیں ہوئی تھیں۔ وہ اب بھی آدھی چھٹیاں الریان میں گزارتے تھے اور بقیہ آدھی چھٹیوں میں احسان، عمارہ اور زارا کو اپنے ساتھ مراد پیلس لے آتے تھے۔

انہوں نے ایف ایس سی میں بہاولپور میں بورڈ میں ٹاپ کیا تھا اور عبدالرحمٰن شاہ نے الریان میں اس خوشی میں ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ بہاولپور سے دادا جان اور دادی جان بھی آئے ہوئے تھے۔ مروہ پھپھو اور عبداللہ چچا بھی آئے تھے۔ مروہ پھپھو کی شادی کے بعد عبداللہ چچا اور بینا چچی بھی بحرین چلے گئے تھے۔ جانے سے پہلے بینا چچی نے اپنی بہن کا بیٹا لے لیا۔

عبدالرحمٰن شاہ ان کی شان دار کامیابی پر بے حد خوش تھے۔

"چچا جان! آپ بہت لکی ہیں۔ میرے چاروں نالائقوں میں سے کسی نے آج تک بورڈ میں پوزیشن نہیں لی۔ وہ کتابی کیڑا مرتضیٰ بھی دو، چار نمبروں سے رہ جاتا ہے۔ وہ سلجوق بھی اتنا ہی لکی تھا۔ میں پڑھ پڑھ کر مر جاتا، لیکن پوزیشن ہمیشہ وہ لے جاتا تھا۔"

عبدالرحمٰن شاہ کی آنکھوں میں پرانی یادوں کے جگنو چمک اٹھے تھے۔ لیکن مراد شاہ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"کاش! وہ اتنا اچھا نہ ہوتا۔ کبھی کوئی پوزیشن نہ لیتا لیکن میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہمیشہ۔ میرے جنازے کو کندھا دینے والوں میں وہ بھی ہوتا۔" عبدالرحمٰن شاہ از حد نادم ہو گئے تھے۔

"سوری چچا جان! میں نے آپ کو سلجوق کا ذکر کر کے اداس کر دیا۔"

"اداس ہونے کے لیے سلجوق کا نام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عبدالرحمان! وہ تو کبھی ہمارے دلوں سے نہیں نکلا۔ کاش! میرا سلو ہوتا آج۔ اپنے بیٹے کی کامیابی پر کتنا خوش ہوتا۔"

عبدالرحمٰن شاہ، مراد شاہ کو تسلی دینے لگے تھے۔ لیکن ان کے پیچھے کھڑے فلک مراد شاہ کے لیے محفل کی ساری رونقیں ایک دم پھیکی پڑ گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے بابا کے ساتھ کتنا تھوڑا وقت گزارا تھا۔ ان کی یادوں میں اپنے بابا کے ساتھ گزارے صرف چند گنے چنے دن تھے۔ وہ بے طرح اداس ہو گئے تھے۔

عبدالرحمٰن شاہ کہتے تھے اس کے بابا ایک بہترین انسان تھے اور باقی سب بھی کتنی تعریفیں کرتے تھے ان کی، لیکن اس کی یادوں میں صرف بیمار اور کمزور بابا تھے۔

عمارہ نے انہیں لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو چونک گئی۔ ایک کونے میں کھڑے وہ بے حد اداس اور افسردہ لگ رہے تھے۔

"موی! کیا ہوا۔" عمارہ نے قریب آ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں... یوں ہی۔" وہ افسردگی سے مسکرا دیے اور عمارہ جانتی تھی کہ انہیں وقت اسے کون یاد آ رہا ہو گا۔

عمارہ ان کے پاس کھڑی ہو کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی اور اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئی تھی۔ فلک شاہ اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ اور یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ عمارہ ان کے قریب ہو اور وہ زیادہ دیر تک اداس رہ سکیں۔ اب ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ بہت دھیان سے عمارہ کو دیکھ رہے تھے۔ گلابی اور فیروزی رنگ کے امتزاج کے سوٹ میں وہ بے حد دلکش لگ رہی تھی اور دلکش تو وہ تھی ہی۔

"اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو!" عمارہ مسکرائی تھی۔

"قدرت کی صناعی۔"

عمارہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ وہ دونوں جو ایک دوسرے کے لیے اپنے دل میں محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی اس کا تجزیہ نہیں کیا تھا۔ فلک شاہ کے لیے احسان، عمارہ، زارا سب ایک جیسے تھے۔ عمارہ کے لیے شاید کہیں کوئی اور جذبہ بھی ہو، لیکن ابھی وہ ان پر واضح نہیں تھا۔

احسان نے پیچھے سے آ کر ان کے کندھے پر ہاتھ

رکھا۔

"موی! تم نے آج کی بیوٹی کوئن دیکھی ؟؟"

"میرے پاس ہی تو کھڑی ہے۔"

ان کی آنکھوں میں جگنو سے چمکے تھے اور نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے دبائے ان نے عمارہ کی طرف دیکھا تھا۔ جس کے رخسار لمحہ بھر کے لیے گلنار ہو گئے تھے۔

"ارے یار! یہ تو اپنی عمو ہے۔ میں بیوٹی کوئن کی بات کر رہا ہوں۔"

"کیا اس محفل میں کوئی اور بھی بیوٹی کوئن ہے۔ ورنہ اپنا تو یہ حال ہے۔"

وہ آئے بزم میں اتنا تو ہم نے دیکھا میر
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ان کا دل یکایک ہی شرارت پر آمادہ ہو گیا تھا اور ایک بار پھر عمارہ کے رخساروں پر جیسے لالے کے پھول کھل اٹھے تھے اور اسی وقت فلک مراد شاہ کا دل بڑی زور سے دھڑکا تھا۔

دھڑکن کا یہ انداز بالکل نیا اور انوکھا تھا۔ اب کے انہوں نے نظر بھر کر عمارہ کو دیکھا تھا۔

بلاشبہ وہ یہاں موجود سب لڑکیوں سے زیادہ دلکش تھی اور اپنے دل میں اٹھنے والے انوکھے احساسات سے گھبرا کر وہ احسان کی طرف مڑ گئے۔

"کیا کوئی اور بھی ہے جسے بیوٹی کوئن کا اعزاز دیا جا سکتا ہے؟؟"

احسان شاہ نے لاؤنج میں داخل ہوتی مائرہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

وہ جو کوئی بھی تھی، واقعی حسین تھی۔ عمارہ کے چہرے پر کم عمری کی معصومیت تھی، بھولپن تھا جبکہ وہ اپنے حسن سے آگاہ تھی۔ اس کی چال میں عجیب طرح کا بانکپن تھا اور اس کی گردن غرور سے تنی ہوئی تھی۔

"یہ بابا جان نے کن کن لوگوں کو بلا لیا ہے۔ حالانکہ وہ تو کہہ رہے تھے صرف فیملی کے لوگ ہوں گے۔" فلک مراد شاہ نے ایک نظر اس پر ڈال کر احسان شاہ سے پوچھا۔

"یہ مائرہ ہے۔ مروہ پھپھو کی بڑی نند کی بیٹی۔"

"خیریت ہے نا؟" وہ تھوڑا سا احسان شاہ کی طرف جھکے۔

"شاید نہیں۔" احسان شاہ نے شرارت سے کہا تھا اور فلک شاہ نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا اور پاس کھڑی عمارہ کی بالکل سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس بات پر ہنس رہے ہیں۔ مائرہ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد سیدھی ان کی طرف آئی تھی۔

"عمو! تم یہاں کھڑی ہو اور باہر زارا تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔ بلکہ رو رہی ہے اور آنٹی تمہیں بلا رہی تھیں۔"

"اچھا زارا کو کیا ہوا؟" عمارہ جانے کے لیے مڑی تھی اور پھر جیسے کچھ خیال آتے ہی ٹھہر گئی۔

"موی! یہ مائرہ ہے۔ مروہ پھپھو کی نند کی بیٹی اور یہ موی ہے۔ آج کی دعوت اسی کی کامیابی کی خوشی میں ہے۔"

مائرہ نے نخوت سے اسے دیکھا تھا۔ "مبارک ہو۔"

"تھینکس۔" فلک بھی مسکرایا تھا۔

"اور آپ کیا کرتی ہیں؟"

"گریجویشن کر رہی ہوں۔" پھر بابا جان نے انہیں بلا لیا تھا اور وہ مائرہ اور احسان کو وہیں چھوڑ کر بابا جان کی طرف چلے گئے تھے، پھر رات اپنے بیڈ پر لیٹتے ہوئے احسان شاہ نے شرارت سے کہا تھا۔

"یار! لگتا ہے میرا دل وہیں کہیں مائرہ حسین کے آنچل میں ہی اٹک کر رہ گیا ہے۔"

اور کون جانتا تھا کہ اٹھارہ سالہ احسان نے اس رات جو بات شرارت سے کہی تھی وہ ایک دن سچ ہو جائے گی اور احسان شاہ کا دل سچ مچ مائرہ حسین کے آنچل میں اٹک جائے گا۔ عمر میں اپنے سے ڈیڑھ، دو سال بڑی مائرہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بن جائے گی۔ فلک شاہ نے اسی رات دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وقت آنے پر وہ عمارہ عبدالرحمٰن کو اپنی زندگی میں شامل کریں گے۔ اور دادا جان نے جیسے ان

کے دل میں جھانک کر دیکھ لیا تھا کہ رات کو جب وہ سونے کے لیے جا رہے تھے تو انہوں نے عبدالرحمٰن سے کہا تھا۔

"عبدالرحمٰن! اپنی عمارہ کو میری بیٹی بنا دو۔ موی سچ مچ اپنا بیٹا بنا لو۔" اور عبدالرحمٰن نے کسی قدر حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

"چچا جان! ابھی تو وہ دونوں بہت چھوٹے ہیں۔"

"ہاں عبدالرحمٰن! ابھی دونوں بچے ہیں لیکن چھ سات سال بعد پتا نہیں میں ہوں گا یا نہیں۔ سوچتا ہوں اپنی زندگی میں ہی اسے......"

"چچا جان! اللہ آپ کو لمبی زندگی دے اور آپ موی کی خوشیوں کو دیکھیں۔ عمارہ آپ کی ہی بیٹی ہے۔ آج بھی اور کل بھی۔"

عبدالرحمٰن کو بھی اس وقت ایک بہت پرانی بات یاد آ گئی تھی۔ وہ اور سلجوق کبھی کبھی بہت دور تک سوچتے تھے۔

"سنو عبدالرحمٰن! جب ہمارے بچے بڑے ہو جائیں گے تو ہم اپنے بچوں کے رشتے ایک دوسرے سے کریں گے۔"

اور اگر دونوں کے صرف بیٹے یا صرف بیٹیاں ہوئیں تو......

"ایسا نہیں ہو گا۔" سلجوق کو یقین تھا۔

"وعدہ کرو۔"

"وعدہ۔" نہر کے کنارے چلتے چلتے عبدالرحمٰن نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔

اور یہ پرانی یاد کیا آئی، انہوں نے نہ مرتضیٰ، مصطفیٰ سے پوچھا۔ نہ ان کی ماں سے نہ عبداللہ اور مروہ سے ذکر کیا اور مراد شاہ کو زبان دے دی۔

"لیکن ابھی بچوں کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ خوامخواہ ڈسٹرب ہوں گے۔"

یہ عبدالرحمٰن کی خواہش تھی اور مراد شاہ جو دھوم دھام سے فلک کی منگنی کرنا چاہتے تھے، عبدالرحمٰن کی خواہش کے سامنے چپ کر گئے۔

وقت کچھ اور آگے سرکا تھا۔ احسان شاہ نے ٹاؤن پلاننگ اور انہوں نے سول انجینئرنگ میں ایڈمیشن لیا تھا۔ دادا جان کی خواہش تھی کہ وہ ہاسٹل میں رہیں۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ لاہور میں ہوں اور "الریان" میں نہ رہیں۔ عبدالرحمٰن تو بہت ناراض ہوئے تھے۔

"اپنے گھر کے ہوتے ہوئے آپ نے یہ کیسے سوچا کہ موی ہاسٹل میں رہے گا۔"

"یہ چند چھٹیاں گزارنے کی بات نہیں ہے، چار سال یہاں رہنا ہے اسے۔" عبدالرحمٰن نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

"چار سال رہے یا دس سال، موی "الریان" میں ہی رہے گا۔"

اور مراد شاہ ان کے اس خلوص و محبت کے سامنے مجبور ہو گئے تھے۔ وہ جب بھی چھٹیاں گزارنے آتے احسان کے کمرے میں ہی ٹھہرتے۔ اب بھی انہوں نے الگ کمرے کے بجائے احسان کے کمرے میں ہی ٹھہرنا پسند کیا تھا۔

لاہور آکر اس کی زندگی میں کئی تبدیلیاں آئی تھیں۔ یکایک ہی انہیں ادب اور سیاست سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اور وہ اکثر ایک سیاسی تنظیم کے طلبا کے ساتھ نظر آنے لگے۔ اب تک انہوں نے احسان کے علاوہ کسی کو دوست بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی لیکن اب تھرڈ ایر کا حق نواز اکثر ان کے ساتھ نظر آتا تھا۔ دونوں گھنٹوں اکٹھے رہتے تھے اور حق نواز ملک کی قسمت بدلنے کی باتیں کرتا۔

"ہمارا ملک چند ہاتھوں میں یرغمال بنا ہوا ہے موی! اور ہمیں ان ہاتھوں سے اسے چھڑانا ہے۔"

وہ بڑی جذباتی باتیں کرتا تھا اور فلک مراد شاہ بہت متاثر ہو کر اس کی باتیں سنتے۔

ایک بار احسان نے انہیں سمجھایا تھا۔

"موی! بابا جان نے کہا تھا کہ ہمیں کسی بھی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے اور تم آج کل حق نواز کے ساتھ بہت نظر آ رہے ہو۔ یہاں حق نواز کی مخالف تنظیم کافی زور آور ہے۔۔۔ تم بھی نظروں میں

آرہے ہو۔ اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دو۔"

"پتا نہیں کیا بات ہے شانی! میرا دل اچاٹ ہو گیا ہے پڑھائی سے۔ کتابوں میں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ شاید یہ میرا شعبہ نہیں ہے۔"

اور پھر انہوں نے یو ای ٹی کو دو سال بعد خیرباد کہہ دیا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے میں ایڈمیشن لیا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا بیٹا!"

عبدالرحمٰن صاحب کو بے حد رنج ہوا۔

"بابا جان! مجھے لگتا ہے کہ تعلیم میرے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ میں لٹریچر میں ماسٹرز کروں گا؟" عبدالرحمٰن کو سلجوق یاد آگیا تھا۔

"مجھے لگتا ہے جیسے یہ بھاری بھرکم کتابیں مجھے ڈس رہی ہیں۔ میرے اختیار میں ہو تو اردو ادب یا انگریزی ادب میں ماسٹرز کروں لیکن یہ بابا جان کی خواہش ہے کہ میں انجینئر یا ڈاکٹر بنوں حالانکہ۔۔۔"

وہ خاموش ہو گئے تھے۔ لیکن دل میں انہیں اس کے اس طرح یو ای ٹی چھوڑنے پر بڑا دکھ تھا اور انہوں نے اس کا اظہار مراد شاہ سے بھی کیا تھا۔

"چچا جان! مجھے موی کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ اپنا کیریر ختم کر دیا ہے اس نے انگلش لٹریچر پڑھ کر وہ کیا بن جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ لیکچرار، پروفیسر۔" تب بڑے رسان سے مراد شاہ نے کہا تھا۔

"اسے کچھ بننے کی کیا ضرورت ہے عبدالرحمٰن! یہ اتنی زمینیں' جائیدادیں اسی کی تو ہیں۔ زمینوں سے اتنا آتا ہے کہ وہ ایک شاندار زندگی گزار سکتا ہے۔ وہ اپنے باپ کی طرح انجینئر بننا چاہتا تھا۔ میں نے اسے منع نہیں کیا۔ حالانکہ اس کی دادی جان اسے لاہور بھیجنا نہیں چاہتی تھیں۔ اب وہ لٹریچر پڑھنا چاہتا ہے تو بھی میں اسے منع نہیں کر سکتا۔ میں اسے خفا اور ناراض نہیں کر سکتا۔"

"لیکن چچا جان! آپ اسے سمجھا تو سکتے تھے۔ وہ کون سا اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اپنے فیصلے خود کر رہا ہے۔ اللہ نے اسے اتنا اچھا ذہن دیا ہے۔ اپنی ذہانت ضائع کر دے گا۔"

"ذہانت کیسے ضائع ہو گی عبدالرحمٰن بچے! لٹریچر میں اور وہ بھی انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کرنا کوئی اتنا آسان بھی نہیں ہے۔"

عبدالرحمٰن شاہ نے پھر کچھ نہیں کہا تھا۔ شاید یہ مراد شاہ کا احترام تھا یا پھر موی کے مزاج سے تھوڑی بہت واقفیت انہیں بھی ہو گئی تھی کہ اس روز کے بعد انہوں نے اس موضوع پر کبھی کوئی بات نہیں کی لیکن ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ فلک شاہ نے یہ ایک غلط فیصلہ کیا ہے۔ بہت سارے دن انہوں نے فلک شاہ سے معمول کے مطابق بات چیت نہیں کی تھی۔ بس ڈنر پر یا صبح ناشتے پر رسمی سی بات ہوتی تھی۔

فلک شاہ ان دنوں اتنا مصروف رہنے لگے تھے کہ انہوں نے عبدالرحمٰن شاہ کی اس خفگی کو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ اگر وہ یہ خفگی محسوس کر لیتے تو شاید وہ اپنا فیصلہ بدل لیتے تھے شاید زندگی کا آج یہ رنگ نہ ہوتا پھر ہولے ہولے عبدالرحمٰن کے دل سے وہ ہلکی سی خفگی بھی ختم ہو گئی اور سب کچھ معمول کے مطابق چلنے لگا۔ وہ سلجوق کی نسبت سے انہیں پیارے تو تھے ہی لیکن اب عمو کے حوالے سے اور بھی عزیز ہو گئے تھے۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ حق نواز کے ساتھ ان کی دوستی بڑھتی جا رہی تھی اور حق نواز کے کہنے پر ہی انہوں نے اس کی سیاسی پارٹی جوائن کر لی تھی لیکن اس کا ذکر انہوں نے کسی سے بھی نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ احسان شاہ سے بھی نہیں جن سے وہ اپنی ہر بات کرتے تھے۔ پتا نہیں کیوں فلک شاہ کو لگا تھا کہ احسان شاہ کو ان کی یہ بات پسند نہیں آئے گی۔ بلکہ اسے تو حق نواز کے ساتھ بھی ان کا اتنا گہرا تعلق پسند نہیں آیا تھا۔ تب ہی تو اس رات جب وہ اپنے کمرے میں آئے تھے اور احسان نے اچانک پوچھا تھا۔ "آج تم کہاں گئے تھے۔" تو وہ سٹپٹا گئے تھے۔

"میں آج تمہارے کالج گیا تھا لیکن تم وہاں نہیں تھے۔ تمہارا وہ کلاس فیلو کیا نام ہے اس کا۔ منیب بتا رہا تھا کہ تم کالج آئے ہی نہیں ہو۔"

"اوہ ہاں! میں آج ذرا شاپنگ کے لیے چلا گیا تھا۔ کالج جانے کا موڈ نہیں تھا۔"
جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت تو نہ تھی لیکن محض اس کی خفگی کے خیال سے وہ نہیں بتا آج ان کی پارٹی کی میٹنگ تھی اور وہ حق نواز کے ساتھ پارٹی میٹنگ میں چلے گئے تھے۔
"اچھا۔ تمہیں شاپنگ کرنا تھی تو دونوں شام کو چلے جاتے۔ مجھے بھی کچھ چیزیں لینا تھیں۔" پھر یکایک اس نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا تھا۔
"کہیں تمہارا دل کالج سے بھی تو نہیں اچاٹ ہو گیا اور تم کہیں کسی اور سبجیکٹ میں ٹرائی کرنا چاہتے ہو۔"
"ارے نہیں۔" وہ بے اختیار ہنس دیے۔
"مجھے تو اب پتا چلا ہے کہ مجھے یہی پڑھنا ہے۔ خوامخواہ سائنس پڑھ کر دماغ تھکاتا رہا۔"
"خیر یہ تمہاری ذاتی رائے ہے ضروری نہیں کہ ہر شخص کو تم سے اتفاق ہو۔"
"چلو یار! تم میری رائے سے اتفاق نہ کرو۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم کالج کیوں گئے تھے۔ اب یہ نہ کہنا کہ تم مجھ سے ملنے گئے تھے کہ صبح شام تو تم میرا دیدار کر ہی لیتے ہو۔"
"پہلے تصحیح کر لو کہ صبح شام نہیں، صرف رات کو کیونکہ دن کے باقی حصے میں تو تم دستیاب ہی نہیں ہوتے ہو۔ پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں گورنمنٹ کالج کیوں گیا تھا۔" فلک شاہ دل ہی دل میں نادم ہوئے۔
"سوری یار! ان دنوں تھوڑا مصروف رہا۔"
"تھوڑا نہیں بلکہ تم بہت زیادہ مصروف ہو گئے ہو اور تمہارا زیادہ وقت حق نواز کے ساتھ گزرتا ہے۔ موی! تم جانتے ہو وہ پچھلے دو سال سے حکومت کی نظر میں ہے۔"
"لیکن شانی! حق نواز اچھا لڑکا ہے۔ محب وطن سچا اور کھرا بہت خوبصورت دل ہے اس کا۔"
"ٹھیک ہے حق نواز ایسا ہی ہو گا جیسا تم کہہ رہے ہو لیکن یار! احتیاط کیا کرو۔ کہیں تم بھی نظر میں نہ آجاؤ وہ تو ایک بار جیل کی ہوا بھی کھا چکا ہے لیکن تمہارے دادا جان تو۔۔۔"
"او کے یار!" فلک شاہ نے اس کی بات کاٹی تھی۔ "آئندہ احتیاط کروں گا۔ تم بتاؤ تم کیوں کالج گئے تھے۔"
احسان شاہ کی آنکھیں یکدم لو دینے لگی تھیں۔ "میں مائرہ سے ملنے گیا تھا۔"
"مائرہ سے؟" فلک نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"ہاں، تمہیں علم نہیں ہے وہ یہاں گورنمنٹ کالج سے ہی ماسٹرز کر رہی ہے سائیکالوجی ڈپارٹمنٹ میں ہے۔"
"اچھا میں نے کبھی اسے نہیں دیکھا۔"
لیکن اس نے تو تمہیں کئی بار دیکھا ہے۔ وہ فائنل ایئر میں ہے۔"
احسان نے کسی قدر جھجکتے ہوئے فلک شاہ کی طرف دیکھا تھا۔
"میرا دل سچ مچ باغی ہو گیا ہے یار! تمہیں یاد ہے تمہاری کامیابی کی خوشی میں دی جانے والی دعوت میں تم نے پوچھا تھا۔ خیریت ہے؟"
"اور تم نے کہا تھا خیریت نہیں ہے؟" فلک شاہ نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔
"ہاں! تب وہ صرف مذاق تھا موی! لیکن کل رات مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ دل تو بری طرح مائرہ حسین کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے اور میں صبح صبح اسے بتانے کے لیے بھاگا تھا کہ میں احسان شاہ۔۔۔ مائرہ حسین سے محبت کرنے لگا ہوں۔"
"تو پھر تم نے بتایا؟" فلک شاہ نے دلچسپی سے پوچھا۔
"نہیں یار! ہمت ہی نہیں ہوئی۔ لوگ پتا نہیں کیسے اتنے لمبے لمبے محبت کے ڈائیلاگ بول لیتے ہیں۔ میں تو ایک جملہ نہیں کہہ سکا۔"
"ایسا کرو دو چار زبردست رومانٹک قسم کی موویز دیکھ لو۔"
فلک شاہ نے بہت سنجیدگی سے اسے مشورہ دیا تھا

اور احسان نے ان کے بازو پر مکا مارتے ہوئے کہا تھا۔
"اللہ کرے تمہیں بھی کسی سے محبت ہو جائے۔"
"تمہیں کیا خبر احسان شاہ کہ یہ دل تو روز اول سے ہی کسی کا دیوانہ ہو چکا ہے اور ہر گزرتا دن اس محبت میں اضافہ کر رہا ہے۔"
انہوں نے سوچا تھا اور بڑے خلوص سے دعا کی تھی کہ احسان شاہ اپنی محبت کو پالے۔
یکدم ہی گیٹ کھلنے کی آواز آئی تھی اور رقیہ بی نے کچن سے باہر آتے ہوئے کہا۔
"وہ لوگ آگئے۔" فلک شاہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور پھر انجم عمارہ کو سہارا دیتے ہوئے ان کے بیڈ روم میں آئی۔ تین دن میں ہی کیسے نچڑ کر رہ گئیں۔ انہیں دیکھتے ہی ان کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔
"بابا! پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ماما اب بالکل ٹھیک ہیں۔"
انجم نے عمارہ کو بیڈ پر سہارا دے کر بٹھایا۔ وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئیں۔ وہ اپنی وہیل چیئر بیڈ کے قریب لے گئے تھے اور بے اختیار ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ "عمو!"
عمارہ مسکرائی تھیں۔ "آپ یوں ہی اتنے پریشان ہو رہے ہیں۔" تب ہی ایبک شاہ فون پر بات کرتا ہوا اندر آیا۔
"اوہ۔۔۔ ہاں ہومی کیسے ہو؟"
"پھپھو جان کیسی ہیں ایبک!" اس کے لہجے میں بے چینی تھی۔
"مجھے ابھی پتا چلا چند لمحے پہلے۔ میں تو ابھی آجاتا لیکن ادھر بابا جان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔" ہمدان مصطفیٰ بتا رہا تھا۔
"کیا۔۔۔" اس نے عمارہ کی طرف دیکھا اور بات کرتے کرتے باہر نکل گیا۔
"بابا جان مسلسل تین دن کی بے ہوشی کے بعد آج ہوش میں آئے ہیں لیکن ابھی بھی ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹرز بھی کچھ نہیں بتا رہے ہیں ایبک!" ہمدان کی آواز بھرا گئی تھی۔
"میں تو اس اچانک بے ہوشی کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ تمہارے جانے کے بعد عمر بابا جان کے کمرے میں گیا تھا تو۔۔۔ آج ہوش میں آتے ہی انہوں نے عمارہ پھپھو کا پوچھا ہے۔ وہ بہت بے چین ہیں ایبک! وہ کہہ رہے تھے پھپھو ہسپتال میں ہیں وہ۔۔۔"
"ماما اب گھر آگئی ہیں بہتر ہیں۔ بابا جان کیسے ہیں۔"
"بابا جان ٹھیک نہیں ہیں۔ وہ بالکل بھی ٹھیک نہیں ہیں ایبک!" وہ یکدم رو پڑا تھا۔
ایبک تم! پھپھو کو یہاں لے آؤ ہسپتال میں۔" فون بند کر کے ایبک نے پریشانی سے سوچا وہ کیسے، کس طرح ماما کو بابا جان کی بیماری کے متعلق بتائے ان کا کمزور دل کیسے برداشت کر پائے گا۔ وہ وہیں لاؤنج میں ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

"نو بج گئے ہیں اور احمد ابھی تک نہیں آیا۔" حسن رضا نے ٹی وی بند کرتے ہوئے زبیدہ بیگم کی طرف دیکھا۔
"کیا اس نے بتایا تھا کہ وہ دیر سے آئے گا۔"
زبیدہ بیگم نے اپنے دوپٹے پر کروشیے کی بیل بناتے ہوئے حسن رضا کو دیکھا۔ "مجھ سے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی اس نے۔ شاید سمیرا سے بات کی ہو۔"
"سمو۔" انہوں نے آواز دی تو سمیرا پلٹ آئی۔
"بیٹا! احمد کچھ بتا کر گیا تھا کہ کب آئے گا۔"
"نہیں ابو! لیکن وہ کئی دنوں سے لیٹ آرہا ہے۔ مجھے آپ سے بات کرنا تھی۔ کل بھی آپ کے سونے کے بعد وہ چلا گیا تھا اور کافی دیر سے واپس آیا۔" حسن رضا کی پیشانی پر لکیریں سی پڑ گئیں۔
"خیر تم کھانا لگاؤ اور جب وہ آئے تو اسے میرے پاس بھیجنا۔" سمیرا سر ہلا کر باہر چلی گئی۔
حسن رضا کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پچھلے کئی دنوں سے ان کا بلڈ پریشر ہائی تھا اور ڈاکٹر نے بلڈ

بریشر کی ٹیبلٹ کے ساتھ انہیں سکون کی گولی بھی دی تھی، جسے کھانے کے بعد انہیں نیند سی آجاتی تھی۔ عموماً"ان کے ہاں رات کا کھانا آٹھ بجے تک کھالیا جاتا تھا۔ کھانا کھاتے ہی وہ اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے۔ اس لیے انہیں پتا نہیں چل سکا تھا کہ احمد رضا دیر سے گھر آرہا ہے۔ ورنہ ان کی سخت تاکید تھی کہ مغرب کے بعد وہ گھر سے باہر نہ رہے۔ آج ان کی طبیعت کافی بہتر تھی اور ٹی وی پر خبریں سننے کے بعد انہیں احمد کا خیال آیا تھا کہ وہ ابھی تک گھر نہیں آیا۔

"جوان بچہ ہے' آرام سے بات کیجئے گا۔" زبیدہ بیگم نے دوپٹا لپیٹ کر شاپر میں رکھا۔

"عموماً" مائیں ہی بچوں کو بگاڑتی ہیں۔" حسن رضا بڑبڑائے۔

"یونیورسٹی میں پڑھتا ہے' دوست احباب ہیں' کہیں بیٹھ جاتا ہوگا۔"

"تو زبیدہ بیگم! یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ کہاں بیٹھتا ہے وہ۔ کیسی صحبت ہے۔"

زبیدہ بیگم نے اب کے کوئی جواب نہ دیا اور شاپر اٹھا کر ٹی وی کے پاس پڑی میز پر رکھا اور باہر نکل گئیں۔ سمیرا ٹیبل پر کھانا لگا رہی تھی۔

کھانا لگا کر اس نے آواز دی تو وہ باہر آکر بیٹھے ہی تھے کہ دروازے پر بیل ہوئی۔ سمیرا نے روٹیوں والا ہاٹ پاٹ ٹیبل پر رکھا اور جانے کے لیے مڑی۔

"ٹھہرو! میں دیکھتا ہوں۔" حسن رضا گیٹ کھول کر آگئے۔ احمد ہی تھا۔ بائیک صحن میں کھڑی کرکے وہ برآمدے میں آیا تو سمیرا نے آواز دی۔

"رضی! ہاتھ دھو کر جلدی سے آجاؤ۔ ابھی کھانا لگایا ہے۔" زبیدہ بیگم کو سلام کرکے رضی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا تھا۔

"تم آج کل بہت دیر سے آنے لگے ہو۔ کہاں جاتے ہو۔" خالی برتن کچن کی طرف لے جاتے ہوئے سمیرا نے سنا' حسن رضا پوچھ رہے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے احمد رضا سٹپٹایا۔

"وہ ابو میں ایک دوست کے پاس جاتا ہوں۔"

"کون دوست۔"

"وہ۔۔۔ وہ محسن ابو! وہاں اور دوست بھی ہوتے ہیں تو بس پھر گپ شپ میں وقت کا پتا نہیں چلتا۔"

انہوں نے ہنکارا بھرا تھا۔ "تم جانتے ہو تمہارے لیے یہ کتنا قیمتی وقت ہے۔ ابھی تمہارے گریجویشن میں ڈیڑھ سال ہے اور میں تمہیں ایم ایس سی کے لیے یو کے بھجوانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب تم شاندار کامیابی حاصل کرو اور تمہیں باہر کا اسکالرشپ مل جائے۔ آج کے اس مہنگائی کے دور میں میرے لیے تمہاری ہائر ایجوکیشن کے اخراجات برداشت کرنا ممکن نہیں ہے۔"

"جی ابو۔۔۔ میں پڑھائی کی طرف سے غافل تو نہیں ہوں۔"

"جانتا ہوں لیکن یہ وقت کا زیاں بھی صحیح نہیں ہے۔ اس طرح اگر تمہیں ان محفلوں میں وقت ضائع کرنے کا چسکا پڑ گیا نا تو تم ایک دن پڑھائی سے بھی غافل ہو جاؤ گے۔"

"سوری ابو! آئندہ جلدی آجایا کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ اٹھے اور اس کا کندھا تھپتھپا کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد اس نے سمیرا سے چائے کی فرمائش کر دی۔

"اچھا۔" سمیرا نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

سمیرا کام سے فارغ ہو کر چائے لے کر آئی تو وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ دروازہ کھلا تھا۔ سمیرا نے چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا تو وہ آنکھیں کھول کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"سمو کی بچی! تو نے شکایت کی ابو سے میری۔"

"کیوں کیا انہیں نظر نہیں آتا۔ وہ کب سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔"

"آج انتظار کر رہے تھے۔ پہلے تو ان کے سونے کے بعد ہی جا تا رہا ہوں۔"

"ہاں تو تم کہاں جاتے ہو۔ جھوٹ بول رہے تھے نا ابو سے۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔"

"یہ تو تمہیں پتا ہوگا رضی! لیکن کل تمہارے جانے کے بعد محسن کا فون آیا تھا۔ ان کے چچا کی ڈیتھ ہو گئی ہے اور انہوں نے بتایا تھا کہ وہ گاؤں جا رہے ہیں اور میں تمہیں بتا دوں۔" وہ سنجیدگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم نے فون ریسیو کیا تھا؟"

"ہاں!"

"تھینک گاڈ!"

اس نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔ سمیرا مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"او ڈیئر سسٹر! اس طرح مشکوک نظروں سے مت دیکھو۔ میں کہیں ڈاکے مارنے نہیں جاتا۔"

"پھر کہاں جاتے ہو رضی! ابو نے تم سے بہت امیدیں وابستہ کی ہوئی ہیں۔" سمیرا نے پوچھا۔

یکدم اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکے تھے اور وہ آلتی پالتی مار کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"پتا ہے۔ ایک شخص ہے۔ اسماعیل نام ہے اس کا۔ وہ اللہ کا بہت برگزیدہ بندہ ہے۔ مجھے ایک یونیورسٹی فیلو اس کی محفل میں لے کر گیا تھا۔ کیا مسحور کن گفتگو کرتا ہے وہ۔ جی چاہتا ہے بس سنتے رہو۔ اتنے سارے لوگ ہوتے ہیں وہاں' لیکن اس کی نظریں صرف مجھ پر ہوتی ہیں۔ پتا ہے سمو! اس نے مجھ سے کہا کہ ایک روز میرا نام تمام دنیا میں پھیلے گا۔ وہ وقت جلد آنے والا ہے' جب میں تمام دنیا میں پہچانا جاؤں گا اور میرے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگے ہوں گے۔"

"اس نے یہ نہیں بتایا کہ یہ شہرت تمہیں کس شعبے میں ملے گی۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"دنیا میں تو ہٹلر اور چنگیز خان بھی مشہور ہوئے ہیں۔"

"سو واٹ!" اس نے ناک چڑھاتے ہوئے چائے کا مگ اٹھا لیا۔ "شہرت تو شہرت ہوتی ہے اور ہٹلر بھی

محب وطن تھا جبکہ چنگیز خان اور ہلاکو بہادر تھے۔ اگر ایسی شہرت بھی تو مل جائے تو کیا کہنے۔"

"رضی!" سمیرا نے آنکھیں پھیلائیں۔

"تم ظالموں کو بہادر کہہ رہے ہو اور تمہارا مطلب یہ ہے کہ تم شہرت حاصل کرنے کے لیے ہٹلر یا چنگیز خان بھی بن سکتے ہو؟"

"کہہ سکتی ہو؟" اس نے کندھے اچکائے اور چائے پینے لگا۔

"رضی!" سمیرا ایکدم پریشان سی نظر آنے لگی۔ "تم یہ کس طرح سوچنے لگے ہو۔ ایسے اندھے خواب تو آدمی کو دلدل میں لے جاتے ہیں۔ تم بھی کہیں کسی دلدل میں نہ گر جاؤ۔ پتا نہیں یہ شخص کون ہے اور۔۔۔"

"اوہ مائی گاڈ!" احمد رضا نے اس کی بات کاٹی۔ "میری دادی اماں بننے کی کوشش مت کرو۔ مجھ سے بہت چھوٹی ہو۔"

"عمر میں چھوٹی ہوں، عقل میں نہیں۔"

"ایک تو بندہ یہاں کسی سے اپنے خواب بھی شیئر نہیں کر سکتا۔" اس نے کپ زور سے سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ سمیرا نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔

"بہر حال جو بھی کرنا رضی! سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا' پتا نہیں کیوں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ایک تو تم لڑکیاں بھی ناخواہ مخواہ کے ڈر پالے رکھتی ہو۔ ابو کا ڈر نہ ہوتا تو میں تمہیں ملواتا کسی روز اسماعیل صاحب سے۔"

"مجھے نہیں ملنا کسی اسماعیل صاحب سے اور تم بھی کم ہی ملا کرو۔ اپنی تعلیم پر توجہ دو۔"

سمیرا کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی اور احمد رضا نے ایک بار پھر آنکھیں موند کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی۔

پہلی بار وہ ابراہیم کے ساتھ اسماعیل صاحب کے گھر گیا تھا۔ اس روز وہ یونیورسٹی سے نکلا تھا تو اسے ابراہیم مل گیا۔

"یار آج اسٹرائیک ہے' تم مجھے اپنی بائیک پر ڈیفنس لے چلوگے؟"

"ہاں لیکن ڈیفنس میں کیا کام ہے تمہارا۔ تم تو گلبرگ میں رہتے ہو۔"

"ہاں مجھے اسماعیل صاحب کے گھر جانا ہے۔ ایسا کرو تم بھی چلو۔ چند روز قبل ہی میری ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ لیکن بہت متاثر کیا ہے انہوں نے مجھے۔ بہت نالج ہے ان کے پاس۔ اسلام' قرآن ہر چیز پر دسترس ہے انہیں۔"

اسے مضطرب دیکھ کر ابراہیم نے کہا۔

"یار! ایک بار مل کر تو دیکھو ان سے۔ اور کچھ نہیں تو مستقبل کا حال ہی پوچھ لینا۔"

"کیا نجومی بھی ہیں؟" رضی کو یکایک دلچسپی سی محسوس ہونے لگی تھی۔

"نہیں نجومی نہیں لیکن اللہ کے جو ولی ہوتے ہیں وہ بعض اوقات مستقبل میں بھی جھانک سکتے ہیں۔" ابراہیم نے بتایا۔

"لیکن یار! مجھے ان ولیوں' بزرگوں' بابوں سے ڈر لگتا ہے۔" وہ کچھ متذبذب سا تھا۔

"لیکن اسماعیل صاحب اس طرح کے بزرگ نہیں ہیں۔ وہ تو بڑے فرینڈلی ہیں۔"

وہ ابراہیم کے ساتھ یوں ہی بغیر کسی ارادے کے کوٹھی کے اندر چلا گیا تھا۔ کوٹھی کے پورچ میں چھ سات کاریں کھڑی تھیں۔

وہ پورچ کی سیڑھیاں چڑھ کر جوں ہی اندرونی گیٹ کے سامنے پہنچے' دروازہ خود بخود کھل گیا۔ دروازے کے پٹ پر ہاتھ رکھے جس لڑکی نے انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا تھا۔ اس پر ایک لمحے کو تو احمد رضا کو کسی حور کا گمان ہوا تھا۔ آسمانی رنگ کی میکسی کسی بہت اعلا ریشم سے بنی ہوئی تھی جس پر کہیں کہیں شفقیں دمک رہی تھی۔ اگر ابراہیم اسے ٹھوکا نہ دیتا تو وہ وہیں مبہوت کھڑا رہتا۔

"آیئے۔" لڑکی نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور مڑی سنہری بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ابراہیم کے ساتھ ہولے ہولے چلتا ہوا ایک بڑے ہال میں پہنچا تھا۔ ہال میں تین اطراف پر کرسیاں لگی تھیں۔ چھ سات کرسیوں پر کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ وہ سب تقریباً جوان تھے۔ سامنے ایک بڑی شاندار کرسی تھی۔ ہال کی چھت پر بڑے بڑے فانوس روشن تھے۔ بڑی کرسی کے پیچھے ایک پردہ تھا۔ پردے کے پیچھے شاید کوئی دروازہ تھا۔ ورنہ وہاں پردے کی موجودگی کچھ عجیب لگ رہی تھی۔ وہ حیران حیران سا ابراہیم کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر پردہ ہٹا۔ دو تین لڑکیاں پردے کے پیچھے سے نکلیں۔ ان کے ہاتھوں میں ٹرے تھیں اور وہ سب ویسی ہی آسمانی میکسیاں زیب تن کیے ہوئے تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین کہ نگاہ کسی پر ٹھہرتی ہی نہ تھی۔

"حضرت صاحب! ابھی تشریف لاتے ہیں۔ آپ لوگ مشروب سے لطف اٹھائیں۔"

ایک لڑکی نے ہال کے وسط میں آکر کہا مگر وہ تو اس کی آواز کی نغمگی میں کھو سا گیا۔ دوسری دونوں لڑکیاں ٹرے اٹھائے باری باری سب کے سامنے رکتیں۔ ذرا سا سر خم کر کے کہتیں۔ "پلیز!" اور آگے بڑھ جاتیں۔ ابراہیم اور احمد رضا نے بھی مشروب کا گلاس اٹھا لیا تھا۔ وہ لڑکیاں پھر پردے کے پیچھے غائب ہو گئیں۔

اس نے شربت پی کر خالی گلاس ٹیبل پر رکھا ہی تھا کہ پردہ پھر ہٹا اور پردے کے پیچھے سے وہی لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ اب ان کی تعداد چھ تھی' تین تین لڑکیاں کرسی کے دائیں بائیں کھڑی ہو گئیں۔ وہ آنکھیں پھاڑے ایک جیسی قامت اور ایک ہی جیسے لباس والی ان لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا کہ پردے کے پیچھے سے ایک شخص نمودار ہوا۔

شلوار قمیص کے اوپر اس نے سنہری کناروں والا کالا جبہ پہنا ہوا تھا۔ چھوٹی سی سیاہ داڑھی' چھوٹی چھوٹی آنکھیں' ہلکا سانولا رنگ۔ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو متوجہ کرتی۔

"یہ ہی حضرت صاحب اسماعیل خان ہیں۔" ابراہیم نے کھڑے ہوتے ہوئے سرگوشی کی تو وہ بھی سب کے ساتھ احتراماً کھڑا ہو گیا تھا۔ ان کے بیٹھنے کے بعد سب لوگ بھی بیٹھ گئے تھے اور بیٹھنے کے بعد جب احمد رضا نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ اس شخص کی کرسی کے پیچھے تین لڑکیاں کھڑی تھیں۔ سفید ریشم کی میکسیوں میں ملبوس جن پر سلور رنگ کے ستارے جھلملا رہے تھے۔ ان کے لمبے بال ان کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

"کیا یہ کوئی خواب ہے۔" اس نے اپنے بازو پر چٹکی لی تھی اور پھر ابراہیم کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا ہم ماضی کے کسی لمحے میں ہیں اور یہ حسن بن صباح کی جنت اور اس کی پریاں ہیں؟"

"خاموش!" ابراہیم نے آہستگی سے کہا تھا۔ حضرت صاحب ان ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اسے اپنی طرف دیکھتے پاکر ان کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی اور وہ ابراہیم سے مخاطب ہوئے۔

"یہ تمہارا مہمان ہے؟"

"جی۔۔۔ جی حضرت صاحب!" ابراہیم نے جواب دیا۔

"فارنر ہے' غیر مسلم؟"

"نو۔ نو میں پاکستانی ہوں۔ مسلم ہوں۔" اس نے جواب دیا تھا۔

"تمہاری پیشانی پر تمہارے عروج کی داستان لکھی ہے جوان! بہت عروج ملے گا تمہیں۔ بہت نام کماؤ گے۔"

اور احمد رضا کا دل اتنی تیزی سے دھڑکا تھا کہ اس کی دھڑکن کی آواز وہ خود سن رہا تھا۔

یہ اسماعیل خان سے اس کی پہلی ملاقات تھی۔

کیسا سحر طاری کر دینے والا ماحول تھا۔ اسماعیل خان نے لیکچر دیا تھا کوئی۔ اس نے دھیان سے نہیں سنا کہ کیا کہا تھا انہوں نے۔ وہ تو سحر زدہ سا بیٹھا تھا اور اس کی نظریں بار بار ان لڑکیوں کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اتنا حسن۔

"یہ لڑکیاں کون تھیں ابراہیم!" واپس آتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔
"یہ حضرت صاحب کی مرید ہیں شاید۔" ابراہیم کے پاس خود بھی زیادہ معلومات نہیں تھیں۔
"اور تم۔۔۔ کیا تم بھی ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو چکے ہو۔"
"نہیں۔۔۔ لیکن سوچ رہا ہوں۔ ابھی میں ٹھیک طرح سے ان کے عقائد و نظریات سمجھ نہیں پا رہا۔"
"کہیں یہ شخص آج کی یعنی ہماری تاریخ کا حسن بن صباح تو نہیں ہے؟" بے اختیار ہی احمد رضا کے لبوں سے نکلا۔
"معلوم نہیں۔" ابراہیم نے کندھے اچکائے۔
"یہ جو کوئی بھی ہے۔ لوگ بڑی تیزی کے ساتھ اس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو رہے ہیں۔ خاص طور پر میری تمہاری عمر کے لوگ۔"
"ہوں۔۔۔ لیکن مجھے کوئی چیز کھٹک رہی ہے۔"
احمد رضا نے اس وقت ابراہیم سے کہا تھا لیکن بعد کے دنوں میں وہ خود باقاعدہ طور پر اس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گیا تھا۔ بلکہ چند ہی دنوں میں اسماعیل خان کے بہت قریب ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی کے بعد سیدھا اس کی طرف چلا جاتا تھا۔ ابراہیم نے یکدم جانا چھوڑ دیا تھا اور اس کے استفسار پر اس نے جواب دیا تھا کہ مجھے یہ شخص فراڈ لگتا ہے۔ بہروپیا ہے۔ اللہ جانے اس کا مقصد کیا ہے لیکن جب میں نے اس کے لیکچر کی سی ڈی دیکھی اور اس کے لیکچر پر غور کیا تو مجھے لگا ہے کہ در پردہ یہ شخص نعوذباللہ خدائی کا یا نبوت کا دعوا کر رہا ہے اور بہت ممکن ہے کہ عنقریب یہ صاف لفظوں میں ایسا ہی کوئی دعوا کر دے۔"
"نعوذباللہ۔"
بے اختیار احمد رضا کے لبوں سے نکلا تھا اور پھر اس نے مسکراتے ہوئے ابراہیم کو دیکھا تھا۔
"میرا اتفاقاً" وہاں جانا شاید اس لیے ہو کہ اس مسلمہ کذاب نے میرے ہی ہاتھوں قتل ہونا ہو اور مجھے شہادت کا مرتبہ نصیب ہونا ہو۔"
لیکن اس وقت احمد رضا نہیں جانتا تھا کہ آنے والے دنوں میں کیا ہونے والا تھا۔ اسے شہادت نصیب ہونی تھی یا دنیا بھر کی ملامت اس کی جھولی میں پڑنے والی تھی۔
یکدم ہی دروازے پر بیل ہوئی تھی اور پھر شاید کوئی بیل پر سے انگلی اٹھانا ہی بھول گیا تھا۔ وہ چونک کر سیدھا ہوا۔
بے اختیار سامنے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر پڑی۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ گو لاہور کے حساب سے بہت زیادہ دیر تو نہیں ہوئی تھی لیکن ان کے ہاں تو نو بجے تک سب سو جاتے تھے۔ برسوں سے یہی اصول چلا آ رہا تھا۔
"اس وقت کون ہو سکتا ہے؟"
بیڈ سے اتر کر چپل پہنتا ہوا وہ دروازہ کھول کر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے دیکھا۔ حسن رضا بھی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے تھے اور اب صحن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دونوں آگے پیچھے ہی گیٹ تک پہنچے تھے۔
"کون ہے؟" حسن رضا نے بلند آواز میں پوچھا۔
"پولیس۔" باہر سے آواز آئی۔
"پولیس؟" حسن رضا نے دہرایا اور مڑ کر احمد رضا کی طرف دیکھا' پھر گیٹ کھولنے لگے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نگہت عبداللہ

توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا حماد اور دو بیٹیاں، سارہ اور اریبہ ہیں۔ یاسمین کی مستقبل بدمزاجی اور بدزبانی سے تنگ آکر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی خالدہ سے دوسری شادی کرلی۔ اس بات پر یاسمین اپنے جیٹھ، جٹھانی سے بھی شاکی ہے۔ اریبہ ماں سے قریب ہے، جب کہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اریبہ کی منگنی اس کے تایا زاد اجلال رازی سے ہو چکی ہے جو اعلا تعلیم کے لیے امریکا گیا ہوا ہے۔ یاسمین، اریبہ کو باپ اور ددھیالی رشتے داروں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ اریبہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتا چلتا ہے تو وہ اپنے تایا اور تائی سے بھی بدظن ہو جاتی ہے اور اجلال سے منگنی بھی توڑ دیتی ہے۔ اجلال تعلیم مکمل کرکے واپس آتا ہے تو اسے منگنی ٹوٹنے کا پتا چلتا ہے۔ وہ اریبہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔

اجلال رازی اس بارے میں اریبہ سے بات کرتا ہے، مگر وہ خاصی روکھائی سے پیش آتی ہے، تاہم وہ تحمل سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مسئلہ بردباری کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے۔ اریبہ بے حد خودسر ہوتی جارہی ہے۔ وہ ماں کی شہ پر سب کی مرضی کے خلاف موٹر سائیکل لے لیتی ہے۔ سارہ کا کزن سمیر اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔ مگر سارہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتی۔

شمشیر علی شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ اسے گاؤں میں مقیم اپنی بہن تاجور کی فکر رہتی ہے کیونکہ وہ وہاں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم اور باپ کی عدم توجہ کا شکار ہے۔ وہ تاباں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو فون کرتا ہے کہ تاباں کے باپ سے

رشتے کی بات کرنے تاکہ وہ شادی کے بعد تاجور کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔
تاباں کا باپ بدلے میں اپنے لیے تاجور کا رشتہ مانگ لیتا ہے۔ شمشیر غصہ میں تاباں سے اپنا راستہ الگ کرلیتا ہے۔ شمشیر تاجور کو اپنے ساتھ شہر لے آتا ہے۔ تاجور کو ٹی بی ہوتی ہے۔ وہ اسے ہسپتال داخل کروا دیتا ہے۔
اریبہ' یاسمین کو شہباز درانی کے ساتھ گاڑی میں دیکھ لیتی ہے۔ اسے ناگوار لگتا ہے مگر یاسمین جھوٹی کہانی سنا کر اسے مطمئن کردیتی ہے۔ ٹی بی کے مریض کی کیس ہسٹری تیار کرنے کے سلسلے میں اریبہ کی ملاقات تاجور سے ہوتی ہے۔
اجلال رازی اریبہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں مگن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرا دیتا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔
یاسمین اور شہباز درانی کی نازیبا گفتگو سن کر اریبہ غصے میں بائیک لے کر نکل جاتی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔ شمشیر علی بروقت اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچالیتا ہے۔ اسی اسپتال میں تاجور بھی داخل ہے۔ اریبہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے رویے اور سوچ پر نادم ہوتی ہے۔ شمشیر علی' توصیف احمد کے آفس میں کام کرتا ہے۔ توصیف احمد اسے سیف سے ایک ضروری فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دینے کے لیے کہتے ہیں۔ بعد میں انہیں پتا چلتا ہے کہ سیف میں سے فائل کے ساتھ ستر لاکھ روپے بھی غائب ہیں۔
وہ شمشیر پر رقم چوری کا الزام لگاتے ہیں تو وہ پریشان ہوجاتا ہے۔ اریبہ ماں کی اصلیت جان کر بالکل بدل جاتی ہے۔ اور مضطرب رہنے لگتی ہے۔
رازی' اریبہ سے ملنے جاتا ہے تو اریبہ اس کی باتیں سن کر کچھ الجھ سی جاتی ہے۔
تاجور کو اسپتال سے باہر روتے دیکھ کر اریبہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتی ہے۔
توصیف احمد کے سابقہ چوکیدار الیاس کی نشاندہی پر شمشیر کی بے گناہی ثابت ہوجاتی ہے۔ وہ رہا ہو کر دل گرفتہ سا اسپتال جا کر تاجور کا معلوم کرتا ہے مگر اسے صحیح معلومات نہیں مل پاتیں۔ اسپتال کا چوکیدار فضل کریم اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ وہاں سے شمشیر اپنے گاؤں جاتا ہے مگر ابا کو تاجور کی گمشدگی کے بارے میں نہیں بتاتا۔ تاباں کی شادی ہو جاتی ہے۔ تاباں کو دیکھ کر شمشیر پچھتاتا ہے اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے اپنے ساتھ چلنے کا کہتا ہے مگر تاباں منع کردیتی ہے۔
یاسمین' اریبہ کی جلد از جلد شادی کرنے کی فکر میں پڑجاتی ہے مگر اریبہ دوٹوک انداز میں منع کردیتی ہے۔ یاسمین چالاکی سے اپنے گھر تمام رشتے داروں کو دعوت پر مدعو کرتی ہے۔ اجلال مضطرب سا دعوت میں شریک ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر اریبہ مزید الجھن کا شکار ہوتی ہے۔
بلال اسٹڈی کے لیے امریکہ چلا جاتا ہے۔ اجلال' اریبہ سے محبت کا اظہار کرتے کرتے اچانک گریزاں ہوجاتا ہے۔
اجلال بے حد نادم ہوتا ہے۔ سارہ اسے سب کچھ بھولنے کا کہتی ہے۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں سمیر سے بات کرتی ہے مگر اس کی طرف سے سخت جواب ملتا ہے۔ شمشیر کو اسپتال میں اریبہ نظر آجاتی ہے وہ اس سے شدید نفرت محسوس کرتا ہے اور کالج سے واپسی پر اسے اغوا کرلیتا ہے۔
اریبہ کے اغوا ہوجانے پر سب پریشان ہوجاتے ہیں۔ اجلال ساجدہ بیگم سے کہہ دیتا ہے کہ اب وہ اریبہ سے شادی نہیں کرے گا۔ شمشیر' اریبہ سے تمیز سے پیش آتا ہے۔ کچھ دن بعد اریبہ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے شمشیر کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

قسط نمبر ۱۳

"ہاں' کہاں دیکھا ہے۔" اریبہ ذہن پر زور ڈالنے لگی تھی۔
شمشیر علی نے اٹھتے ہوئے جان بوجھ کر چائے کا مگ ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ اس کا مقصد اریبہ کا دھیان بٹانا تھا اور واقعی مگ ٹوٹنے کی آواز سے وہ جھنجلا گئی تھی۔ بولی تو کچھ نہیں مگر ناگواری سے اسے دیکھنے لگی تھی۔
"بندہ تمہاری موجودگی میں کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ آئندہ میں کوئی کام کر رہا ہوں تو تم یہاں مت بیٹھنا۔" شمشیر علی الٹا اسے الزام دے کر بولا تو وہ چڑ گئی۔
"یوں کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں کچھ کرنا آتا ہی نہیں۔"
"یہ تو تمہیں وقت بتائے گا کہ مجھے کیا آتا ہے کیا نہیں۔" وہ کہتے ہوئے جھک کر ٹوٹے مگ کے ٹکڑے اٹھانے لگا۔
"معاف کرنا' مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تمہیں کیا آتا ہے۔ تم ماؤنٹ ایورسٹ سر کرلو تب بھی میں تمہیں نہیں سراہوں گی کیونکہ میری نظر میں تم راہزن ہو' راہزن رہو گے۔"
وہ سلگتے لہجے میں کہہ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ گوکہ اب وہ وہاں بیٹھنا نہیں چاہتی تھی لیکن محض اس پر یہ جتانے کی غرض سے کہ وہ اس سے دبنے والی نہیں ہے' بیٹھی رہی۔
"اچھی بات ہے۔ اب اپنے راہزن کو کھانا ہی کھلا دو۔" شمشیر علی نے برا مانے بغیر کہا تو وہ اس کی ڈھٹائی پر تلملا کر رہ گئی' بولی اب بھی کچھ نہیں۔
"کچھ ہے یا لانا پڑے گا؟" شمشیر علی نے پوچھا ضرور لیکن اس کا جواب سننے کے لیے رکا نہیں' سیدھا کچن میں چلا گیا تب وہ اٹھ کر کمرے میں آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ساجدہ بیگم کو جو عزت اور مقام خاندان بھر میں حاصل تھا۔ اسے وہ کھونا نہیں چاہتی تھیں کیونکہ انہیں یہ عزت اور مقام یونہی نہیں حاصل ہوگیا تھا۔ اپنی بردباری قائم رکھنے کے لیے بارہا انہیں پل صراط سے گزرنا پڑا تھا۔ انصاف پسندی ان کی فطرت میں شامل تھی۔ معاملہ غیر کا ہو یا اپنے گھر کا' انہوں نے ہمیشہ غیر جانبداری سے سوچا تھا اور اب جوان کے اپنے بیٹے اجلال رازی نے اریبہ سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ سنایا تھا تو اسے بھی وہ غیر جانبداری سے ہی سوچ رہی تھیں لیکن اس کے ساتھ وہ پریشان بھی تھیں کیونکہ اجلال اپنے فیصلے میں حق بجانب تھا۔
کوئی بھی مرد ایسی لڑکی کو قبول نہیں کرتا جو اغوا ہوئی ہو یا اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہو۔ بہرحال اجلال کو حق بجانب سمجھنے کے باوجود وہ اس سلسلے میں کوئی فوری اقدام نہیں کرنا چاہتی تھیں کیونکہ خاندان کا معاملہ تھا اور گوکہ انہیں اجلال سے بھی کسی جذباتی پن کی توقع نہیں تھی' پھر بھی وہ اسے سمجھانا چاہتی تھیں لیکن اس روز کے بعد سے اجلال انہیں فرصت سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا جس سے وہ اپنے آپ جانے کیا کیا قیاس کرکے اندیشوں میں گھرنے لگی تھیں۔ اس وقت بھی وہ اسی سلسلے میں پریشان بیٹھی تھیں کہ سمیر کے ساتھ امینہ کی آمد پر کچھ ٹھٹکیں لیکن بظاہر خوشی کا اظہار کیا۔
"ارے امینہ! آج تم کیسے راستہ بھول پڑیں؟"
"میں تو کب سے آنا چاہ رہی تھی بھابھی! بس یہ سمیر ہی فارغ نہیں ہوتا۔ روز کل پر ٹالتا رہتا ہے۔ آپ بھی تو نہیں آئیں۔" امینہ نے جواب کے ساتھ شکوہ کر ڈالا۔
"بس میرے ساتھ بھی یہی جانے آنے کا مسئلہ ہے۔ جب سے بلال باہر گیا ہے' تب سے تو بالکل گھر کی ہی ہو کر

رہ گئی ہوں۔ خیر! تم سناؤ ٹھیک تو ہو اور ہاں طیبہ کو کیوں نہیں لائیں۔ کس کے پاس چھوڑ آئی ہو؟" ساجدہ بیگم نے امینہ کے پاس بیٹھتے ہوئے اچانک طیبہ کی کمی محسوس کر کے پوچھا۔

"کسی کے پاس نہیں بھابھی! طیبہ کے بابا آگئے تھے بس اسی لیے وہ رک گئی ورنہ آرہی تھی۔" امینہ بتا کر سمیر کو دیکھنے لگیں جو کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔

"اچھا امی! میں پھر آپ کو لینے آجاؤں گا۔" سمیر نے امینہ کے دیکھتے ہی کہا تو ساجدہ بیگم اس سے پوچھنے لگیں۔

"کیوں تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں ابا کے ایک کام سے جا رہا ہوں ممانی جان! آپ کو کوئی کام ہو تو بتائیے۔"

"ارے نہیں بیٹا! مجھے کیا کام ہوگا۔"

"اچھا امی......!" سمیر کھڑے کھڑے ہی چلا گیا تو امینہ ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

"ثنا نظر نہیں آرہی کہاں ہے؟"

"کچن میں ہوگی!" ساجدہ بیگم بتانے کے ساتھ ثنا کو پکار کر بولیں۔

"ثنا! یہاں آؤ تمہاری پھپھو آئی ہیں۔"

ثنا بھاگی آئی تھی۔ سلام کرتے ہوئے امینہ سے لپٹ گئی۔ یہ امینہ کی محبت تھی، پھر اکلوتی پھپھو بھی تھیں، اس لیے ساجدہ بیگم اور توصیف احمد کی اولادیں بھی ان کی طرف کھنچتی تھیں۔

"آپ تو واقعی عید کا چاند ہو گئی ہیں پھپھو! سچ بتائیں۔ آخری بار آپ کب آئی تھیں ہمارے گھر۔" ثنا لاڈ سے بول رہی تھی۔ امینہ ہنسنے لگیں۔

"دیکھا! آپ کو یاد بھی نہیں ہے مگر مجھے یاد ہے، جب رازی بھائی باہر سے آئے تھے تب آپ آئی تھیں اور رازی بھائی کو آئے ہوئے ایک سال ہو گیا ہے۔ کیوں امی؟" ثنا نے آخر میں تصدیق کے لیے ساجدہ بیگم کو مخاطب کیا تو وہ کہنے لگیں۔

"اچھا یہ حساب کتاب بعد میں کرنا پہلے اپنی پھپھو سے چائے پانی پوچھو۔"

"پوچھوں کیوں؟ لے کر آتی ہوں۔" ثنا فوراً اٹھ گئی، پھر جاتے جاتے بولی۔ "پھپھو! جلدی جانے کا تو سوچیے گا بھی نہیں، میں آپ کے لیے اسپیشل کھانا بناؤں گی۔"

"ارے نہیں بیٹا!" امینہ منع کرنا چاہتی تھیں لیکن ثنا جا چکی تھی۔

"نہیں سنے گی وہ، آرام سے بیٹھو تم اپنا ہی گھر ہے۔" ساجدہ بیگم نے امینہ کا ہاتھ دبا کر کہا تو وہ خاموش ہو گئیں۔

پھر کتنے لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ دونوں کے ذہن ایک ہی بات سوچ رہے تھے اور دونوں اس انتظار میں تھیں کہ پہل دوسری طرف سے ہو۔ آخر امینہ کو کہنا پڑا۔

"بھابھی! اریبہ کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ بے چارے توصیف بھائی تو ٹوٹ کر رہ گئے ہیں۔"

"ہاں امینہ! میں خود بہت پریشان ہوں۔ اس لڑکی نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔" ساجدہ بیگم آہ بھر کر افسوس سے کہنے لگیں۔ "بات صرف توصیف کی نہیں پورے خاندان کی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابھی! خاندان کی ناک کٹوا دی اس نے اور مجھے یقین ہے اس میں یاسمین کا ہاتھ ہے۔ خدا جانے، ہمارے خاندان سے کیا بیر ہے اسے، شروع دن سے جو رسوا کرنے پر تلی ہے تو اب تک صرف برائی ہی سوچتی ہے۔" امینہ نے آج پہلی بار یاسمین کے خلاف زبان کھولی تھی ورنہ اب تک خاموش تماشائی تھیں۔

"ہاں لیکن یاسمین اپنی بیٹی کو۔۔۔" ساجدہ بیگم سوچنے والے انداز میں اسی قدر کہہ سکیں۔

"ارے بھابھی! اس نے اولاد کو اولاد سمجھا ہی کب۔ وہ خاص طور سے توصیف بھائی کو اذیت دینے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ خود تو ان کے سامنے کھڑی نہیں ہو سکتی، اولاد ہی کو استعمال کرتی ہے ناں۔"

"ہوں۔" ساجدہ بیگم گہری سوچ میں تھیں۔

"آپ مانیں یا نہ مانیں، اریبہ کو یاسمین نے ہی غلط راستے پر ڈالا ہے۔ پہلے بھی وہ اس کی شہ پر کیسی کیسی حرکتیں کرتی رہی ہے اور آپ نے بڑی غلطی کی بھابھی! جب اریبہ نے منگنی کی انگوٹھی واپس کی تھی تو آپ کو بھی اسی وقت رشتہ ختم کر دینا چاہیے تھا۔" امینہ کی آخری بات پر ساجدہ بیگم چونک کر انہیں دیکھنے لگی تھیں۔

"ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ رازی کا حال توصیف بھائی جیسا نہ ہو تو یہ رشتہ ختم کر دیں۔

"میں کسی غلط نیت سے نہیں کہہ رہی بھابھی! اگر رازی میرا خون ہے تو اریبہ بھی میرا خون ہے مگر رازی سے تو میرے خاندان کی نسل بڑھے گی اس کی زندگی میں یاسمین جیسی عورت نہیں آنی چاہیے۔" امینہ نے انجانے میں ساجدہ بیگم کی آدھی پریشانی دور کر دی تھی۔

"سوچتی تو میں بھی ایسا ہی ہوں امینہ! لیکن مجھے توصیف کا خیال آتا ہے۔" ساجدہ بیگم گہری سانس بمشکل دبا کر بولی تھیں۔

"آپ کیا سمجھتی ہیں، مجھے توصیف بھائی کا خیال نہیں ہے۔ ان کا خیال کر کے ہی میں ایسا کہہ رہی ہوں۔ کیونکہ رازی اور اریبہ کی شادی اگر ہو بھی گئی تو زیادہ عرصہ نہیں چلے گی اور یہ بات توصیف بھائی کے لیے زیادہ تکلیف دہ ہوگی۔ ویسے رازی کیا کہتا ہے؟"

امینہ نے آخر میں اچانک رازی کا ارادہ جاننا چاہا تو ساجدہ بیگم سنبھل کر کہنے لگیں۔

"کچھ نہیں۔ رازی نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی اور میں بھی ابھی اسے نہیں چھیڑنا چاہتی۔ پتا نہیں اس کے دل میں کیا ہے امینہ! البتہ یہ میں دیکھ رہی ہوں کہ وہ کچھ اکھڑا اکھڑا رہنے لگا ہے۔"

"ظاہر ہے بھابھی! وہ بھی انسان ہے پھر مرد۔۔۔ اور مرد کہاں ایسی حرکتیں برداشت کرتے ہیں۔"

امینہ پر اس وقت بھتیجے کی محبت غالب تھی اور شاید یہ بات بھی کہ بھتیجے سے ان کے خاندان کی نسل چلے گی۔ یہ نہیں تھا کہ انہیں اریبہ سے محبت نہیں تھی یا اس کی فکر نہیں تھی۔ وہ ہر نماز میں اریبہ کی سلامتی اور خیریت سے گھر واپس آنے کی دعائیں مانگتی تھیں لیکن اس کا قصور معاف کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ ان کی نظروں میں وہ مجرم تھی۔ خاندان کی عزت و ناموس کی قاتل۔۔۔

ثنا نے چائے کے ساتھ ڈھیروں لوازمات سے ٹیبل بھر دی تھی اور امینہ کو ہر۔۔۔ چیز کھانے پر اصرار کرنے لگی، تب ہی سمیر آگیا اور ٹیبل دیکھ کر بے ساختہ بولا تھا۔

"واہ! اچھے وقت پر آیا ہوں۔"

"یہاں جب بھی آؤ گے، تمہیں اچھا وقت ہی ملے گا البتہ۔۔۔" ثنا اپنی ترنگ میں شروع ہوئی تھی کہ ساجدہ بیگم کے گھورنے پر خاموش ہو گئی لیکن سمیر اس کا مطلب سمجھ گیا تھا، جب ہی بیٹھنے کا ارادہ ترک کر کے امینہ سے بولا۔

"چلیں امی!"

"جی نہیں۔" ثنا پہل بول پڑی۔ "پھپھو ابھی نہیں جائیں گی۔ رات کے کھانے تک تو رکیں گی۔ ہو سکتا ہے رات میں بھی رک جائیں۔"

"ارے نہیں بیٹا! گھر میں طیبہ اکیلی ہے۔ پھر جب اسے ساتھ لے کر آؤں گی تب ضرور رکوں گی۔" امینہ نے

کہا تو ثنا منہ پھلا کر بولی۔
"پھر تو پتا نہیں پھپھو آپ کب آئیں گی۔"
"آؤں گی ان شاء اللہ جلدی آؤں گی اور جہاں تک رکنے کی بات ہے تو بیٹا! تمہارا یہ ارمان میں رازی کی شادی میں پورا کروں گی۔" امینہ روانی میں کہہ تو گئیں لیکن فوراً" احساس بھی ہو گیا۔ سٹپٹا کر ساجدہ بیگم کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پریشان ہو گئی تھیں جبکہ ثنا کو موقع مل گیا تھا۔
"رازی بھائی کی شادی تو آپ بھول ہی جائیں پھپھو! پتا نہیں ہو گی بھی کہ نہیں۔"
"کیوں نہیں ہو گی؟" ساجدہ بیگم تڑپ گئیں۔ ثنا کو ڈانٹنے لگیں۔ "ہزار بار منع کیا ہے فضول مت بولا کرو لیکن تمہاری زبان کو لگام ہی نہیں ہے۔ کسی دن سچ مچ گدی سے کھینچ لوں گی تمہاری زبان۔"
"جانے دیں بھابھی! بچی ہے۔ آپ غصہ نہ کریں۔" امینہ پریشان ہو کر ساجدہ بیگم کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔
"سمیر! پانی دو۔۔۔ لیجیے بھابھی! پانی پییں۔"
ساجدہ بیگم نے امینہ کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے لیا اور غالباً" اپنے غصے پر قابو پانے کی غرض سے اٹھ کر اندر چلی گئیں تو امینہ نے خائف انداز میں پہلے سمیر کو دیکھا پھر ثنا کو سمجھانے لگیں۔
"بیٹا! تم تو سمجھ دار لڑکی ہو' تمہیں اپنی ماں کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"
"کیسی باتیں پھپھو! میں نے کیا غلط کہا ہے۔ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے' اس سے آپ کو لگتا ہے کہ رازی بھائی کی شادی ہو پائے گی۔۔۔ مجھے تو نہیں لگتا۔ ہاں اگر رازی بھائی اریبہ کا خیال چھوڑ دیں' تب ان کی شادی ممکن ہو سکتی ہے۔" ثنا بے حد تلخی سے بول رہی تھی۔
"آپ رازی بھائی کو سمجھائیں پھپھو! اور ساتھ امی کو بھی' اریبہ میں کوئی سُرخاب کے پر نہیں لگے اور اب تو وہ سچ مچ کسی کی بیوی یا بہو بننے کے لائق نہیں رہی ہو گی۔"
"ثنا!" سمیر نے بہت ضبط سے ثنا کو مخاطب کیا۔ "بے شک تم غلط نہیں کہہ رہیں لیکن تمہیں یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔"
"سمیر ٹھیک کہہ رہا ہے بیٹا! تمہیں یوں بے دھڑک نہیں بولنا چاہیے۔ پھر ایسے حالات میں جب کہ تمہاری ماں خود پریشان ہے' تمہیں اور احتیاط کرنی چاہیے۔ بلکہ تم تو بیٹی ہو۔ دل جوئی کرو ماں کی۔" امینہ نے سمیر کی تائید کرتے ہوئے ثنا کو مزید سمجھایا تھا۔
"ٹھیک ہے' اب میں کچھ نہیں بولوں گی لیکن یہ میں آپ کو بتا دوں کہ اگر اریبہ اس گھر میں آ گئی تو امی کی پریشانیاں مزید بڑھ جائیں گی۔" ثنا نہ بولنے کا کہہ کر بھی جتانے سے باز نہیں آئی تھی۔
امینہ نے بمشکل خود کو کچھ کہنے سے باز رکھتے ہوئے سمیر کو بھی خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

شمشیر علی کو سرراہ جس لڑکے نے تصویر بنوانے کے لیے کہا تھا' وعدے کے مطابق شمشیر علی اسی شام اس کے گھر گیا تھا۔ اس لڑکے کا نام ابراہیم تھا جو ایک پسماندہ علاقے میں رہائش پذیر تھا۔ دو کمروں کا چھوٹا سا گھر تھا جس میں ابراہیم' اس کے ماں باپ اور چار بہن بھائی انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ابراہیم کا باپ نابینا تھا اور ماں تیرے میرے گھر کام کر کے کچھ پیسے کما لیتی تھی۔ اس پسماندہ علاقے میں جہاں لوگوں کو پیٹ بھر روٹی میسر نہیں تھی' وہاں کام کاج کے لیے ملازم رکھنے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا' اس لیے ابراہیم کی ماں کو ایک تو کام

بہت مشکل سے ملتا تھا' پھراجرت بھی اتنی جو آٹا دال بھی پورا نہیں کرتی تھی۔

ابراہیم اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور سرکاری اسکول میں مڈل تک ہی پڑھ سکا تھا۔ تصویریں بنانے کی صلاحیت اس میں خداداد تھی۔ اسکول کی پہلی دوسری کلاس میں ہی اس کی ڈرائنگ بہت اچھی تھی اور وہ گھر آکر بھی زیادہ تر ڈرائنگ کی مشق کیا کرتا تھا۔ شاید اس کا شوق تھا جو وہ ہوم ورک کے بعد رف کاپی پر مختلف تصویریں بنا کر خوش ہوتا تھا۔ ابتدا اس نے گھر میں رکھے سامان سے کی تھی۔ سامنے صندوق نظر آیا تو اسے کاپی پر منتقل کردیا پھر چارپائی' پرانی میز' جو ایک پائے سے محروم تھی اور اس کی جگہ اینٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ اور یوں ہوتے ہوتے ایک روز اس نے چارپائی پر بیٹھے ابا کی تصویر بنا ڈالی تھی۔ اس وقت اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ بھی ایک فن ہے جس کی آبیاری کی جائے تو نام کے ساتھ پیسہ بھی کمایا جاسکتا ہے۔ وہ بس خوش ہوتا تھا۔ ابا کے بعد اماں' پھر سب بہن بھائیوں کی تصویریں بنا ڈالیں۔ پھر ایک روز گھر سے دور وہ نیم کی چھاؤں میں بیٹھا سامنے کام کرتے کسی مزدور کی تصویر بنا رہا تھا' جب قریب سے گزرتے ایک آدمی نے اس کی کاپی دیکھ کر شوق سے پوچھا تھا۔

"تم تصویریں بناتے ہو؟"

"جی وہ میں۔۔۔ بس ایسے ہی۔" وہ ڈر گیا تھا کہ اس سے کوئی جرم تو سرزد نہیں ہوگیا۔

"ایسے ہی تو نہیں یار! تم تو پکے فنکار ہو۔" وہ آدمی اس کے سامنے پنجوں پر بیٹھ کر پوچھنے لگا۔ "میری تصویر بنادو گے؟"

"جی۔" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کاپی کا صفحہ الٹ دیا۔

"چلو پھر شروع ہوجاؤ۔" وہ آدمی باقاعدہ پوز بنا کر بیٹھ گیا تو ابراہیم نے آدھے گھنٹے میں اس کی تصویر بنا کر کاپی اس کے سامنے کردی تھی۔

"بھئی واہ! تم نے تو کمال کردیا۔ کتنے پیسے ہوئے؟" آدمی نے اپنی تصویر دیکھ کر خوش ہو کر پوچھا تو وہ حیران ہوا تھا۔

"پیسے۔۔۔"

"ہاں پیسے' کتنے پیسے لوگے؟" آدمی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ تصویر دیکھتے ہوئے جیب سے سو کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ تب بھی وہ نا سمجھی کے عالم میں لال نوٹ کو دیکھنے لگا تھا۔

"ابھی یہی رکھو یار! جب پورٹریٹ بنواؤں گا' تب جتنے کہو گے اتنے دوں گا۔" آدمی یہی سمجھا کہ اسے سو روپے کم لگ رہے ہیں جب ہی نہیں لے رہا۔ زبردستی اس کے ہاتھ میں تھما کر کاپی سے اپنی تصویر والا صفحہ نکال لیا۔ ابراہیم کافی دیر بعد سمجھا خوشی خوشی گھر دوڑا۔

پھر ابراہیم نے معمول بنا لیا۔ نیم کی چھاؤں میں بیٹھ کر گاہکوں کا انتظار کرتا۔ کچھ وقت گزرا پھر وہ خود گاہکوں کی تلاش میں نکلنے لگا تھا۔ یوں شمشیر علی کی صورت اسے ایک مستقل گاہک مل گیا تھا۔ کیونکہ شمشیر علی کو اپنی تصویر بنوانے سے دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ خود تصویر بنانا چاہتا تھا۔ یہ خیال کیونکہ اسے ابراہیم کی بنائی تصویر دیکھ کر آیا تھا۔ اس لیے وہ اسی سے سیکھنے لگا تھا۔ ایک طرح سے اس نے ابراہیم کو مشکل میں بھی ڈال دیا تھا کیونکہ اس نے باقاعدہ کہیں سے فن مصوری کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی' جو وہ اسی طرز پر شمشیر علی کو سکھاتا۔

شمشیر علی کے لیے بھی مصوری آسان نہیں تھی بلکہ بے حد مشکل کیونکہ وہ فنون لطیفہ کے الف ب سے بھی واقف نہیں تھا۔ پھر اس کے اندر ایسا کوئی شوق بھی نہیں تھا۔ مجبوری ہی تھی۔ اس کے پاس تاجور کی تصویر نہیں تھی اور وہ تاجور کی تصویر بنا کر اس کی گمشدگی کا اشتہار لگوانا چاہتا تھا۔ بہرحال دو مہینے ہوگئے تھے اسے ابراہیم کے پاس آتے ہوئے اور وہ ابھی تک چہرے کی ساخت بنانے میں اٹکا ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کے ذہن پر تاجور

سوار تھی۔ پنسل پکڑتے ہی اس کی نظروں میں تاجور کا چہرہ سما جاتا' پھر لاکھ ابراہیم کہتا یوں نہیں یوں۔ لیکن وہ سنتا ہی نہیں تھا اور آخر میں جھنجلا کر اٹھ جاتا۔ گھر میں بھی وہ جتنی دیر رہتا' اسی کام میں لگا رہتا۔

☼ ☼ ☼

اس وقت وہ کتنے پیپر پھاڑ چکا تھا پھر نئے سرے سے بورڈ پر پیپر چپکا رہا تھا کہ اریبہ سے رہا نہیں گیا۔ اس کی اس مغزماری سے اسے کوفت ہونے لگی تھی' جب ہی اس نے ٹوک دیا۔

"جب ایک کام تم سے ہو نہیں سکتا تو کیوں وقت ضائع کر رہے ہو۔"

شمشیر علی نے گردن موڑ کر خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔

"ویسے مجھے تھوڑی بہت آرٹ سے دلچسپی ہے۔ سمجھ بوجھ بھی رکھتی ہوں۔ اگر کہو تو میں تمہاری مدد کروں؟" اریبہ پھر بولنے سے باز نہیں آئی تو اب وہ پورا اس کی طرف گھوم گیا تھا۔

"کیا مدد کروگی تم میری؟"

"بتاؤں گی کہ اسکیچ کیسے بنایا جاتا ہے۔" وہ بہت آرام سے بولی۔

"کیسے بنایا جاتا ہے!" وہ اس کی مدد نہیں لینا چاہتا تھا لیکن مجبور تھا۔ پنسل اس کی طرف بڑھائی تو وہ قریب چلی آئی اور اس کے ہاتھ سے پنسل لے کر یونہی پوچھنے لگی۔

"کس کی تصویر بنانا چاہتے ہو؟"

"تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔" وہ یکدم نروٹھا بن گیا تھا۔

"کیوں مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے جب یہ ہی پتا نہیں ہوگا کہ تم کیا چاہ رہے ہو میں کیسے تمہیں سمجھا سکتی ہوں۔" وہ تیز ہو کر بولی تھی اور چونکہ غلط نہیں کہہ رہی تھی اس لیے وہ ہتھیار ڈال گیا اور نظریں چرا کر بولا۔

"میں ایک لڑکی کی تصویر بنانا چاہتا ہوں۔" اریبہ کو اس پر تعجب نہیں ہوا البتہ اس کے نظریں چرانے پر بے ساختہ مسکرائی تھی۔

"لڑکی کی تصویر ہے تمہارے پاس؟"

"تصویر ہوتی تو بنا تا کیوں' اسی سے کام چلا لیتا۔ میرا مطلب ہے۔"

"خیر تمہارا جو بھی مطلب ہو۔" وہ ٹوک کر کہنے لگی۔ "میں کون سا تصویر دیکھ کر ویسی ہی بنا لیتی۔ بس یونہی ایک خاکہ سا بنا دیتی۔"

"خاکہ۔" وہ سمجھا نہیں۔

"ہاں ایسا۔" اریبہ نے منٹوں میں اس کے سامنے ایک لڑکی کی تصویر بنا دی پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔ "تم ایسی ہی تصویر بنانا چاہتا ہو؟"

"ہاں لیکن' یہ ویسی نہیں ہے۔" وہ اپنے آپ میں الجھ رہا تھا۔

"ویسی تو کوئی بھی نہیں بنا سکتا۔ میرا مطلب ہے' جو تمہارے تصور میں ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ تم پہلے باقاعدہ مصوری سیکھو' پھر تم خود بنا سکوگے۔" وہ بہت سنجیدگی سے بات کر رہی تھی بالکل اسی طرح جیسے اکیڈمی میں اسٹڈی کرتے ہوئے کسی موضوع پر وہ عروسہ' مہک اور جمال سے بات کرتی تھی۔

شمشیر علی اس کے ہاتھ سے پنسل لے کر اس کی بنائی ہوئی تصویر پر پھیرنے لگا۔ وہ کچھ دیر اس کے ہاتھ کی حرکت دیکھتی رہی پھر پلٹ کر کرسی پر جا بیٹھی۔

☼ ☼ ☼

توصیف ولا میں پہلے بھی ایسی کوئی ہلچل یا افراتفری تو نہیں رہتی تھی پھر بھی زندگی کا احساس ہوتا تھا' جو اب بالکل مفقود ہو گیا تھا۔ گھر کے افراد یوں لگتا تھا جیسے انہیں ریموٹ کنٹرول سے چلایا جا رہا ہو۔ یاسمین جو دو پہر بارہ ایک بجے اٹھنے کی عادی تھی' وہ اب علی الاصبح بستر چھوڑ کر کمرے سے نکل آتی اور دبے پاؤں بنا آہٹ کے ایک ایک کمرے میں جھانکتی' پھر لان سے ڈرائیو وے۔ اس کے بعد سیڑھیاں چڑھتی ہوئی ٹیرس پر آن بیٹھتی۔ اس کا ذہن بالکل خالی ہوتا تھا۔ وہ کچھ سوچنا بھی چاہتی تو اسے کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ بس اندر کہیں یہ احساس مسلسل کچوکے لگاتا تھا کہ اریبہ اس کی وجہ سے کہیں چلی گئی ہے۔

پھر سارہ تھی جس کی صبح ہمیشہ چھ سات بجے ہوتی تھی۔ وہ اب دن چڑھے تکیے میں منہ چھپائے پڑی رہتی۔ کتنی بار بی بی اور تاجور آ کر اسے اٹھاتیں' لیکن وہ نہیں اٹھتی تھی۔ وہ اٹھنا چاہتی ہی نہیں تھی۔ کیونکہ جاگتے ہی پراگندہ سوچوں سے اسے جو ذہنی اذیت سہنی پڑتی تھی وہ اب اس کی برداشت سے باہر تھی۔ اسے بھی یہ احساس کچوکے لگاتا تھا کہ اریبہ اس کی وجہ سے گئی ہے۔ کاش! وہ اریبہ کو ہمراز بنا لیتی تو وہ کوئی حل نکال لیتی یوں چھوڑ کر تو نہ جاتی۔

گویا اب سب کو یقین تھا کہ اریبہ خود سے گئی ہے تو لاکھ اس کی طرف سے فکر مند سہی سب اس سے شاکی بھی ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود سب کو اس کا انتظار بھی تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اب اور کوئی کام ہی نہیں ہے زندگی میں بس ایک انتظار رہ گیا ہے۔

اس وقت یاسمین گھر کی فضا سے وحشت زدہ ہو کر باہر نکلی تھی تو پہلی بار اسے احساس ہوا کہ کہیں کچھ بھی ہو جائے' دنیا کے گورکھ دھندے نہیں رکتے۔ سڑکوں پر ٹریفک ہمیشہ کی طرح رواں دواں تھی۔ فٹ پاتھ بھی آباد تھے' پھر ویرانی کہاں تھی۔ اسے کیوں لگ رہا تھا کہ دنیا ویران ہو گئی ہے۔ نہیں۔۔۔ دنیا تو ویسی ہی تھی ہمیشہ کی طرح چمکتی دمکتی شاید اس کا دل ویران ہو گیا تھا۔ اسی طرح وحشت زدہ سی وہ شہباز درانی کے سامنے آتے ہی ڈھے گئی تھی۔

"شبی! میں ٹوٹ رہی ہوں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی دھیرے دھیرے میرے بدن سے روح کھینچ رہا ہو۔ میں بہت اذیت میں مبتلا ہوں شبی!"

"او کم آن یاسمین! تم نے خواہ مخواہ اریبہ کے جانے کو خود پر طاری کر لیا ہے۔" شہباز درانی نے اس کے کندھے پر بازو پھیلا کر اسے سہارا دیتے ہوئے کہا تو وہ سناٹے میں آ کر انہیں دیکھنے لگی۔

"خواہ مخواہ۔۔۔؟"

"ہاں تو اور کیا! اریبہ کوئی بچی نہیں ہے سمجھ دار لڑکی ہے اور اس کا یہ اقدام ظاہر کرتا ہے کہ وہ باقاعدہ پلاننگ کر کے بھاگی ہے۔ پھر تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔" شہباز درانی نے یاسمین کا کندھا دبا کر اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کی' پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

"ہری اپ ڈارلنگ! مسکراؤ' مجھے تم فریش اچھی لگتی ہو۔" یاسمین نظروں کا زاویہ بدل کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اسے اپنا دل کسی شکنجے میں محسوس ہو رہا تھا۔

"یہ بکھری زلفیں اور چہرے پر غم کی چھاپ سجا کر تم بس توصیف احمد کو ہی مرعوب کیا کرو۔" شہباز درانی کہہ کر خود ہی ہنسنے لگے' پھر ہنستے ہوئے ہی کہنے لگے۔ "کمال کی ایکٹنگ کرتی ہو تم ویسے' یاد ہے' جب اریبہ نے ہم دونوں کو گاڑی میں دیکھ لیا تھا تو پھر گھر جا کر تم نے کیسا بیماری کا ڈھونگ رچایا تھا' او گاڈ!"

یاسمین کی نظریں بھٹکتی ہوئی شہباز درانی کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔

"اور سنو۔" شہباز درانی اپنی پیشانی یاسمین کی پیشانی سے ملا کر کہنے لگے۔ "اریبہ بھی تو تمہاری بیٹی ہے۔ تم

ے مختلف تو نہیں ہو سکتی' البتہ تم سے دو قدم آگے ہے۔ دیکھنا! واپس آ کر وہ بھی تمہاری طرح کوئی کہانی گھڑ کر ب کو مطمئن کر دے گی۔"

یاسمین کے اندر یکدم ابال اٹھا تھا۔ دل چاہا اس شخص کا منہ نوچ لے۔ لیکن وہ اس کا منہ کیسے نوچ سکتی تھی۔ اسے یہ جرات خود اسی نے تو دی تھی اب اسے کیسے جھٹلا سکتی تھی۔ بمشکل خود پر قابو پا کر پیچھے ہٹتے ہوئے جیسے اچانک یاد آنے پر پوچھنے لگی۔

"ہاں شبی! اس روز تم اپنی بیٹی کی شادی کا بتا رہے تھے' کب ہے؟"

"کب ہے؟ بھئی ہو گئی۔ میں نے بتایا تو تھا اس نے کورٹ میرج کر لی ہے۔" شہباز درانی نے حیرت کے اظہار کے ساتھ کہا۔

"اچھا ہاں! کرسچن لڑکے سے ناں؟" یاسمین کو بھلا کوئی مات دے سکتا تھا۔

"بھئی! یہ بڑی ٹریجڈی ہے اپنا ملک چھوڑ کر جانے والوں کے ساتھ۔ عاقبت خراب ہو جاتی ہے۔ اب دیکھو ناں! تمہاری بیٹی نے جو قدم اٹھایا اس کی تو معافی بھی نہیں ہے' نہ صرف اس کے لیے بلکہ تمہارے لیے بھی۔ نو معافی۔"

"کیا مطلب؟" شہباز درانی اچھلے تھے۔

"ظاہر ہے تم مسلمان ہو۔ تمہاری اولاد بھی مسلمان ہو گی تو ایک مسلمان لڑکی کا غیر مسلم کے ساتھ نکاح جائز ہی نہیں ہے' پھر یہ بات تم نے اپنی بیٹی کو کیوں نہیں سمجھائی تھی؟"

شہباز سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تو ہونٹ بھینچ گئے۔

"یہ بڑا گمبھیر مسئلہ ہے شبی! مجھے حیرت ہے تم اتنے آرام سے کیسے ہو۔ جاؤ اس سے پہلے کہ تمہاری دوسری بیٹی بھی ہاتھ سے نکل جائے' اپنی فیملی کو یہاں لے آؤ۔ سمجھ رہے ہو ناں۔"

"ہوں۔" شہباز اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔

"اچھا ٹھیک ہے' تم سوچو میں چلتی ہوں۔" یاسمین نے کہنے کے ساتھ قدم آگے بڑھایا تھا کہ شہباز درانی پوچھنے لگے۔

"چائے نہیں پیو گی۔"

"نہیں۔" یاسمین نے اپنے بڑھتے ہوئے قدم کو رکنے نہیں دیا اور اپنے پیچھے نہیں نہیں کی تکرار چھوڑ کر اس گناہوں کی دلدل سے دور نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

سمیر اپنی قسم توڑ کر سارہ کے پاس آیا تھا۔

اس نے قسم کھائی تھی کہ جب تک سارہ اس کے ساتھ اریبہ کا معاملہ ــــ شیئر کرنے کے لیے خود سے اسے نہیں بلائے گی' وہ نہیں جائے گا لیکن اس تمام عرصے میں سارہ نے اسے فون تک نہیں کیا تھا۔ اتنے انتظار کے بعد آخر وہ خود ہی چلا آیا۔ اس کے اندر غصہ تھا لیکن سارہ کی شکل دیکھ کر اسے ضبط کرنا پڑا' پھر بھی جتانے سے باز نہیں رہ سکا۔

"بالکل اجنبی کر دیا تم نے مجھے۔"

"یہ بات نہیں ہے سمیر!" سارہ حد درجہ دل گرفتہ نظر آ رہی تھی۔

"پھر کیا بات ہے؟"

"بات تو وہی ہے جو سب کے علم میں ہے، پھر اور میں تم سے کیا کہتی۔" سارہ نے کہا تو وہ افسوس سے بولا۔
"کہنے کو تو بہت کچھ تھا۔ یوں کہو اب تمہیں میری تسلی کی ضرورت نہیں رہی۔"
"ہاں نہیں رہی۔ مجھے تسلی کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ایسی کوئی کوشش کرنا بھی مت۔" سارہ نے بے مروتی دکھائی۔
"نہیں میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔ میں تو تم سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تم کالج کیوں نہیں جا رہیں۔" سمیر نے اس کا موڈ دیکھتے ہوئے بات بدلی۔
"میں نے کالج چھوڑ دیا ہے۔ مطلب پڑھائی ہی چھوڑ دی ہے۔ اب پلیز یہ مت کہنا کیوں؟" سارہ کے پاس جانے کیوں کا جواب نہیں تھا یا وہ بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سمیر سمجھ نہیں سکا تو کندھے اچکا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
"چائے پیو گے۔" سارہ نے پوچھا تو وہ اسے یوں دیکھنے لگا جیسے اس کی بات سنی نہ ہو۔
"چائے کا پوچھ رہی ہوں 'پیو گے؟'"
"نہیں۔ اب پلیز یہ مت کہنا کیوں؟" وہ اس کی بات لوٹا کر انجان بن گیا تھا۔
"اچھا میں اپنے لیے لے کر آتی ہوں۔" سارہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلی گئی تو وہ اپنے آپ پر جھنجلانے لگا۔
"پاگل ہوں میں 'منہ اٹھائے چلا آتا ہوں۔"
"سارہ باجی!" اچانک آواز پر سمیر چونک کر دیکھتے ہی مبہوت ہو گیا تھا۔ اتنا مکمل حسن شاید اس سے پہلے اس نے نہیں دیکھا تھا۔
"وہ۔ سارہ باجی۔۔۔!" تاجور گھبرا گئی۔
"ہاں سارہ ابھی یہیں تھی 'چائے بنانے گئی ہے۔" وہ بمشکل سنبھل پایا۔ تاجور وہیں سے پلٹ گئی تو اس نے خود کو صوفے پر گرا لیا۔
"یہ پری کہاں سے آئی تھی۔" وہ سوچنے لگا جب سارہ چائے لے کر آئی تو وہ اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگا۔
"سارہ! وہ لڑکی کون ہے۔ میرا مطلب ہے ابھی یہاں ایک لڑکی آئی تھی تمہارا پوچھ رہی تھی؟"
"تاجور ہو گی۔" سارہ نے بے نیازی سے کہہ کر چائے کا ایک مگ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔
"تاجور۔۔۔ کون تاجور۔۔۔؟" اس نے زور دے کر پوچھا۔
"میری دوست ہے۔ یہیں رہتی ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟" سارہ نے اس انداز میں کہا کہ وہ جھنجلا گیا۔
"میں کون ہوتا ہوں اعتراض کرنے والا۔ تمہارا گھر ہے جیسے چاہے رکھو' میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ پہلے کبھی نظر نہیں آئی۔"
"تو تمہیں اس بات کا افسوس ہے کہ تاجور تمہیں پہلے نظر کیوں نہیں آئی۔" سارہ کا لہجہ آپ ہی آپ شرارتی ہو گیا تھا۔ وہی بات کہ انسان مستقل ایک ہی موڈ میں نہیں رہ سکتا۔ روتے میں اچانک کوئی بات ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہے اور کبھی ہنستے ہوئے آنکھ بھر آتی ہے۔ بہر حال سمیر نے سارہ کا موڈ بدلنے پر دل ہی دل میں شکر کرتے ہوئے جھینپنے کی ایکٹنگ کی تھی۔
"شرمانے کی ضرورت نہیں ہے کہو تو اسے یہیں بلا لوں۔"
"توبہ کرو' مرنا نہیں ہے مجھے۔" وہ فوراً بولا تھا۔
"کیا مطلب۔۔۔؟"
"آدھا فوت ہو گیا تھا اسے دیکھ کر' اگر وہ کچھ دیر اور یہاں رک جاتی تو میں پورا گیا تھا۔" اس کی وضاحت پر سارہ

نے مسکرانے پر اکتفا کیا پھر چائے کا مگ ہونٹوں سے لگالیا تو قدرے توقف سے وہ بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگا۔

"ویسے رہتی کہاں ہے تمہاری دوست؟"

"بتایا تو ہے یہیں رہتی ہے میرے ساتھ۔" سارہ کے جواب سے وہ مطمئن نہیں ہوا تھا لیکن مزید سوال اٹھانے سے قصداً" گریز کرتے ہوئے چائے پینے لگ گیا۔

"تاجور اصل میں اریبہ کی پیشنٹ تھی۔" سارہ کو شاید احساس ہو گیا تھا اس لیے خود ہی بتانے لگی۔

"اریبہ تاجور کو علاج کے لیے گھر لے آئی تھی پھر یہ ہمیں اتنی عزیز ہو گئی کہ ہم نے اسے جانے ہی نہیں دیا۔"

"اور اس کے گھر والے؟" وہ فوراً" پوچھ کر خاموش ہوا تھا۔

"ان کی اجازت سے ہی یہ ہمارے ساتھ ہے۔ اصل میں بیماری کی وجہ سے یہ بے چاری اسکول نہیں جا سکی تھی تو علاج کے بعد اریبہ نے کہا کہ ہم اسے پڑھائیں گے۔ ماشاء اللہ قرآن پاک ختم کرنے والی ہے اور اب میں اسے اردو اور انگریزی کے قاعدے پڑھاتی ہوں۔ خود اسے بھی پڑھنے کا بہت شوق ہے۔" سارہ نے اصل کہانی میں ردوبدل کرکے اسے مطمئن کر دیا تھا۔

"یہ تو اچھی بات ہے لیکن یہ۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ پہلے نظر کیوں نہیں آئی۔" وہ پھر پہلی بات پر آگیا تھا۔

"کیونکہ ہم اسے چھپا کر رکھتے ہیں۔ تمہیں پتا تو ہے اریبہ ایسے معاملات میں کتنی سخت ہے۔ اس کے سامنے تو ذکر بھی مت کرنا کہ تم نے تاجور کو دیکھ لیا ہے۔" سارہ روانی میں کہہ تو گئی لیکن پھر ایکدم خاموش ہو گئی تھی اور وہ اب خاموش نہیں رہ سکا۔

"اسی بات پر تو حیرت ہے مجھے کہ اریبہ جو ہر بات میں مناسب نامناسب سمجھانے کھڑی ہو جاتی تھی اس نے اپنے لیے ایسا کیوں نہیں سوچا۔ کم از کم یہ تو بتاتی کہ وہ کس سے اور کیوں ناراض ہو کر جا رہی ہے۔"

"میرا خیال ہے وہ سب سے ناراض تھی۔ شاید اپنے آپ سے بھی' پر تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اسے اس طرح نہیں جانا چاہیے تھا۔" سارہ اپنے خول سے نکل آئی تھی پھر بھی سمیر نے احتیاط سے پوچھا تھا۔

"تمہیں بھی اس نے کچھ نہیں جتایا تھا۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ کوئی ایسی بات جس سے پتا چلتا کہ وہ کہیں جانے کا سوچ رہی ہے۔"

"نہیں اور اس کی روٹین میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا جو میں ٹھٹکتی۔" سارہ نے کہہ کر گہری سانس کھینچی تو سمیر نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

☼ ☼ ☼
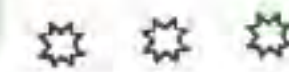
زندگی ٹھہر گئی تھی۔

وہ جو ہر دم متحرک رہا کرتی تھی۔ اب اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ دماغ بھی بالکل خالی ڈبا بن گیا تھا۔ کیونکہ اس عرصے میں وہ خود سے وابستہ ہر فرد کو اتنا سوچ چکی تھی کہ اب مزید سوچنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ خالی ذہن کے ساتھ بنا کسی مقصد کے کمرے سے نکلتی' چند لمحے لاؤنج میں رکتی' پھر کچن میں جھانک کر واپس کمرے میں آجاتی۔ وہ اب تک یہ بھی نہیں جان پائی تھی کہ شمشیر علی اسے یہاں کیوں لایا ہے۔ وہ ایسی قیدی تھی جو تختہ دار پر چڑھنے تک اپنا قصور سوچتا رہ جاتا ہے اور اب تو اس نے یہ سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ نہ اپنا قصور سوچتی' نہ شمشیر علی کا مقصد۔ شاید اس کا ذہن مفلوج ہو گیا تھا اور مفلوج ذہن کے ساتھ وہ خود کو کہاں تک گھسیٹ سکتی تھی۔ آخر ڈھے گئی۔

اس رات شمشیر علی گھر آیا تو وہ بخار میں جل رہی تھی۔ چہرے اور آنکھوں کی سرخی دیکھ کر ہی اس کی حرارت کا پتا چل رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟" شمشیر علی متوحش ہو گیا۔ وہ خاموش رہی' لیکن آنکھوں میں پانی جمع ہو گیا تھا۔

"ارے! تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔" شمشیر علی اس کی کلائی چھو کر کہنے لگا۔ "میں تمہارے لیے دوا لاتا ہوں۔ کیا کہوں ڈاکٹر سے؟ صرف بخار یا کوئی اور تکلیف بھی ہے؟ میرا مطلب ہے کھانسی زکام وغیرہ۔"

"گلے میں تکلیف ہے۔" وہ تھوک نگل کر بولی۔

"اچھا میں بس ابھی گیا ابھی آیا۔" وہ بہت عجلت میں نکل گیا۔

اس نے آنکھیں بند کیں تو کناروں پر جمع آنسو روانی سے چھلک کر تکیے میں جذب ہونے لگے۔

تقریباً" آدھے گھنٹے بعد شمشیر علی واپس آیا تو وہ اسی طرح بے سدھ پڑی تھی پھر بھی آہٹ پر ذرا آنکھیں کھول دیں۔

"تم پہلے چائے کے ساتھ یہ بسکٹ کھالو پھر دوا لینا۔" شمشیر علی نے چائے کا کپ سائیڈ میں رکھ کر اسے اٹھنے میں مدد دی پھر بسکٹ کا پیکٹ کھول کے اس کی گود میں رکھا اور چائے کا کپ لے کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے بنا کسی حیل و حجت کے دو بسکٹ کھائے اور اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے کر پینے لگی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"گلا خراب تھا تو صبح بتاتیں میں اسی وقت دوا لے آتا۔" وہ کچھ نہیں بولی۔ دوا کا لفافہ اٹھا کر ٹیبلٹ نکالی اور چائے کے ساتھ نگل لی۔ پھر خالی کپ اس کی طرف بڑھا کر بولی۔

"لائٹ آف کرتے جاؤ۔"

"اور کچھ چاہیے تو بتادو۔"

"جو چاہیے وہ تم دے نہیں سکتے' لہٰذا پوچھو بھی مت۔" وہ کہہ کر لیٹ گئی' لیکن وہ اسی طرح کھڑا رہا۔

"جاؤ پلیز! لائٹ آف کرو۔ میری آنکھوں میں چبھ رہی ہے۔" اس نے تنگ آکر کہا تو وہ اس کی آنکھوں اور عین سامنے جلتے بلب کے درمیان ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگا۔

"پہلے بتاؤ! تمہیں کیا چاہیے۔۔۔؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے اپنی آنکھوں پر بازو رکھ لیا اور جب دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تب کروٹ بدل کر سو گئی تھی۔

شاید دوا کا اثر تھا جو کافی دن چڑھنے پر بھی اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ جب شمشیر علی نے باقاعدہ اس کا نام لے کر پکارا تب اس نے کسمسا کر آنکھیں کھولی تھیں۔

شمشیر علی ہاتھ میں چائے کا کپ لیے کھڑا تھا۔

"اٹھ جاؤ! کچھ کھالو پھر بے شک سو جانا۔۔۔" وہ اپنے پیچھے تکیہ سیدھا کرکے بیٹھ گئی اور کپ لینے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ پوچھنے لگا۔

"صرف چائے یا کچھ کھانے کو بھی دوں؟"

"نہیں! بس چائے۔۔۔" اس نے کہتے ہوئے کپ تھام لیا۔

"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ بخار اترا کہ نہیں؟" شمشیر علی کے پوچھنے پر اس نے اپنی کلائی آگے بڑھا دی۔

"چیک کرلو۔۔۔"

"مجھے بخار چیک کرنا نہیں آتا۔ تم بتاؤ! تمہیں کیا لگ رہا ہے۔" وہ ناگواری سے بولا۔

"مجھے تو لگ رہا ہے' میرا آخری وقت آگیا ہے۔ اب کہو تو اپنی آخری وصیت سنا دوں یا لکھ دوں۔" اس نے

سنجیدگی سے کہا تھا، مگر وہ ہنس پڑا۔
"نہیں! لکھنے، سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں تم کیا وصیت کرو گی۔"
"کیا۔۔۔؟" وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
"یہی کہ تمہاری لاش تمہارے ورثاء کے حوالے کر دی جائے۔" وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، پھر بھی وہ نفی میں سر ہلا کر چائے پینے لگی۔
"اچھا! پھر کیا وصیت کرو گی؟" وہ اب تجسس سے پوچھ رہا تھا۔
"اب نہیں بتاؤں گی۔"
"تمہاری مرضی۔" شمشیر علی نے کندھے اچکائے۔ "میرا خیال ہے، تم تھک گئی ہو۔ کچھ دن آرام کرو۔ کھانا دانا میں باہر سے لے آیا کروں گا۔"
"مجھے کام نے نہیں، بے کاری نے تھکایا ہے۔" وہ یکدم چیخ گئی۔ "میں اپنی پوری زندگی میں اتنی فارغ کبھی نہیں رہی۔ تم نے مجھے ذہنی طور پر، جسمانی طور پر ہر طرح سے مفلوج کر دیا ہے۔ تمہارا مقصد میری جان لینا ہے تو مار ڈالو مجھے۔ یہ انتظار کیوں کر رہے ہو کہ اس قید سے تنگ آ کر میں خود اپنے گلے میں پھندا ڈال لوں۔"
"نہیں! نہیں۔۔۔" وہ دونوں ہاتھوں کو دائیں بائیں یوں ہلانے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا۔
"کیا نہیں نہیں۔ یہی چاہتے ہو تم۔ اگر نہیں تو بتاؤ کیا مقصد ہے تمہارا؟ کیوں اٹھا لائے ہو مجھے؟ میں تو تمہیں جانتی تک نہیں۔ آخر تم ہو کون؟" وہ غصے سے کانپنے لگی۔
"میں کون ہوں۔" وہ دونوں بازو اپنے سینے پر لپیٹتے ہوئے کہنے لگا۔ "اس عرصے میں تمہیں یہ اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ میں ایک شریف آدمی ہوں اور کوئی شریف آدمی کسی شریف لڑکی پر یونہی ہاتھ نہیں ڈالتا۔"
"یہی تو میں جاننا چاہتی ہوں کہ اس شریف آدمی کے ساتھ ایسا کیا ہوا ہے جو وہ اپنی شرافت داؤ پر لگانے پر اتر آیا ہے۔" وہ اسے جھٹلا نہیں سکی تھی۔
"دیکھو! میں نے تمہیں پہلے دن کہا تھا کہ مجھ سے سوال مت کرنا۔ میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دوں گا۔" شمشیر علی نے پہلے دن اسے وارننگ دی تھی اور اب صرف نروٹھے پن کا مظاہرہ کیا تھا۔
اریبہ دانت پیس کر رہ گئی۔
"ابھی تمہیں کچھ چاہیے؟" قدرے رک کر شمشیر علی نے پوچھا تو وہ فوراً بولی۔
"ہاں۔۔۔"
"کیا۔۔۔؟" شمشیر علی نے سینے پر بندھے بازو یوں چھوڑے تھے جیسے وہ جو کہے گی، فوراً لا دے گا۔
"وہ سب کچھ جو پہلے بھی میری تنہائی کے ساتھی تھے۔" اس نے کہا تو وہ کچھ سمجھا، کچھ نہیں۔
"مثلاً۔۔۔"
"کتابیں، ٹی وی، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، موبائل فون۔۔۔"
"بس۔۔۔" شمشیر علی سچ مچ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا تھا۔
اور اریبہ سچ مچ اپنے بال نوچنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

شمشیر علی معمول سے بہت پہلے گھر لوٹا تو اس کے ہاتھ میں چند میگزین تھے، جو وہ اریبہ کے سامنے ڈال کر بولا۔
"فی الحال میری اتنی ہی حیثیت ہے۔"

اریبہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں بلا ارادہ اپنے سامنے پھینکے گئے میگزین پر جا ٹھہری تھیں۔
"تمہاری باقی ڈیمانڈز کے لیے مجھے تمہارے باپ کے گھر ڈاکا ڈالنا پڑے گا۔" اس نے مزید کہا تو اریبہ کی پیشانی پر ایک لحظہ کو ہلکی سی لکیر ابھری، پھر اس نے پیشانی گھٹنوں پر رکھ لی۔
"خیر! چھوڑو۔ یہ بتاؤ، تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ کچھ کھایا پیا بھی یا صبح سے ایسے ہی بیٹھی ہو؟" وہ محض اس کی طبیعت کی خرابی کے باعث بات بدل گیا تھا۔
"جواب تو دو۔ میں تمہاری خاطر ضروری کام چھوڑ کر آیا ہوں۔" اریبہ جیسے سن ہی نہیں رہی تھی۔ وہ مزید جھنجلا گیا۔
"دیکھو! مجھے غصہ مت دلاؤ۔ میں یہ نخرے برداشت نہیں کر سکتا۔"
"تم نے میرے نخرے دیکھے ہی کہاں ہیں۔" اریبہ نے نہ صرف جھٹکے سے سر اونچا کیا، بلکہ بیڈ سے اتر کر اس کے مقابل آ گئی اور ہتک آمیز انداز سے کہنے لگی۔
"اور میں تمہیں نخرے دکھاؤں گی؟ تمہیں؟ تمہاری اوقات ہی کیا ہے؟ میں اپنے جیسوں کو گھاس نہیں ڈالتی اور تم تو۔۔۔"
"بس۔۔۔" شمشیر علی نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش ہونے کی وارننگ دی، لیکن وہ مزید بپھر گئی۔
"تم انتہائی پنچ، شرافت کا ڈھونگ رچا کر مجھ پر اپنی دھاک بٹھانا چاہتے ہو تاکہ یہاں سے نکل کر میں تمہارے خلاف زبان نہ کھولوں۔ اس خوش فہمی میں مت رہنا شام! تمہیں تو میں تمہارے انجام تک پہنچا کر دم لوں گی۔"
"اچھا! ٹھیک ہے۔ پھانسی چڑھوا دینا مجھے۔ اب پلیز! خاموش ہو جاؤ۔" شمشیر علی نے اس کی بگڑتی حالت کے پیش نظر بمشکل خود پر ضبط کر کے دھیرج سے کہا۔
"کیوں خاموش ہو جاؤں؟ اب تو میں چیخوں گی، چلاؤں گی۔ جاؤ! جو کر سکتے ہو، کر لو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے پورا زور لگا کر چیخنا شروع کر دیا کہ اس کا چہرہ سرخ اور گردن کی نسیں پھول گئیں۔
شمشیر علی سچ مچ پریشان ہو گیا۔ اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ وہ باز نہیں آئی تو اس کا ضبط بھی جواب دے گیا۔ زوردار طمانچہ اس کے منہ پر دے مارا۔
اریبہ چکرا کر اسی کے بازوؤں میں جھول گئی۔
"نان سینس!" انتہائی غصے سے وہ اسے بیڈ پر دھکیل کر کمرے سے ہی نہیں، گھر سے بھی نکل آیا تھا۔ کیونکہ اب اسے خود پر قابو پانا ناممکن لگ رہا تھا۔ غصہ جذبات کو بھڑکا گیا تھا۔ گھر سے نہ نکلتا تو اس لڑکی کا زعم چھین کر وہ اسے زندگی بھر سسکنے کے لیے چھوڑ دیتا۔ اسی حالت میں وہ فضل کریم کے پاس آ بیٹھا۔
"کیوں باؤ! آج دفتر سے چھٹی مار لی؟" فضل کریم نے اس کی بے وقت آمد پر پوچھا۔ اس نے جواب نہیں دیا، تب فضل کریم غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔
"پریشان لگ رہا ہے۔ خیر تو ہے۔" وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔
"کیا ہوا؟ سیٹھ کو مار آیا ہے کیا؟" فضل کریم کو بس یہی دھڑکا لگا رہتا تھا۔
"نہیں یار!" اس کی جھنجلاہٹ میں غصہ تھا۔ "خود مر رہا ہوں۔"
"وہ تو تیری شکل دیکھ کر لگ رہا ہے، پر کیوں؟" فضل کریم نے سوال اٹھایا، پھر خود ہی کہنے لگا۔ "چھڈ یار! میں نے پہلے ہی کہا تھا، دل میں انتقام کی آگ نہ جلا، خود جل جائے گا۔"
"یہ انتقام کی آگ نہیں ہے فضل کریم! انگارے خود میری جھولی میں آن گرے ہیں۔ سارا بدن دہک رہا

ہے۔" اسے خود پتا نہیں تھا وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔

"لگتا ہے بخار تیرے دماغ پہ چڑھ گیا ہے۔ چل ڈاکٹر کو دکھا دے۔" فضل کریم نے اس کی کلائی تھام کر تپش کو بخار پر محمول کرتے ہوئے کہا اور اسے اٹھانے بھی لگا تھا تو وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"لاپروائی اچھی نہیں ہوتی شمشیر! دکھا دے ڈاکٹر کو۔" فضل کریم کہتا رہ گیا' لیکن وہ سن ہی کہاں رہا تھا۔ تیز قدموں سے گاڑی میں جا بیٹھا اور پوری رفتار سے گاڑی بھگا دی۔

پھر رات گئے تک وہ سڑکوں پر ہی بھٹکتا رہا تھا اور جب گھر آیا تو نہ صرف پر سکون بلکہ خود کو ملامت بھی کر رہا تھا کہ ناحق اس لڑکی پر ہاتھ اٹھایا جو پہلے ہی ڈپریشن کا شکار ہو کر بخار میں تپ رہی تھی اور جانے ہوش میں آچکی تھی یا ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔ یہی سب سوچتا وہ احتیاط سے دروازہ کھول کر اندر آیا تو اریبہ کو لاؤنج ہی میں تخت پر لیٹے ہوئے دیکھ کر اسے قدرے اطمینان ہوا۔ تب کھنکار کر اپنی آمد کی اطلاع دیتے ہوئے وہ سیدھا کچن میں آگیا اور ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگا تاکہ پتا چلے کہ اریبہ نے کچھ کھایا تھا یا نہیں۔ بسکٹ' کیک' ڈبل روٹی' انڈے سب جوں کے توں رکھے تھے۔ وہ خاصا بددل ہوا کہ اب کھانے کے لیے اس کی خوشامد کرنی پڑے گی جبکہ ابھی وہ اس سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے سنگین رویے کی معافی بھی اس نے اگلے دن پر اٹھا رکھی تھی۔ لیکن اب اسے کچھ کھلانا بھی ضروری تھا۔

وہ پھر خود پر جبر کرکے اریبہ کے پاس آیا تو وہ بالکل بے خبر پڑی تھی۔ ایسی بے خبری جس نے شمشیر علی کے ہوش اڑا دیے تھے۔

بالکل غیر ارادی طور پر وہ الٹے پاؤں دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتے ہوئے دیوار سے جا لگا اور ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کردی تو یکدم گھپ اندھیرا چھا گیا۔ کتنی دیر وہ ساکت کھڑا رہا' پھر بھی آنکھیں اندھیرے سے مانوس نہیں ہوئیں تو اس نے پھر لائٹ جلا دی۔

نظروں کے عین سامنے بے خبری کا عالم واضح ہوتے ہی وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ رات کے تیسرے پہر کی فسوں خیزی اس کے دل کے تاروں کو چھیڑنے لگی۔ وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھا اور تخت کے قریب رک کر اسے دیکھنے لگا۔

کوئی طویل مسافت اس نے طے نہیں کی تھی اور نہ ہی آگے میلوں کا سفر تھا پھر بھی اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ سانسوں نے ماحول کے ساتھ گٹھ جوڑ کرلی تھی۔

دن میں غصہ جذبات کو بھڑکا گیا تھا اور رات بہت پیار سے اکسا رہی تھی۔ اس کا دل چاہا' وہ اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر کمرے میں لے جائے۔

اور اپنی اس خواہش کو وہ دبا نہیں سکا۔ اسے اٹھانے کو جُھکا ہی تھا کہ اچانک اس کے اندر کوئی سِسکا تھا۔ وہ گھبرا کر فوراً سیدھا ہو گیا۔

"تاج۔۔۔!"

"نہیں۔۔۔" وہ خوف زدہ ہو کر تیزی سے پلٹا اور پھر کمرے میں بند ہو کر رونے لگا۔

وہ رو رہا تھا اور رات کی فسوں خیزی اداسی میں بدل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼
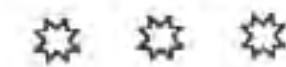
اریبہ نے آنکھیں کھولیں تو تخت پوش سے ذرا اوپر کھڑکی کے شیشوں پر صبح کا اجالا دستک دے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر ساکت پڑی رہی' پھر دقتوں سے اٹھ پائی' کیونکہ اس نے کل سارا دن کچھ نہیں کھایا تھا' اس لیے نقاہت بڑھ گئی تھی۔ سر الگ چکرا رہا تھا۔ رات وہ کچھ کھانے کے ارادے سے ہی کمرے سے نکلی تھی' لیکن کچن تک نہیں پہنچ سکی تھی اور وہیں تخت پوش پر ڈھے گئی تھی۔ ابھی بھی اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ بمشکل خود کو گھسیٹتے ہوئے پہلے کچن میں آئی۔ چولہے پر چائے کا پانی رکھا' پھر کیک پر نظر پڑی تو وہیں سنک پر ہاتھ منہ دھو کر کیک کھانے لگی جو بڑی مشکلوں سے حلق سے اتر رہا تھا۔ چائے بننے تک تھوڑا بہت اس کے پیٹ میں جا چکا تھا' پھر باقی اس نے چائے کے ساتھ آرام سے کھایا۔ اس کے بعد کمرے میں آئی تب اسے شمشیر علی کا خیال آیا۔ وہ کمرے میں موجود نہیں تھا۔ واش روم کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ وہ یہی سمجھی کہ رات وہ آیا ہی نہیں۔

"کہاں چلا گیا؟" وہ سوچتے ہی اچانک متوحش ہو گئی تھی کہ کہیں وہ اس زنداں کو اس کا مقدر کرکے روپوش تو نہیں ہو گیا۔

"نہیں! وہ ایسا نہیں کرسکتا۔" وہ خود کو بہلاتے ہوئے کمرے سے نکل کر پھر تخت پر آبیٹھی اور اس کا انتظار کرنے لگی۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے وقت کا اندازہ کرنے کے لیے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ شیشوں پر اب دھوپ چمک رہی تھی۔

"یا اللہ! میں کیا کروں۔" وہ رو دینے کو ہو گئی۔ انتہائی بے بسی کے عالم میں اب اسے اپنی غلطی کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔

"میں نے بھی تو حد کردی۔ اتنا ذلیل کیا اسے۔ جانے کیا کیا کہہ گئی۔۔۔ میں بھی کیا کرتی۔ اتنی ڈپریس جو ہو گئی تھی۔ آخر غبار کہیں تو نکلنا تھا۔" وہ خود کو اپنی صفائی بھی دے رہی تھی۔

"خیر آئے گا تو میں اس سے سوری کرلوں گی۔ اللہ کرے! آجائے۔" آخری الفاظ اس نے بلند آواز سے کہے تھے' پھر اٹھ کر اس بورڈ کے پاس آگئی جس پر وہ سارا وقت مصروف رہتا تھا۔ اس نے دیکھا' ایک لڑکی کا آدھا چہرہ بنا ہوا تھا۔

"پتا نہیں! وہ اپنی رادھا کی تصویر کبھی بنا پائے گا کہ نہیں۔" اس نے سوچتے ہوئے وہ کاغذ ہٹا کر دوسرا کاغذ چپکایا پھر اس پر لکھنے لگی۔

"آئی ایم سوری شام! کل میں اپنے آپ میں نہیں تھی۔ غصے میں جو الٹا سیدھا میرے منہ سے نکلا' اس کے لیے میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ تم واقعی شریف آدمی' بلکہ بہت اچھے انسان ہو۔ میں جب یہاں سے جاؤں گی تو۔۔۔"

اچانک دروازہ کھلنے کی آواز پر اس کا چلتا ہوا ہاتھ رک گیا اور دل یکبارگی کسی اتھاہ میں ڈوب کر ابھرا تھا' پھر وہ تیزی سے گھومی۔

شمشیر علی اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے کنکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"شام! کہاں چلے گئے تھے؟" اس کی پکار میں جانے واقعی ایسا کچھ تھا جیسے صدیوں سے بھٹکتے کسی مسافر کو اچانک منزل نظر آجائے یا شمشیر علی کو محسوس ہوا تھا۔

(باقی آئندہ ان شاءاللہ)

شازیہ جمال نیئر

"مژگان! اٹھ گئیں بیٹا؟"

دوپہر کے کھانے کے لیے سبزی بناتی اماں کے پوچھنے پر میں شرمندہ سی ہو گئی۔

"جی اماں! آپ نے مجھے اٹھایا کیوں نہیں؟ خوامخواہ اتنی دیر سوتی رہی۔" میں نے بمشکل جمائی روکی اور ٹی وی کھول کر چینل بدلنے لگی۔

"ناشتا کرو گی؟ ابھی صرف گیارہ بجے ہیں۔"

بھابھی نے مسکراہٹ دباتے ہوئے پوچھا اور جوس کا گلاس میری طرف بڑھا دیا۔

"اونہوں! میں اتنے لیٹ ناشتے میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتی اور آپ بھی پلیز وقت پر ناشتا کیا کریں۔"

میرے شرارت سے کہنے پر بھابھی مجھے گھور کر رہ گئیں اور اماں کے ساتھ سبزی بنانے لگیں۔

"خالہ! دادی کہہ رہی ہیں اگر آپ نے کلثوم آپا کے گھر قرآن خوانی میں جانا ہے تو انہیں بھی اپنے ساتھ لے کر جایئے گا۔"

ایک پیارا سا گول مٹول بچہ اماں سے مخاطب ہوا تو میں چونک کر ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھنے لگی۔

"نیلم! کھانا میں بنا لوں گی۔ تم کلثوم کے گھر قرآن خوانی میں چلی جاؤ۔ میرے بالوں پر تو مہندی لگی ہوئی ہے۔ اترنے میں کافی ٹائم لگ جائے گا۔" اماں نے بھابھی سے کہا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں بیٹا! دادی سے کہو میں انہیں لیتی جاؤں گی۔"

بھابھی کے ہاں کہنے پر وہ بچہ اچھلتا کودتا باہر نکل گیا۔

"اماں! یہ بچہ کس کا ہے؟" میری سوالیہ نظریں اماں کی طرف اٹھ گئیں۔

"احمد ہے ہاجرہ آپا کا پوتا۔ مصطفیٰ کی دوسری بیوی خدیجہ کا ہے۔ تمہیں بتایا تو تھا جب یہ پیدا ہوا تھا۔" اماں سبزی کی ٹوکری اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئیں۔

"اوہ!" مجھے بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼
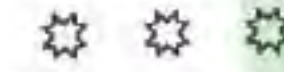
ہمارے گھر کے دائیں جانب سرمئی گیٹ اور سبز بیلوں سے ڈھکا ہوا خوب صورت سا گھر ہاجرہ آپا کا تھا جو برسوں سے اپنے بیٹے مصطفیٰ کے ساتھ اس گھر میں مقیم تھیں۔ ہاجرہ آپا نہایت اکھڑ مزاج اور تند خو تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ پورے محلے میں "بد مزاج آپا" کے نام سے مشہور تھیں۔ وہ خود بھی لوگوں سے زیادہ میل جول رکھنے کی روادار نہیں تھیں اور ان کی پیشانی پر ہمہ وقت پھیلا شکنوں کا جال اور لٹھ مار لہجہ دوسروں کو ۔۔۔ ان کے گھر غلطی سے بھی آنے سے روک دیتا تھا۔ البتہ ہماری اماں جان وہ واحد خوش نصیب ہستی تھیں جنہیں ہاجرہ آپا سے قریب ہونے کا شرف حاصل تھا اور اس میں بھی سارا ہاتھ ہماری اماں کی نرم خوئی اور حلیم الطبع مزاج کا تھا۔ ورنہ ہاجرہ آپا تو حسب عادت معمولی معمولی باتوں پر اماں کی ۔۔۔ تمام عنایتوں اور مہربانیوں کو پس پشت ڈال کر پتھر پھوڑنے لگتی تھیں۔

اماں چونکہ ان کی مزاج آشنا تھیں۔ اس لیے ان کی کڑوی کسیلی سن کر بھی برابر مسکرائے جاتیں اور "جی آپا بالکل" کی گردان کیے جاتیں۔

"بے چاری ہاجرہ آپا۔۔۔ حالات نے تلخ بنا دیا ہے۔ ورنہ دل کی بری نہیں ہیں۔ کم عمری میں بیوگی کا دکھ کیا کم تھا کہ سسرال والوں نے بھی کچھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ میکہ بے چاری کا تھا نہیں۔ لے دے کے بیٹا بچا ہے۔ اللہ اسے سلامت رکھے۔ بڑا کڑا وقت دیکھا ہے بے چاری نے۔" ہاجرہ آپا جب کسی خود ساختہ محاذ کے بعد گرج چمک کر اچھی طرح برس جاتیں تو اماں سادگی سے یہی پیراگراف دوہرا دیتیں۔

ہاجرہ آپا کی تمام تر بے رخیوں اور کج ادائیوں کے باوجود میں اپنا زیادہ تر وقت ان کے گھر گزارتی تھی۔ جس کی ایک وجہ تو ان کے آنگن میں لگا بڑا سا جامن کا درخت تھا، جس پر چڑھ کر جامن توڑ کر کھانا مجھے بے حد پسند تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑی وجہ مصطفیٰ بھائی تھے۔ ہاجرہ آپا کے اکلوتے بیٹے، لیکن ان سے بالکل مختلف۔ مصطفیٰ بھائی کی نرم خوئی، چہرے پر پھیلی مہربان مسکراہٹ اور نرم لہجہ دیکھ کر کوئی بھی یقین

نہیں کر سکتا تھا کہ وہ بد مزاج آپا کے بیٹے ہیں۔
میری ان کے ساتھ گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ مجھے میرے بھائی جان کی طرح چاہتے تھے بلکہ شاید ان سے بھی زیادہ کیونکہ بھائی جان تو نوکری کے سلسلے میں دوسرے شہر میں مقیم تھے۔
کبھی میرے لیے اچھی اچھی اسٹوری بکس لے کر آتے تو کبھی چاکلیٹ اور چپس وغیرہ کے ڈھیر اٹھا لاتے۔ شطرنج کے ماہر کھلاڑی ہونے کے باوجود اکثر مجھ سے ہار جاتے اور میرے ہاتھ کی بنی بد مزا چائے بھی مزے لے کر پیتے۔ ان کی یہی محبتیں مجھے اپنے گھر ذرا کم ہی ٹکنے دیتی تھیں اور میں اماں کی نظر بچا کر چلچلاتی دھوپ یا چھاجوں برستی بارش کی پروا کیے بغیر دیوار پر چڑھ کر ان کے گھر چھلانگ لگا دیتی۔
"اے بی! لڑکیوں کو یوں دیواروں پر چڑھنا اور کد کڑے لگاتے پھرنا زیب نہیں دیتا۔ تیری ماں نے تجھے ٹک کر بیٹھنا نہیں سکھایا۔ ویسے تو بڑی عالم فاضل بنی رہتی ہے۔"
آپا کی مجھے شرمندہ کرنے کی کوششیں کبھی بار آور ثابت نہ ہوتیں۔
"آپا! نہ جانے کیوں مجھے آپ کے گھر آ کر بڑا سکون ملتا ہے۔"
میرے لگاوٹ سے کہنے پر وہ ہونہہ کہہ کر کٹ کٹ کرتی اپنی مرغیوں کی طرف متوجہ ہو جاتیں۔
مصطفیٰ بھائی کی شادی پر میں نے بہت ہلا گلا کیا تھا۔ بلکہ بہنوں والی ساری رسمیں بھی میں نے پوری کی تھیں۔ اپنے بھائی جان کی شادی پر بھی میں اتنا انجوائے نہ کر پائی' جتنا مصطفیٰ بھائی کی شادی پر کیا۔ ہاجرہ آپا بھی بیٹے کی شادی کے موقع پر مجھ پر بڑی مہربان ہو رہی تھیں اور جب مصطفیٰ بھائی نے معظمہ بھابھی سے یہ کہہ کر میرا تعارف کروایا کہ "یہ میری بہت پیاری بہن ہے اور ہمارے گھر کی ساری رونق اسی کے دم سے ہے" تو مجھے خوشی سے رونا آگیا تھا۔ کچھ ناتے ایسے بھی ہوتے ہیں' جن کے سامنے خون کے رشتے بھی کمزور پڑ جاتے ہیں۔

قدرے سنجیدہ اور باوقار سی سلجھی ہوئی معظمہ بھابھی مجھے بہت ہی اچھی لگیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں میری ان سے خوب دوستی ہو گئی۔
ہاجرہ آپا پھر سے اپنی روش پر آگئیں۔ اب ان کی توپوں کے دہانے معظمہ بھابھی کی طرف مڑ گئے تھے۔ بہت کم عرصہ میں انہیں معظمہ بھابھی میں ہزاروں خامیاں نظر آگئیں۔ مزید کسر ان کی سونی گود نے پوری کر دی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے بھابھی کو اس کمی کا احساس دلاتی رہتیں۔
مصطفیٰ بھائی کی دلجوئی کے باوجود معظمہ بھابھی اب اس بلاوجہ کی ڈانٹ پھٹکار سے تھکنے لگیں اور جب ہاجرہ آپا کی تلخی عروج پر پہنچ گئی اور مصطفیٰ بھائی کے ہاتھ سے معاملہ تھمی اور صبر و ضبط کا دامن چھوٹنے لگا تو معظمہ بھابھی نے انہیں دوسری شادی کرنے کی اجازت دے دی۔ ہاجرہ آپا تو پہلے ہی اس قسم کا ارادہ باندھے بیٹھی تھیں' "فوراً" چوکس ہو گئیں۔ مصطفیٰ بھائی کا کمزور احتجاج ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ معظمہ بھابھی کے گھر والوں کو جب صورت حال کا پتا چلا تو وہ انہیں زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔ انہیں اپنی بیٹی کی ناقدری گوارا نہیں تھی۔
مصطفیٰ بھائی باعث شرمندگی اور ہاجرہ آپا بوجہ ہٹ دھرمی انہیں نہ روک سکیں۔
معظمہ بھابھی کے چلے جانے کے بعد اس گھر سے میرا دل اچاٹ ہو گیا۔ مصطفیٰ بھائی کی گمبھیر چپ' ہاجرہ آپا کی پرجوش سرگرمیوں اور جامن کے درخت سے نظریں چرا کر میں مزید تعلیم کے لیے ماموں کے گھر لاہور چلی آئی۔

☆ ☆ ☆

"نفیسہ آپا کا فون آیا تھا' کہہ رہی تھیں کہ احمر کی چھٹی منظور ہو گئی ہے۔ مل بیٹھ کر شادی کی کوئی قریبی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔ میں نے کہا' آپ لوگ شام کو کھانے پر آجائیں' پھر بات کرتے ہیں۔ ویسے بھی ہماری تیاری تو تقریباً" مکمل ہے۔"

اماں پھپھو کا فون سن کر آئیں تو صوفے پر بیٹھتے ہوئے تفصیل سے آگاہ کیا۔
"اچھا کیا آپ نے انہیں کھانے پر انوائٹ کرلیا۔ اب تو موسم بھی اچھا خاصا خوش گوار ہو رہا ہے۔" بھابھی دھلے ہوئے کپڑوں کی تہہ لگاتے ہوئے بولیں۔
"بلال! تمہارا کیا خیال ہے بیٹا!"
بھائی جان ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ سیدھے ہو کر بولے۔
"جی اماں! جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ ویسے بھی مژگان اب پڑھائی سے فارغ ہو گئی ہے۔ تو نیک کام میں دیر کیسی؟"
میں محراب کو کھچڑی کھلا رہی تھی۔ ٹشو سے اس کا منہ صاف کیا اور اسے اٹھائے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ میں جانتی تھی کہ اب یہ تینوں دیر تک اسی معاملے کو ڈسکس کرتے رہیں گے۔
میری بات بچپن ہی سے چھوٹی پھپھو کے بیٹے احمر سے طے تھی۔ پھپھو جلد از جلد شادی کی خواہاں تھیں۔ پہلے میری پڑھائی آڑے آتی رہی، پھر دوسرا مسئلہ احمر کو چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ ان کی شارجہ میں جاب تھی۔ محراب کو لوری سناتے سناتے میں خود بھی نیند کی وادی میں اتر گئی۔
خاصی دیر بعد آنکھ کھلی تو منہ پر پانی کے چھپاکے مار کر باہر نکل آئی۔ بھابھی، نسرین (ملازمہ) کے ساتھ کچن میں بری طرح مصروف تھیں۔ میں شرمندہ ہو گئی کہ کچن کے کام میں ان کا کچھ ہاتھ ہی بٹا دیتی۔
"لائیں بھابھی! میں کچھ ہیلپ کرادوں۔"
"ارے نہیں! بس سب کچھ تقریباً" مکمل ہو گیا ہے۔ تم نے محراب کو سنبھال لیا، یہی بہت ہے۔ ورنہ اس نے تو مجھے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرنے دینا تھا۔"
بھابھی نے مسکرا کر کہا اور میں جانتی تھی کہ ایسا انہوں نے میرے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات کو ختم کرنے کے لیے کہا ہے کیونکہ وہ واقعی اتنی ہی اچھی تھیں۔
"احمر کو چھٹی کتنے عرصے کی ملی ہے؟" بھابھی نے سلاد کے لیے سبزیاں کاٹتے ہوئے مجھے چھیڑا۔
"یہ آپ زیادہ بہتر جانتی ہیں۔ آپ کو پتا ہے، میری بات چیت نہیں ہوتی۔"
"کم چھٹیاں ملی ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے، وہ بڑھوا لے گا۔" بھابھی نے ایک بار پھر مجھے چھیڑنے کی کوشش کی اور میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ بھی میری ہنسی میں شامل ہو گئیں۔
رات کو اماں نے خالہ اور لیلیٰ کو بھی بلوالیا تھا۔ لیلیٰ میری اکلوتی دوست تھی۔ پھپھو قریبی تاریخ رکھنے پر اصرار کر رہی تھیں۔ سب کے باہمی مشورے پر اگلے ماہ کی بیس تاریخ طے کردی گئی۔ پھپھا بہت خوش مزاج انسان تھے۔ بات بعد میں کرتے اور قہقہہ پہلے لگاتے تھے۔ پھپھو ان کے طویل دورانیے کے قہقہوں سے سخت عاجز تھیں۔ میں نے اور لیلیٰ نے مل کر ٹیبل پر کھانا لگا دیا۔
"مژگان بیٹا! اپنی چوڑی اور جوتے وغیرہ کا ناپ ابھی سے مجھے دے دو۔ پھر بار بار مجھ سے چکر نہیں لگائے جائیں گے۔" پھپھو نے سب کے سامنے کہا تو میں بری طرح جھینپ گئی۔ یوں لگتا تھا کہ گویا وہ ابھی گھر جا کر شادی کی تیاریاں شروع کردیں گی۔
رات گئے سب کی واپسی ہوئی۔ میں نے لیلیٰ کو اپنے ہاں ٹھہرا لیا۔

☼ ☼ ☼

"مژگان! کیا کر رہی ہو بیٹا؟" میں اپنی وارڈروب صحیح کر رہی تھی، جب اماں کمرے میں چلی آئیں۔
"جی اماں! کوئی کام ہے کیا؟" میں نے الماری کا پٹ بند کرتے ہوئے مڑ کر ان سے پوچھا۔
"بیٹا! جانتی تو ہو کہ شادی میں کتنا کم وقت رہ گیا ہے۔ ایسا کرو آج نیلم کے ساتھ بازار کا چکر لگا آؤ، دو چار اپنی پسند کی اچھی سی سینڈلز لے لو۔ ٹیلر کے پاس کچھ سوٹ دیے تھے کام کروانے کے لیے، ان کا بھی پتا کرنا ہے۔ میں کچھ دن ٹھہر کر بلال کے ساتھ جیولر کے

ہاں زیور اٹھانے چلی جاؤں گی۔ چھوٹے موٹے کام تو تم خود ہی نپٹا دو۔ نیلم بے چاری اکیلی ہلکان ہوتی رہتی ہے۔" اماں بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اماں بھی سر ہلاتے ہوئے اٹھنے لگیں۔
"اماں! بات سنیں۔" میں نے اچانک اماں کو جلدی سے پکارا۔ وہ رک کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگیں۔
"اماں! میرا معظمہ بھابھی سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔ بہت عرصہ ہو گیا ہے انہیں دیکھے ہوئے۔ پتا نہیں پھر کبھی مل بھی سکوں گی یا نہیں۔ آج میں ان کے گھر چلی جاؤں؟"
"ہاں اچھا ہے، ہو آؤ۔ بے چاری مفت کی سزا کاٹ رہی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"معظمہ بھابھی!"
گلاب کے پودوں کو پانی سے نہلاتی وہ یقیناً" معظمہ بھابھی ہی تھیں۔ میں نے انہیں عقب سے آہستگی سے پکارا۔
"ارے مژگان تم... تم کب آئیں، کیسی ہو؟ لاہور سے کب واپسی ہوئی؟" بھابھی نے محبت سے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔
"میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیے۔" میں نے ان کی ہمراہی میں قدم آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
کاٹن کے سادہ سوٹ میں بالوں کی سادہ سی چوٹی بنائے وہ مجھے پہلے سے کچھ کمزور سی لگیں۔ چہرے کی شہابی رنگت ماند پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے پڑے حلقے ان کی بے خوابی کی چغلی کھا رہے تھے۔
"روز تمہیں یاد کرتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور مجھ سے ملنے آؤ گی۔"
شدتوں کے موسم میں بھیگنے کے بعد یا تو انسان کے مزاج میں خزاں کی زرد بے رنگی چھا جاتی ہے یا تلخیوں کی سیاہی مزاج کو وحشت زدہ کر دیتی ہے۔ لیکن میں جان گئی تھی کہ شدتوں کے موسم نے معظمہ بھابھی کی خوش اخلاقی اور دھیمے پن کا کچھ نہیں بگاڑا۔
مصطفیٰ بھائی کی دوسری شادی سے پہلے معظمہ بھابھی کے بھائی انہیں اپنے ساتھ لے آئے۔ اب شادی کے بعد وہ اپنے گھر واپس جانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ ان کے والد چونکہ حیات نہیں تھے۔ والدہ ضعیف تھیں اور گھر کے کرتا دھرتا دونوں بڑے بھائی تھے، سو انہوں نے سختی سے فیصلہ صادر کیا کہ جب تک آپا اور مصطفیٰ بھائی خود لینے نہ آئیں، تب تک اس گھر میں قدم نہیں رکھو گی۔ بصورت دیگر میکے کا رستہ ہمیشہ کے لیے بھولنا پڑے گا۔
ادھر ہاجرہ آپا کون سا کم تھیں۔ بقول ان کے خود ہی لے کر گئے تھے اور خود ہی چھوڑ کر بھی جائیں گے۔
بے جا ضد، ہٹ دھری اور جھوٹی انا کے پرچم بلند کرکے انہوں نے کسی کی زندگی کے بہترین سال نگل لیے۔ میں نے بہت دکھ سے انہیں دیکھا۔
"بھابھی! آپ کو اپنے حق کے لیے لڑنا چاہیے تھا۔ اپنی زندگی کی ڈور کسی دوسرے کے ہاتھ میں کیوں تھما دی۔ جس صبر میں جبر ہو، اس کا تو اجر بھی نہیں ملتا۔" میں نے محبت سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔
"جانتی ہو مژگان! جب ایک عورت شادی کے بعد اپنی گڑیاں، اپنی بچپن کی سہیلیاں، اپنی گلیاں، اپنی پیاری ہستیاں اور اپنے ادھورے خواب چھوڑ کر اگلے گھر جاتی ہے تو اس کے لاشعور میں کہیں یہ بات چھپی ہوتی کہ یہاں آکر اسے ان گنت مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اتنے مسائل کہ جن کا شمار انگلیوں پر ممکن نہیں، لیکن صرف ایک بات، ایک سوچ اسے ان تمام مسائل کا بہادری اور خوش دلی سے مقابلہ کرنے پر آمادہ کرلیتی ہے کہ اس کا مجازی خدا اس کا ساتھ دے گا۔ اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا لیکن مصطفیٰ نے میری اسی ایک سوچ، ایک امید کا چراغ بجھا دیا، جس کی روشنی میں وہ سارے مسائل میں حل کرلیتی، برداشت کرلیتی۔ انہوں نے میرا ساتھ نہیں دیا، مجھے تنہا چھوڑ دیا۔"

انسان خود کو جتنا بھی مضبوط ظاہر کرلے، سب کے سامنے نہ سہی اکیلے میں ضرور ٹوٹ جاتا ہے۔ بھابھی کے آنسو میرے دل پر گر رہے تھے۔ میں بوجھل قدموں وہاں سے لوٹ آئی۔

☼ ☼ ☼

گھر میں شادی کے روایتی ہنگامے جاگ اٹھے۔ باہر کے سارے کام بھائی جان نے سنبھال لیے تھے۔ وہ بیک وقت میرے باپ اور بھائی بن گئے تھے۔ جوں جوں دن قریب آرہے تھے، اماں اور بھابھی کے ہاتھ پاؤں پھولتے جارہے تھے لیکن میرے دل پر کوئی بوجھ دھرا تھا۔ کسی پل چین نہیں مل رہا تھا۔ بار بار آنکھوں کے سامنے معظمہ بھابی کی روتی صورت ابھر آتی۔

کل میری مایوں تھی۔ میں چپکے سے باہر نکل آئی۔ ہاجرہ آپا کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور میں اتنے عرصے بعد پہلی بار ان کے گھر دروازے سے داخل ہورہی تھی۔ سارے گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ ایک کمرے سے ٹی وی چلنے کی مدھم آواز آرہی تھی۔ میں اسی طرف بڑھ گئی ہاجرہ آپا بیڈ پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔

"السلام علیکم آپا!" میں نے آہستگی سے انہیں سلام کیا۔

"ارے مژگان تم! ختم ہوگئی تمہاری پڑھائی...؟ بہت عرصہ بعد شکل دکھائی ہے۔" انہوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنی مخصوص پاٹ دار آواز میں کہا۔

"باقی سب کہاں ہیں؟"

"احمد کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ مصطفیٰ اور خدیجہ اسے ڈاکٹر کے ہاں لے گئے ہیں۔" انہوں نے بے زار لہجے میں کہا تو میں ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"حق ہا! انسان ہی انسان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ اللہ پوچھے گا ان ظالموں کو۔"

ٹی وی پر کراچی میں ہونے والی ٹارگٹ کلنگ کے لرزہ خیز مناظر دکھائے جارہے تھے۔ میری پرسوچ نظریں آپا کی طرف اٹھ گئیں۔ کسی کی غلطی پر ہمارے اندر احتجاج ضرور بلند ہونا چاہیے، مگر غلطی کرنے والے سے اس کے رویے کی مذمت کرتے وقت اس کے درجے کا لحاظ رکھنا چاہیے ورنہ ہم خود اپنے مقام سے گر جائیں گے۔

"آپا! ظالم کسے کہتے ہیں؟"

"ظلم کرنے والے کو۔ اتنا بھی نہیں جانتی ہو؟" انہوں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"اور ظلم کسے کہتے ہیں؟" میری سنجیدگی میں سرمو کوئی فرق نہ آیا۔

"کسی کو اس کے گھر سے بے گھر کرنا، اس کے جائز حق سے محروم کرنا اور ناکردہ گناہوں کی سزا دینا۔" انہوں نے مجھے فخر سے بتایا۔

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے لیکن یہ ظلم تو آپ بھی کررہی ہیں۔" میں نے سکون سے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"آپ نے بھی تو کسی کو اس کے گھر سے بے گھر کیا ہے۔ اس کے جائز حق سے محروم کیا ہے اور ناکردہ گناہ کی سزا دی ہے۔" میں نے ان کی بات انہیں ہی لوٹا دی۔

"کس کی بات کررہی ہو؟" اب کی بار وہ ٹھٹک گئیں۔

"معظمہ بھابھی کی۔" میں نے ان کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

"یہ سب اس کے بھائیوں کا کیا دھرا ہے۔ خوامخواہ کی ضد میں بہن کو اپنے گھر بٹھالیا۔ واپس چھوڑ جاتے جیسے لے گئے تھے۔" انہوں نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

"انہوں نے غلط کیا، بہت برا کیا۔ آپ اعلا ظرفی کا ثبوت دیں۔ اگر چھوٹے بے وقوفی کریں تو بڑوں کو بڑاپن دکھانا چاہیے۔ آپ کو تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا کہ مصطفیٰ بھائی صاحب اولاد ہوگئے۔ اگر خدیجہ بھابھی بھی بے اولاد ہوتیں تو کیا آپ مصطفیٰ بھائی کی تیسری اور پھر چوتھی شادی کروا دیتیں...؟ اسلام نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت صرف اسی شرط پر دی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کرے۔ عدل وانصاف کا دامن نہ چھوڑے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم یہ کبھی نہ فرماتے کہ "اگر کسی آدمی کی ایک سے زائد بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان عدل نہ کرے بلکہ ایک کی طرف جھک جائے تو قیامت کے روز اس طرح آئے گا کہ اس کا ایک کندھا جھکا ہوا ہوگا۔"

اس کے لہجے میں نمی گھل گئی تھی۔

"معظمہ بھابھی بے اولاد ضرور ہیں لیکن وہ قصور وار ہرگز نہیں ہیں۔ وہ ہر صبح اس امید پر آنکھیں کھولتی ہیں کہ آپ انہیں لینے آئیں گی لیکن ہر ڈوبتا سورج ان کی امید کا چراغ بجھا دیتا ہے۔ آپا مظلوم کی آنکھ سے گرنے والا ہر آنسو بذات خود ایک بددعا ہوتا ہے، چاہے مظلوم اپنی زبان سے کچھ بھی نہ کہے۔

آپا! ہم انسان ہیں، ہمیں اپنی اوقات میں رہنا چاہیے۔ کسی کو سزا یا جزا دینے والے بھلا ہم کون ہوتے ہیں۔ یہ جس کا کام ہے اسی پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟"

اتنا کہہ کر میں باہر نکل آئی لیکن ان پر سوچوں کے نئے در وا کرکے دروازے کی دہلیز پر ساکت کھڑے مصطفیٰ بھائی اور خدیجہ بھابھی کو دیکھ کر میں لمحہ بھر کو ٹھٹکی، پھر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ذرا ڈھولکی بجاؤ گوریو!

میرے سنگ سنگ گاؤ گوریو!

لیلیٰ نے ڈھولکی سنبھالی ہوئی تھی۔ باقی سب گلا پھاڑ کر اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔

سارے کمرے میں مہندی اور ابٹن کی ملی جلی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور اب تو مخالف پارٹی بھی میدان میں اتر آئی تھی۔ بھابھی نے ڈھیروں کانچ کی چوڑیاں میری کلائیوں میں پہنادیں۔

"مژگان! جانتی ہو، ہاجرہ آپا اپنی بہو معظمہ کو واپس لے آئی ہیں۔"

میں بے یقینی سے بھابھی کو دیکھنے لگی۔ پھر پیلا گوٹا کناری والا دوپٹا اچھی طرح اوڑھ کر باہر نکل آئی۔ بھائی جان کرسیاں سیٹ کررہے تھے مگر مجھے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ دیوار کے ساتھ اسٹول پر قدم رکھتے ہوئے میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

ہاجرہ آپا اپنے مخصوص تخت پر شاداں و فرحاں بیٹھی تھیں۔ مصطفیٰ بھائی ان کی کسی بات پر زور سے ہنس رہے تھے۔ خدیجہ بھابھی انہیں چائے دے رہی تھیں اور معظمہ بھابھی... میرا دل بند ہونے لگا۔

اتنے میں معظمہ بھابھی احمد کو اٹھائے ہنستی کھلکھلاتی کمرے سے باہر آتی دکھائی دیں۔ احمد نے اپنی دونوں بانہیں ان کے گلے میں ڈالی ہوئی تھیں۔ یہ منظر اتنا مکمل اور خوب صورت تھا۔ میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ تب ہی ہاجرہ آپا کی نظر مجھ پر پڑی۔

"ارے لڑکی! دھیان سے۔ اب تو تیری شادی ہورہی ہے، کہیں ٹانگ وانگ ٹوٹ گئی تو سب کہیں گے دلہن لنگڑی ہے۔"

ان کے لہجے کی کھنک اور ممنونیت مجھے سب کچھ بتانے کے لیے کافی تھی۔ مصطفیٰ بھائی نے دور سے ہاتھ ہلایا تو میں بھیگی پلکوں سے مسکرادی۔

جن سے دل کا رشتہ، اپنائیت کا رشتہ جڑا ہو، انہیں خوش و مطمئن دیکھ کر کتنی آسودگی ملتی ہے، یہ اس وقت کوئی مجھ سے پوچھتا۔

"غضب خدا کا، یہ مایوں کی دلہن دیوار پر لٹکی ہوئی ہے۔"

لیلیٰ جارحانہ تیور لیے میری طرف بڑھی تو میں تیزی سے اسٹول سے نیچے اتر آئی۔

اندھیری رات چاہے کتنی ہی کالی اور طویل کیوں نہ ہو لیکن اس کے آخری کنارے پر ایک سورج ضرور طلوع ہوتا ہے، جس کی نرم چمکیلی کرنیں آہستہ آہستہ تاریکی کا سینہ چیر دیتی ہیں۔

☼

حمیرا علی

بے حد حسین جھرنا تھا' ہر جانب موسیقی بکھیرتا ہوا۔ ہوا اس کے بالوں اور آنچل کے ساتھ اٹھکھیلیاں کررہی تھی۔ بادلوں سے برستی بوندیں اس کی مانگ میں افشاں کی طرح بھرنے لگی تھیں۔ درختوں کی شاخوں پر براجمان رنگ برنگے مختلف بولیاں بولنے والے پرندے جیسے اس کی خوشی میں خوش' خوب صورت گیت گارہے تھے۔ بے حد معطر فضا سانسوں کو مہکا رہی تھی۔ ایک طلسم چہار سو چھایا ہوا تھا۔ اور وہ ہر فکر سے آزاد اس طلسم کدے میں ادھر سے ادھر شوخ تتلی کی مانند اڑتی پھر رہی تھی۔

لیکن وہ تنہا نہیں تھی' وہ بھی وہاں اس کے ہمراہ موجود تھا' جس کی موجودگی سے فضاؤں میں نغمگی تھی' جس کی موجودگی سے یہ رنگ و نور ہر سو چھا گئے تھے' جس کی موجودگی سے وہ خوش تھی اور جس کی ہمراہی کا احساس اسے ہوا کے دوش پر اڑا رہا تھا اور... اچانک ہی ایک درد کا احساس جاگا' اور اس کی

ناولٹ

آنکھ کھل گئی۔

شاید وہ پڑھتے پڑھتے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ہی سوگئی تھی اور بے آرامی کی وجہ سے گردن سے لے کر کمر تک ایک درد کی ہلکی سی لہر نے اسے گہری نیند سے جگا دیا تھا۔

آج پھر اس نے ویسا ہی خواب دیکھا تھا' جیسے وہ پچھلے چند سالوں سے دیکھتی آرہی تھی' چند لمحے توقف کے بعد وہ سیدھی ہو بیٹھی' پھر دونوں ہاتھ چہرے پر پھیر کر اس نے شاید اپنے حواسوں کو پوری طرح بیدار کرنے کی کوشش کی تھی۔

وہ خواب بے حد حسین تھا' نہ ڈراؤنا اور نہ ہی پریشان کن' مگر وہ پھر بھی الجھی ہوئی تھی۔ وہ کبھی ان

خوابوں کے بارے میں سوچتی نہیں تھی، مگر جب جب اسے ایسا کوئی خواب آتا' اس کی نیند نہ صرف ٹوٹ جاتی تھی، بلکہ دوبارہ ہزار منتوں کے بعد بھی نیند اس پر مہربان نہیں ہوتی تھی اور باقی رات بس آنکھوں میں ہی کٹ جاتی تھی۔

کئی سالوں سے آنے والے یہ خواب اسے بے بنیاد ہی لگتے تھے۔ ان خوابوں میں صورت حال اگرچہ مختلف ہوتی تھی، مگر اس کے اپنے محسوسات ایک ہی طرح کے ہوتے تھے۔ مختلف جگہیں اور مختلف لوگ بھی ہوتے مگر صرف ایک چہرہ مخصوص ہوتا تھا اور وہ چہرہ.....

اس کے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔ اس نے جگ کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر وہ بھی خالی تھا۔ لاچار اسے بیڈ سے اترنا پڑا۔ پاؤں میں سلیپر ڈال کر وہ کچن میں آئی اور ابھی فریج سے بوتل نکال کر گلاس بھر ہی رہی تھی' جب ثامن کی آمد ہوئی۔

اس کی نگاہ بے اختیار کچن میں آویزاں گھڑی پر گئی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں بتا رہی تھیں کہ سوا دو بج چکے ہیں اور وہ اس وقت گھر آیا تھا۔ خیر' یہ بھی غنیمت تھا۔

"شکر ہے تم جاگ رہی ہو' ورنہ مجھے کھانا نکالنا پڑتا اور اگر کھانا گرم نہ ہو تو مجھ سے کھایا نہیں جاتا' اور تمہیں تو پتا ہے کھانا نکالنا اور گرم کرنا دونوں ہی مجھے بہت دشوار لگتے ہیں.... اور پھر ساتھ ہی زبردست سی کافی کا بھی موڈ ہو رہا تھا۔"

وہ اپنے مخصوص انداز میں روانی سے بول رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلتی بے زاری ایک بار بھی اس کی نگاہوں نے محسوس نہیں کی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد وہ کافی ضرور پیتا تھا' چاہے کتنا ہی وقت کیوں نہ ہو رہا ہو۔ اسے کافی بنانے سے اب چڑ سی ہونے لگی تھی۔

"میں چینج کر کے آتا ہوں' تم اتنی دیر میں کھانا گرم کر لو۔" وہ کہہ کر جا چکا تھا۔

"ہونہہ! کسی ریاست کا شہزادہ ہے' جو اس کے حکم کی تعمیل کروں' وہ بھی اس وقت۔"

اس کا پارہ ہائی ہوا تھا۔ اسے اکثر ہی اس وقت اس کے حکم کی تعمیل کرنی پڑتی تھی کیونکہ اس کے حکم کی تعمیل کا حکم امی نے جو دیا ہوا تھا' مگر اس وقت اس کا موڈ صرف اس لیے آف ہوا تھا کہ صبح اس کا پیپر تھا مگر.....

اس نے کھانا گرم کر کے ٹیبل پر لگا دیا' پھر ثامن کے کھانا کھانے کے دوران اس نے کافی بھی بنا دی۔

"دل عبادت کر رہا ہے' دھڑکنیں میری سن....."

اس نے کافی کا مگ ثامن کے سامنے رکھا تھا' جب اس کا موبائل گنگنایا۔ اس کے موبائل کی مخصوص رنگ ٹون کے بجائے یہ گانا سن کر وہ ہرگز چونکی نہیں تھی۔ کچھ دنوں سے وہ نوٹ کر رہی تھی کہ صرف ایک خاص نمبر تھا جس پر ثامن نے موبائل ٹون کے بجائے یہ گانا سیٹ کیا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ سے مگ تھامتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے کال ریسیو کی۔

"ہاں ماہم! میں پہنچ گیا ہوں گھر.... یار پلیز! اتنا پریشان نہ ہوا کرو میرے لیے۔" وہ کافی کا مگ اٹھا کر کچن سے باہر نکل گیا' اور وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

شکریہ کا ایک لفظ کہنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اس نے اور یہ ماہم سارا وقت یقیناً" اس کے ساتھ ہی ہوگی اس کے گھر آتے ہی پھر اس سے موبائل پہ چپک گئی.....

وہ جلبلا کر سوچ رہی تھی۔ وہ اس کے جھوٹے برتن دھو کر رکھنے کے بعد کمرے میں آئی تھی۔ بیڈ پر بیٹھ کر کتاب کھولی' مگر صفحات کو گھور گھور کر دیکھنے کے بعد بھی ایک لفظ پلے نہیں پڑا تھا۔

"لعنت بھیجتی ہوں میں اس پر اور ماہم پر....."

آخر میں اس نے جھنجلا کر سوچا اور اپنی پوری توجہ کتاب کی جانب مرکوز کر دی۔

☼ ☼ ☼

"یامنہ! رات کو بھائی کب آیا تھا؟"

وہ اورنج جوس کا گلاس جلدی جلدی ختم کرنے میں لگی ہوئی تھی اور اسی جلدی کی وجہ سے گلے میں بری طرح پھندا لگا تھا۔

"اللہ خیر! کبھی اطمینان سے بھی کھا لیا کرو' ہمیشہ جلدی میں رہتی ہو' مجال ہے' کبھی ڈھنگ سے کوئی کام کیا ہو۔" اس کی کمر سہلانے کے ساتھ امی نے اسے بری طرح گھرکا تھا۔

"رات کو شاید بارہ بجے کے قریب آیا تھا۔"

وہ پتا نہیں کب آگیا تھا۔ بائیں جانب پاپا کے برابر کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے اس نے ہمیشہ کی طرح غلط بیانی سے کام لیا تھا' مگر پاپا جیسے اس کے جواب سے مطمئن ہو گئے تھے' تب ہی دوبارہ اخبار کی جانب متوجہ ہو گئے۔

وہ کھول کر رہ گئی تھی۔ گلے میں لگنے والے پھندے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی بھر گیا تھا۔

"کھانا کھایا تھا یا ایسے ہی سو گئے تھے؟ کتنی بار کہا ہے' مجھے یا پھر یامنہ کو اٹھا دیا کرو' خود کھانا نکالنے میں تو تم سستی کرتے ہو اور پھر یونہی بھوکے سو جاتے ہو۔"

امی کی فکرمندی یامنہ کو ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے' امان کہاں ہے۔ اسے پتا بھی ہے آج میرا پیپر ہے۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی تھی۔

"وہ تو چلا بھی گیا' اسے کسی سے نوٹس لینے تھے۔ تم تو خیر روز ہی دیر سے تیار ہو کر نیچے آتی ہو۔ آج پیپر ہے تو اتنی جلدی کر رہی ہو' ورنہ روزانہ تمہیں جگانے کے لیے عائلہ کو کتنے ہی چکر اوپر کے لگانے پڑتے ہیں۔ تم سے صرف ایک سال بڑی ہے وہ مگر ہمیشہ سے سحر خیز ہے۔ یونیورسٹی جاتے ہوئے بھی کئی کام نبٹا کر جایا کرتی تھی اور رات دیر تک جاگ کر پڑھائی بھی کیا کرتی تھی۔ رزلٹ بھی عائلہ کا تم سے اچھا ہوتا تھا' خیر! رزلٹ تو اس گھر میں سب کا ہی تم سے اچھا رہا ہے۔ نہ پڑھائی' نہ ہی گھر کے کام... کسی چیز میں تمہیں دلچسپی نہیں ہے۔"

صبح صبح امی نے بلاوجہ ہی اس کی کلاس لینا شروع کر دی تھی۔ اب وہ کیا کہتی' رات کو تو اسے ویسے ہی دیر سے نیند آتی تھی اور پھر آنکھ کھل جاتی تو نیند دوبارہ آتی ہی نہیں تھی۔ پھر اگر کبھی فجر کی نماز پڑھنے کے بعد آنکھ لگ جاتی تو یونیورسٹی کے لیے ٹائم پر اٹھ نہیں پاتی تھی، مگر وہ یہ سب امی کو نہیں بتا سکتی تھی' سو چپ چاپ سنتی رہی۔

"چھوڑیں امی۔ اس کا پیپر ہے اور پھر رات کو اس نے ہی مجھے کھانا نکال کر دیا تھا اور کافی بھی بنائی تھی میرے لیے۔"

ثامن نے ہمیشہ کی طرح امی کی ڈانٹ سے اس کی خلاصی کروائی مگر ثامن کی یہ ہمدردی اسے زہر لگی تھی۔

"پاپا! آپ چھوڑ دیں مجھے یونیورسٹی۔" وہ بمشکل بولی تھی۔ اسے دیر ہو رہی تھی اور کسی کو احساس تک نہیں تھا۔

"بیٹا! مجھے آفس پہنچنا ہے' ایک ارجنٹ میٹنگ ہے' آپ ایسا کریں ثامن کے ساتھ چلی جائیں۔" پاپا نے اخبار لپیٹ کر رکھتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔ "ارے ہاں ثامن بیٹا! آج آپ کی صارم اینڈ گروپ کے ساتھ میٹنگ ہے' یاد ہے نا۔"

"جی پاپا! آپ بے فکر رہیں' میٹنگ کا رزلٹ وہ ہی ہوگا' جو آپ چاہتے ہیں۔" وہ اپنے ازلی پُراعتماد انداز میں گویا ہوا تھا۔

"ثامن چندا! ناشتا تو ٹھیک سے کر لو۔" وہ جو ثامن کے انتظار میں کھڑی تھی۔ امی کے ثامن کو ٹوکنے پر ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔ اس کی کسی کو فکر نہیں تھی۔ اس گھر میں وہ ہی ایک غیر ضروری تھی اور فارغ بھی۔ باقی تو سب ہی مصروف اور اہم تھے۔

"نہیں امی! میں بھی لیٹ ہو رہا ہوں' اور ابھی مجھے یامنہ کو بھی ڈراپ کرنا ہے۔"

وہ جیسے اس پر احسان عظیم کر رہا تھا۔ تمام راستہ وہ

خاموش رہی تھی۔ ثامن خاصی تیز ڈرائیونگ کرتا ہوا اسے لایا تھا' اور پھر اس کے اترتے ہی گاڑی بھگا لے گیا تھا۔ اسے شدید ہتک کا احساس ہوا تھا' مگر وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی سوائے اپنا خون جلانے کے۔

"یامنہ! تم آج اپنے بھائی کے ساتھ آئی تھیں ناں؟ یار! کب سے کہہ رہی ہوں' میری اس سے ایک ملاقات کرادو۔ کتنا شوق ہے مجھے اس سے ملنے کا۔ کم از کم ایک فوٹو ہی اس کے ساتھ کھنچوالوں گی اور پھر سب کو جلاؤں گی۔ پتا ہے' میری کزنز تو اس کی دیوانی ہیں۔۔۔ اور جب میں نے بتایا کہ ثامن تجمل میری فرینڈ کا بھائی ہے تو کسی کو یقین ہی نہیں آیا تھا بھئی۔"

اس کی کلاس فیلو شازیہ وہ ہی پرانا راگ الاپ رہی تھی۔ اس نے بمشکل اسے ٹالا۔ شازیہ نے یامنہ سے دوستی ہی اس وجہ سے کی تھی کہ وہ ثامن تجمل کی بہن ہے' اور پھر ایک شازیہ ہی کیا' یونیورسٹی میں جس کو بھی پتا چلتا کہ وہ ثامن تجمل کی بہن ہے' وہ اس کے پاس آکر ثامن کی شان میں قصیدے پڑھنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ لڑکیاں تو اس کی دیوانی تھیں۔ اس کا اسٹائل' اس کی خوب صورتی۔۔۔ ثامن واقعی قابل تعریف تھا۔

ثامن شاذ و نادر ہی اسے چھوڑنے آتا تھا یا پھر کبھی لینے آجاتا۔ عموماً" وہ امان کے ساتھ ہی آتی تھی۔ امان این ای ڈی کا اسٹوڈنٹ تھا' جبکہ وہ خود پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کر رہی تھی۔ امان اس سے سال بھر چھوٹا تھا' مگر اس سے زیادہ با اختیار تھا۔ ہر جگہ اپنی مرضی سے آجا سکتا تھا' مگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ ان کے یہاں لڑکیوں کے اکیلے آنے جانے پر شدید قسم کی پابندی تھی' مگر یہ پابندی کبھی کبھی اسے محتاجی لگتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یامنہ! ذرا ثامن کا ڈراما۔۔۔ تو لگانا' ساڑھے سات بجے ہی شروع ہوتا ہے نا۔"

وہ جو اپنا پسندیدہ ڈرامہ دیکھنے بیٹھی تھی' امی کی مداخلت پر بری طرح چڑ گئی۔ اس کے پسندیدہ سوپ کی آج آخری قسط آنی تھی جس کا اسے ہفتہ بھر سے انتظار تھا' مگر پھر امی ہی کیا صبورہ آپی' عائلہ اور تائی امی بھی مشترکہ ٹی وی لاؤنج میں آبیٹھی تھیں۔ اس نے بے دلی سے ریموٹ عائلہ کو تھمایا اور خود باہر لان میں آگئی تھی۔

"یہاں تو سب کا اللہ ہی حافظ ہے' وہ چہرہ ٹی وی اسکرین پر۔۔۔ اس ذوق و شوق سے دیکھتے ہیں یہ لوگ' جس کے خدوخال تک انہیں حفظ ہیں اور مستقل آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ میں تو اکتا چکی ہوں ان کے کریز سے۔"

☆ ☆ ☆

وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی' مگر اس کا اپنا ذاتی خیال تھا کہ اس کے والدین خصوصاً" ماں کو صرف ثامن سے محبت تھی' پھر امان سے' اور وہ دو بیٹوں کی موجودگی میں ان کے لیے انتہائی غیر اہم تھی۔ ثامن تو یوں بھی پانچ سال تک بلا شرکت غیرے ان کی محبت کا حق دار رہا تھا اور پھر وہ آگئی تھی' مگر ثامن کی حیثیت اور اہمیت میں کسی طرح کی نہیں آئی تھی۔ اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم تھی اور پھر محض ایک سال بعد امان آگیا تھا' اور اس طرح اس کی رہی سہی اہمیت بھی ختم ہو گئی تھی۔

بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شدید قسم کے احساس کمتری کا شکار ہو چکی تھی۔ امی ہمہ وقت اسے اس کی کوتاہیوں کا احساس دلاتی رہتی تھیں۔ یہ ٹھیک تھا کہ وہ اپنی پوری کوشش کے باوجود ان کی دی ہوئی ہدایات پر پوری طرح عمل نہیں کر پاتی تھی' مگر ایسا وہ جان بوجھ کر نہیں کرتی تھی' اس کی امی چاہتی تھیں' وہ گھرداری میں ایک دم ماہر ہو جائے' بالکل صبورہ آپی اور عائلہ کی طرح۔ اس کا موازنہ ہر دم صبورہ آپی اور عائلہ سے کیا جاتا تھا اور پھر پڑھائی کے معاملے میں بھی اسے سرمد بھائی' ثامن اور امان کی مثال دی جاتی تھی۔

سرمد بھائی اس کے تایا کے اکلوتے بیٹے تھے' جو بے حد ذہین تھے۔ یوں تو ثامن اور امان بھی کم نہیں تھے مگر وہ دونوں سرمد بھائی کی طرح پڑھاکو ٹائپ نہیں تھے۔
ثامن نے تو دوران تعلیم ماڈلنگ اور پھر ایکٹنگ شروع کردی تھی۔ پاپا کی طرف سے ایک ہلکی سی تنبیہہ اسے پڑھائی کے معاملے میں سننے کو ملی تھی اور بس۔ اور پھر واقعی اس نے کبھی انہیں شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ تعلیم کو خیرباد کہنے کے بعد اس نے پاپا کا بزنس جوائن کرلیا تھا لیکن اپنا ایکٹنگ کا شوق نہیں چھوڑا تھا۔ وہ شوبز کی دنیا میں خوب نام کما رہا تھا تو دوسری طرف کاروباری اسرار و رموز سے بھی خوب اچھی طرح واقف تھا۔
وہ ہر معاملے میں بے حد خوش نصیب تھا۔ کامیابی ہر جگہ اس کے قدم چومتی تھی اور محبت۔ وہ تو اسے ہر جگہ سے وافر مقدار میں ملتی تھی۔ ماں' باپ' رشتے دار' دوست اور اب تو خیر سے اس سے محبت کرنے والوں بلکہ والیوں کی ایک لمبی فہرست تھی۔
اور ثامن محبت کے معاملے میں جتنا خوش نصیب تھا وہ شاید اتنی ہی محبت اور توجہ کو ترسی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج پھر وہی خواب دیکھا تھا اس نے۔ چند لمحے لیٹے لیٹے ہی اس نے سمجھنے کی کوشش کی' پھر اٹھ بیٹھی۔
کل ہی اس کے پیپرز ختم ہوئے تھے اور اس کا ارادہ صبح دیر تک سونے کا تھا مگر برا ہو اس خواب کا' جس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے قریب پڑا موبائل اٹھا کر ٹائم دیکھا ابھی صرف ساڑھے تین ہی بجے تھے۔ ٹائم دیکھ کر وہ بستر چھوڑ چکی تھی۔
وضو کرکے اس نے تہجد کی نماز ادا کی تھی۔ اب اگر اسے یہ خواب پریشان کرتا تھا تو وہ یہی کرتی تھی' نیند تو یوں بھی نہیں آتی تھی' وہ اٹھ کر نوافل ادا کرتی اور دیر تک درود شریف کا ورد کرتی' اب تو یہ اس کا معمول بنتا جارہا تھا۔ پہلے تو پانچ وقت کی نماز پڑھنا اسے مشکل لگتا تھا مگر جب سے تہجد ادا کرنا شروع کی تھی' پانچ وقت کی نماز بھی پابندی کے ساتھ نہایت خشوع و خضوع سے ادا کرنے لگی تھی۔ اور کم از کم اس ایک معاملے میں امی کی ڈانٹ سے بچت ہونے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کل تو غالباً" تمہارے پیپرز ختم ہوئے ہیں اور تم آج صبح صبح کچن میں نظر آرہی ہو۔ پیپرز کے بعد تو تم سونے کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑنے کی عادی ہو' پھر اب کیا ہوا۔"
وہ فجر کی نماز پڑھ کر اپنے لیے چائے بنانے کی غرض سے آئی تھی اور ثامن بھی شاید ابھی ابھی لوٹا تھا۔ وہ دو دن سے اپنے کسی ڈرامے کی شوٹنگ کے سلسلے میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔
"ناشتا کرو گے تم؟" وہ اس کی بات نظر انداز کرکے بولی۔
"ظاہر ہے۔ تمہیں پتا ہے' باہر مجھ سے نہیں کھایا جاتا۔" وہ کرسی گھسیٹ کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ وہ پوچھ کر پچھتائی تھی' مگر ابھی پچھتانے اور بعد میں امی کی ڈانٹ کھا کر پچھتانے میں کافی فرق تھا۔ اگر امی کو پتا چلتا کہ ثامن صبح آیا اور اس نے اس سے ناشتے کے لیے نہیں پوچھا' تو پھر اسے سخت سست سننے کو ملتیں۔
"ایک بات بتاؤ یامنہ! تمہیں کوئی پرابلم ہے؟"
ثامن نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد سوال کیا تھا اور اس کے سوال پر نفاست سے پراٹھے کے لیے پیڑا بناتے اس کے ہاتھ لمحہ بھر کو رکے تھے۔
"مجھے کیا پرابلم ہوگی؟" نخوت سے الٹا سوال کیا تھا۔
"مجھے ایسا لگتا ہے اگر تم مجھے بتانا چاہو تو۔"
وہ خلوص دل سے آفر کررہا تھا' مگر وہ اس سے پہلے کب کچھ شیئر کرتی تھی جو اب کچھ بتاتی' لہٰذا خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہی' یہاں تک کہ اس نے

ناشتا تیار کرکے اس کے سامنے ٹیبل پر لگا دیا تھا۔
"امی پتا نہیں کیوں کہتی ہیں کہ تمہیں کچھ نہیں آتا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم کافی زیادہ سلیقہ شعار ہوگئی ہو۔ ان فیکٹ چائے اور کافی تو تم سے بہتر کوئی بنا ہی نہیں سکتا۔" وہ شاید اس کی پریشانی کا سرا پانا چاہتا تھا' جو یوں اس کی تعریف کررہا تھا۔
"اللہ تیرا شکر ہے' میرا بچہ خیر خیریت سے گھر آگیا۔" امی نے کچن میں قدم رکھا تھا اور ثامن کو بیٹھا دیکھ کر بے ساختہ اللہ کا شکر ادا کیا۔
ان کا بس چلتا تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی اسے نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتیں۔ پاپا جب بھی موڈ میں ہوتے تو کہتے کہ "تمہاری امی کی جان تو ثامن میں ہے بھئی' جو محبت اور توجہ ثامن سے بچ جاتی ہے' وہ تھوڑی بہت ہمیں بھی مل جاتی ہے۔"
اور واقعی پاپا کی مذاق میں امی کو تنگ کرنے کے لیے کہی جانے والی بات اسے سو فیصد درست لگتی تھی۔
اب امی کے سوال جواب تھے اور ثامن تھا۔ اگر وہ باہر ہوتا تو امی بار بار فون کرتی تھیں' پھر بھی ان کی تسلی تب ہی ہوتی تھی' جب وہ گھر آجاتا۔ وہ خاموشی سے کچن سے نکل گئی تھی۔
امی کی ساری توجہ ثامن کی جانب تھی اور ایسے میں اسے اپنا آپ ہمیشہ کی طرح غیر ضروری لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یامنہ! ایک بات تو بتاؤ۔"
اس کی بیسٹ فرینڈ سجیلہ اس وقت اس کے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ وہ لوگ یونیورسٹی سے فارغ ہوچکی تھیں۔ رزلٹ کا انتظار تھا۔ جب دل چاہتا دونوں ایک دوسرے کے گھر جاکر مل لیتی تھیں۔ سجیلہ کا تو رزلٹ آنے کے بعد جاب کا ارادہ تھا لیکن اس کے لیے امی نے رشتے ڈھونڈنا شروع کردیے تھے اور یامنہ کو یقین تھا کہ امی جس طرح شد و مد سے اس کے لیے لڑکا تلاش کررہی تھیں' بہت جلد بلکہ صبورہ آپی کے ہمراہ ہی اسے بھی رخصت کرنے والا امی کا ارادہ ضرور پورا ہونے والا تھا۔
"یامنہ! میں کچھ کہہ رہی ہوں۔" اس کی خاموشی پر سجیلہ جھنجلا کر بولی تھی۔
"کچھ پوچھو گی تو ہی بتاؤں گی ناں۔" وہ الماری میں کپڑے رکھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔
"یار! تم اپنے بھائی کی شادی کب تک کررہے ہو۔ ویسے کوئی لڑکی دیکھ رکھی ہے یا نہیں۔"
"فی الحال تو ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ بلکہ کم از کم پانچ سات سال تک تو ایسا کوئی چانس نہیں ہے۔ اس کا بس چلے تو کل ہی شادی کرلے مگر پاپا کہتے ہیں' جب تک وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوگا' ایسا کوئی خیال بھی دل میں نہ لائے۔" وہ سجیلہ کو ___ اطلاع فراہم کررہی تھی۔
"کیا ہوگیا ہے' ذرا میں تم سے ثامن کے بارے میں پوچھ رہی ہوں اور تم پتا نہیں کیا بک رہی ہو۔ وہ تو اتنا کامیاب ایکٹر ہے' اور میرے پاپا تو کہتے ہیں ثامن جتنا زبردست اداکار ہے' اس سے زیادہ اچھا بزنس مین ہے۔" سجیلہ نے اس کی عقل پر ماتم کرنے کے ساتھ ثامن کی شان میں قصیدے بھی پڑھے۔
"اوہ! سوری اصل میں ثامن کو تو امی اور پاپا کی طرف سے کھلی چھوٹ ہے' وہ جس لڑکی کا نام لے گا' امی اسے فوراً بہو بنا کر لے آئیں گی۔ اور جب اس کا دل چاہے گا' وہ شادی کرلے گا اور آج تک اس نے ہر معاملے میں اپنی من مانی کی ہے تو ظاہر ہے شادی بھی اپنی پسندیدہ لڑکی سے ہی کرے گا۔ اتنا سیدھا تو ہے نہیں' جو امی کی مرضی پر سر جھکا دے گا۔"
وہ بات کرتے کرتے سجیلہ کے برابر آکھڑی ہوئی تھی۔ سامنے ہی ثامن اور امان لان میں بیٹھے تھے۔ چھ سال کے تفاوت کے باوجود دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔
"ویسے والدین کی مرضی پر لڑکے نہیں لڑکیاں سر جھکاتی ہیں۔ خیر ایک بات تو ہے' جو بھی لڑکی تمہارے گھر میں ثامن کے حوالے سے آئے گی وہ بے حد خوش نصیب ہوگی۔ تمہارا بھائی خود تو ہے ہی

لاکھوں کروڑوں میں ایک ہم سب بھی بے حد اچھے ہو اور جو زیادہ لاڈلا ہوتا ہے' اس کے حوالے سے اس کی بیوی کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔" سجیلہ نے اس کی تصیح کرنے کے ساتھ رشک سے کہا تھا۔

"بائی دا وے! تمہارے ارادے کیا ہیں۔ کہیں تمہارا بھی تو باقی لڑکیوں کی طرح دماغ خراب نہیں ہو گیا' یا پھر تمہیں بھی شوبز کی چکا چوند متاثر کر رہی ہے۔" اس نے سجیلہ کی تائید کرنے کے بجائے اس کے تبصرے پر اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"ارے! ایک تو میں تمہارے بھائی کی تعریف کر رہی ہوں' اوپر سے تم ہو کہ بلاوجہ برا مان رہی ہو۔ لڑکیاں تو اپنے بھائیوں کی تعریف پر اتنا خوش ہوتی ہیں اور ایک تم ہو۔" سجیلہ نے اسے لگی لپٹی رکھے بغیر سنا دیں۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو یہ موصوف زبردستی کے بھائی بنے ہوئے ہیں۔ پتا نہیں اگر نرجس خالہ نے امی اور پاپا کو اپنا بیٹا دے بھی دیا تھا تو میری اور امان کی پیدائش کے بعد اسے واپس کیوں نہیں لیا' حالانکہ پھر کیا جواز رہ گیا تھا۔ اس کے یہاں رہنے کا۔" وہ ہمیشہ کی طرح تلخ ہوئی تھی۔

"بری بات ہے یامنہ! ایک تو تمہاری خالہ نے اپنا بیٹا تمہاری امی کی خالی گود میں ڈال دیا اور تم ہو کہ ان کی احسان مند ہونے کے بجائے کہہ رہی ہو کہ انہیں ثامن کو واپس لے لینا چاہیے تھا۔" سجیلہ نے اسے شرمندہ کرنا چاہا تھا۔

"ہاں تو اور کیا۔۔۔ ان کے تو پہلے ہی سات بیٹے اور تھے پھر یہ آٹھواں اگر انہوں نے دے بھی دیا تو انہیں کون سا کمی ہو گئی۔" اس کے بے لاگ تبصرے پر سجیلہ اسے تاسف سے دیکھتی رہ گئی تھی۔

سجیلہ کو بہت افسوس ہوتا تھا اس کی باتوں پر' ثامن کو تو معلوم بھی نہیں تھا کہ یامنہ اسے اس قدر ناپسند کرتی ہے' مگر اسے سمجھانا بے سود تھا' پھر دوبارہ آنے کا کہہ کر سجیلہ چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

آسیہ اور فاروق کی شادی کو سات سال ہو گئے تھے مگر وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ ان کی محرومی دیکھ کر آسیہ کی بڑی بہن نرجس نے اپنے شوہر تجمل احمد کی رضامندی سے اپنا بیٹا اپنی بہن کی خالی گود میں ڈال دیا تھا۔

نرجس کو اللہ نے پہلے ہی سات بیٹوں سے نوازا تھا اور ثامن ان کا آٹھواں اور سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ نرجس اور تجمل احمد دبئی میں رہائش پذیر تھے۔ ثامن کی پیدائش پر نرجس کو دیکھنے کی غرض سے ہی آسیہ اور فاروق دبئی گئے تھے کیونکہ نرجس کی حالت بہت خراب تھی' پھر وہاں جا کر انہیں زندگی کی سب سے بڑی خوشی مل گئی۔

نرجس نے ان کے مانگے بغیر ہی ثامن ان کی گود میں ڈال دیا تھا۔ وہ دو دن کا تھا۔ آسیہ اور فاروق کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا' پاکستان واپسی پر انہوں نے ڈھیر ساری خوشیاں منائیں' پھر ثامن کا ان کی زندگیوں میں آنا مبارک ثابت ہوا تھا۔ پانچ سال بعد یامنہ اور اس کے ایک سال بعد امان ان کی گود میں آ گئے تھے۔ اپنی اولاد ہونے کے بعد بھی انہوں نے نہ ہی ثامن کو واپس کرنے کے بارے میں سوچا اور نہ ہی نرجس اور تجمل احمد نے ایسا کوئی تقاضا کیا حتیٰ کہ ثامن کی اہمیت میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ثامن سمیت کسی سے بھی یہ بات نہیں چھپائی گئی اس کے باوجود ثامن' آسیہ اور فاروق کو ہی امی اور پاپا کہتا تھا جبکہ نرجس اور تجمل احمد کو خالہ اور خالو کہتا تھا۔

اگر آسیہ اور فاروق اس سے اتنی محبت کرتے تھے تو وہ بھی ان سے اتنی ہی محبت کرتا تھا۔ ان کا بے حد فرماں بردار بیٹا تھا وہ۔ یامنہ اور امان سے زیادہ انہیں اس پر مان تھا' فخر تھا' مگر یامنہ ہوش سنبھالنے کے ساتھ ساتھ ثامن کی اس قدر اہمیت سے خائف سی رہنے لگی تھی۔

امی پاپا ہر معاملے میں ثامن کی مرضی اور رائے کو اہمیت دیتے تھے۔ اس کی ہر خواہش پوری کرتے تھے۔ جبکہ اس نے کبھی ثامن کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور

نہ ہی وہ جگہ جس کا وہ حق دار تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ صرف ثامن کی وجہ سے وہ اپنے والدین کے قریب نہیں آسکی۔ البتہ امان کے لیے وہ بڑا بھائی ضرور تھا۔ امان ثامن کے قریب تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر امان سے بھی جھنجلا کر جھگڑ پڑتی تھی۔
اس کا خیال تھا کہ ثامن نے اس کی حق تلفی کی ہے۔ وہ ماں باپ جن کی محبت پر اس کا اور امان کا حق تھا، وہ زبردستی اس میں حصے دار بن گیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ منٹوں میں ثامن کو دبئی روانہ کردیتی اس کے والدین کے پاس، اس کے اپنے گھر۔ اور پھر وہ ہوتی اور اس کے والدین... ان کی محبت توجہ صرف اور صرف اس کے لیے ہوتی۔ اس کی سوچ یہیں تک محدود تھی۔ وہ بڑی ہوگئی تھی مگر اس کی سوچ اب تک بچگانہ تھی۔

☼ ☼ ☼

"ثامن! اگر تمہارے پاس ٹائم ہے تو بیٹھو، مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"
وہ ابھی گھر آیا تھا، اور فریش ہوکر اس کا دیر تک سونے کا ارادہ تھا۔ مگر آسیہ بیگم کے کہنے پر اسے رکنا پڑا۔
"میری پیاری امی کے لیے میرے پاس ٹائم ہی ٹائم ہے۔ آپ بتائیں، کیا بات کرنی ہے، بلکہ آج کل تو آپ کے پاس میرے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔ کتنے دن ہوگئے ہیں آپ کی گود میں سر رکھ کر باتیں نہیں کیں آپ سے۔"
وہ ان کے قدموں میں بیٹھ کر لاڈ سے بول رہا تھا اور کچن سے یامنہ باآسانی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ ایسے مناظر اس کے لیے ہمیشہ ہی ناقابل برداشت ہوتے تھے۔
"اچھا! ماں سے شکوہ کررہا ہے۔ خود جو ہر وقت بزنس اور شوبز میں پھنسا رہتا ہے۔" امی نے واری ہوتی نظروں سے اسے دیکھ کر کہا تھا۔
"امی! روٹیاں بنالی ہیں میں نے کھانا عائلہ لگالے گی۔ مجھے نیند آرہی ہے، سونے جارہی ہوں۔" وہ کچن کے دروازے پر نمودار ہوئی تھی۔ چہرے کے بگڑے زاویے معمول کی بات تھی۔
"یہ کون سا وقت ہے سونے کا۔" انہوں نے اسے گھُر کا۔
"چھوڑیں امی آپ... یامنہ! تم جاؤ اور امی! آپ بتائیں کیا بات کرنی تھی آپ کو۔"
اس نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی امی کا دھیان بھی ہمیشہ کی طرح اس کی طرف سے ہٹایا۔
"اونہہ، ہر وقت اپنے ناز نخرے اٹھواتا رہتا ہے۔ میری فیور کرکے بلاوجہ مجھ پر احسان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"
وہ جلے دل کے ساتھ سوچتی ہوئی اپنے کمرے چلی گئی۔
"دن بہ دن بگڑتی جارہی ہے یہ۔ مت کیا کرو اس کی اتنی فیور۔ شادی ہوکر اسے دوسرے گھر جانا ہے، کیسے گزارا ہوگا اس کا۔" امی ہمیشہ کی طرح فکر مند ہوگئی تھیں۔
"امی! کیوں بلاوجہ اپنا بلڈ پریشر بڑھاتی ہیں آپ... اچھی خاصی سگھڑ ہے وہ۔ اور آپ ابھی سے اسے سسرال کی فکر میں ہلکان کیے رکھتی ہیں۔" اس نے آسیہ بیگم کو مطمئن کرنا چاہا۔
"میں اس کی شادی کا سوچ رہی ہوں اور تم کہہ رہے ہو، ابھی اس کی فکر نہ کروں؟ خیر! مجھے تم سے اسی کے متعلق بات کرنی تھی۔ اصل میں میں اب یامنہ کو رخصت کرنا چاہتی ہوں اور ساتھ ہی تمہاری شادی بھی کرنا چاہتی ہوں۔" انہوں نے اپنی خواہش بیان کی۔
"امی! یامنہ کی حد تک تو ٹھیک ہے، مگر میں اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے فوراً" دامن بچایا۔
"مگر میری جان! مسئلہ کیا ہے۔ اس میں ایک ساتھ دو لڑکیاں گھر سے رخصت ہوں گی تو گھر ایک دم خالی خالی ہوجائے گا۔ کچھ تو رونق ہونی چاہیے نا گھر میں۔" وہ پیار سے اس کے پیشانی پر بکھرے بالوں کو سنوارتے ہوئے بولی تھیں۔
"امی! ابھی تو میرے کیریر کا اسٹارٹ ہے۔ شادی کے بارے میں ابھی میں نے نہیں سوچا۔ اور ابھی تو کوئی لڑکی بھی مجھے پسند نہیں ہے۔ آپ فی الحال صرف صبورہ کی شادی کی فکر کریں۔ میری شادی کا خیال اگلے چند سالوں تک دل میں لائیں بھی نہیں، بڑی ٹف روٹین ہے میری۔ فی الحال اس میں شادی کی گنجائش نہیں۔"
وہ کسی بھی طرح ابھی شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔
"مگر..." وہ اسے قائل کرنا چاہتی تھیں۔
"امی! سمجھیں ناں، میری مجبوری۔ ابھی ٹائم کہاں ہے میرے پاس ان بکھیڑوں میں پڑنے کا۔" وہ ان کے اصرار پر بے بسی سے بولا۔
"اچھا ٹھیک ہے اور ہاں، یامنہ کا ایک پرپوزل آیا ہوا ہے۔ لڑکا وکیل ہے۔" وہ دوبارہ یامنہ پر آگئیں۔
"ویسے امی! آپ کچھ جلدی نہیں کررہیں۔ ابھی تو وہ بہت چھوٹی ہے۔" وہ اس کے ناراض ناراض سے چہرے کو یاد کرکے بولا۔
"کیا ہوگیا ہے تمہیں، پورے اکیس سال کی ہوگئی ہے وہ... مجھے تو ہر وقت اس کی فکر لگی رہتی ہے۔" وہ روایتی ماؤں والی فکر مندی سے بولی تھیں۔
"اچھا تم ذرا سجاد سے مل لو۔ اچھی سلجھی ہوئی فیملی ہے سجاد سے ہماری ایک دو ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ تم مل لو تو پھر بات فائنل کریں۔"
"آپ بے فکر رہیں... میں جلد ہی مل لوں گا اس سے۔" اس نے امی کو اطمینان دلایا۔

☼ ☼ ☼

سجاد سے مل کر ثامن مطمئن ہوگیا تھا، اور اس نے آسیہ بیگم اور فاروق صاحب کو بھی اطمینان دلایا کہ یہ ہر لحاظ سے بہترین پرپوزل ہے۔
"اوکے" کی رپورٹ ملتے ہی آسیہ بیگم بھی فارم میں آگئی تھیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ صبورہ کے ساتھ ہی اسے بھی رخصت کردیں گی۔ صبورہ اس سے بڑی تھی اور اس کا رشتہ نرجس خالہ کے چوتھے نمبر والے بیٹے دانش سے طے تھا، اور اگلے مہینے ان کی شادی متوقع تھی۔ گھر میں سب ہی کو سجاد کا رشتہ موزوں لگا تھا، شام ان کا ارادہ تھا کہ وہ سجاد کے گھر فون کرکے ہاں میں اپنا عندیہ دے دیں، مگر اس سے پہلے نرجس خالہ کا فون آگیا۔
"بڑے افسوس کی بات ہے آسیہ! تم نے یامنہ کے لیے لڑکا اوکے بھی کردیا اور مجھ سے رائے تک لینا گوارا نہیں کیا؟" ان کے سرسری طور پر بتانے پر نرجس خالہ نے چھوٹتے ہی خفگی کا اظہار کیا تھا۔
"آپا! ابھی ہاں نہیں کی اور ظاہر ہے آپ سے پوچھ کر ہی بات آگے بڑھاتی۔ بے اصل میں یامنہ کے پاپا اور تایا تائی کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو مجھے لگا باقی سب..."
"ہاں، جب ہی تم سوچا کہ باقی سب سے پوچھنے کی یا رائے لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" پہلی بار نرجس خالہ بری طرح ناراض ہوئی تھیں۔ آسیہ بیگم کچھ دیر کے لیے خاموش رہ گئیں۔
"یامنہ کے سلسلے میں تم نے بہت جلد بازی سے کام لیا ہے آسیہ۔ لیکن خیر... اگر تمہیں غلط نہ لگے اور تم برا نہ مانو تو یامنہ کے لیے میرے پاس بھی ایک پرپوزل ہے۔" وہ کچھ توقف کے بعد بولی تھیں۔
"آپ کے پاس؟" آسیہ نے ٹھٹک کر کہا تھا۔
"ہاں مگر آسیہ... غلط مت سمجھنا، ثامن تمہارا بیٹا ہی ہے مگر میں چاہتی تھی کہ تم... یامنہ اور ثامن کے بارے میں سوچو۔ وہ حیران رہ گئیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ایسی بات بھی کہہ سکتی ہیں۔
"مگر آپا! یہ کیسے ممکن ہے۔" وہ ششدر تھیں۔
"کیوں ممکن نہیں ہے۔ بچے جانتے ہیں کہ وہ بہن بھائی نہیں ہیں۔ بے شک ثامن تمہارا بیٹا ہے مگر یامنہ ثامن کے لیے ایک بہترین انتخاب ہے اور اس طرح تمہاری اکلوتی بیٹی بھی ہمیشہ تمہارے پاس رہے گی۔" وہ تو پہلے سے ہی سب کچھ سوچے بیٹھی تھیں۔

"مگر آپا! ثامن اور یامنہ ..." وہ یہ سوچنے پر بھی متحمل نہ ہو سکتی تھیں۔

"کیوں، ثامن میں کوئی کمی ہے؟"

"نہیں آپا! ثامن میں تو کوئی کمی نہیں ہے لیکن یامنہ ..." ان کی بات پر نرجس خالہ کو شدید قسم کا غصہ آیا تھا۔

"تو پھر سنو یامنہ میں بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اور جس طرح تم سوچتی ہو ناں اس طرح تو تمہیں دنیا کی ہر لڑکی ثامن سے کم ہی لگے گی۔ تم لوگوں نے اسے حد سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ اگر فیصلے کا اختیار اس پر چھوڑا گیا ناں تو وہ یقیناً" اپنے ساتھ ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے والی کسی لڑکی کو تمہاری بہو بنا دے گا۔" انہوں نے بگڑ کر اچھی خاصی سنا دی۔

"مگر آپا! میں نے تو ثامن کے لیے عائلہ کو سوچ رکھا تھا۔"

آسیہ نے صاف گوئی سے بتایا تھا۔ مانا ان کی اپنی بیٹی حسن و خوب صورتی میں ثامن کے برابر نہیں تو اس سے کسی طور کم بھی نہیں تھی مگر گھرداری اور احساس ذمہ داری سے ان کے خیال میں یامنہ کا واسطہ نہیں تھا جبکہ عائلہ جہاں خوب صورت تھی وہیں اس میں یہ دونوں چیزیں بھی بہ درجہ اتم موجود تھیں اور یہی ان کی ثامن سے محبت کا ثبوت تھا کہ وہ اس کے لیے بہترین لڑکی کا انتخاب کرنا چاہتی تھیں۔ ان کی محبت میں نہ پہلے کسی قسم کی غرض تھی اور نہ ہی اب۔

"تم نے اور ثامن نے کیا سوچ رکھا ہے۔ اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے اور اگر تمہیں ثامن پر اعتراض ہے تو پھر تم شہران کے بارے میں سوچ سکتی ہو، شہران بھی میرا بیٹا ہے۔ تم اچھی طرح سوچ لو فاروق سے مشورہ کرلو، پھر بات کرنا اور جو پرپوزل ہے اسے ختم کرو۔" انہوں دو ٹوک بات کر کے فون بند کر دیا۔

"ثامن اور یامنہ ..." وہ بڑی الجھن میں پڑ گئی تھیں۔ انہیں اپنی بیٹی اپنے لاڈلے کے لیے غیر موزوں لگ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اور پھر سجاد کی فیملی سے معذرت کرلی گئی۔ ان کے انکار پر سب ہی کو حیرت ہوئی تھی۔ اگر نرجس خالہ کا ارادہ یامنہ کو بہو بنانے کا تھا تو آسیہ بیگم انہیں انکار کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ انہوں نے اپنا لخت جگر انہیں سونپا تھا، اگر وہ یامنہ کو مانگ رہی تھیں تو کیا ہوا، انہیں تو یوں بھی اسے رخصت کرنا ہی تھا۔ وہ اپنی بہن کو ناراض نہیں کر سکتی تھیں۔ انہیں شہران یامنہ کے لیے موزوں لگا۔ اور وہ اپنے فیصلے پر مطمئن ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

شادی میں صرف ایک ماہ رہ گیا تھا۔ نرجس خالہ اپنی آدھی فیملی کے ساتھ کراچی آچکی تھیں۔ باقی آدھی فیملی کچھ دنوں بعد آنے والی تھی جس میں تجمل انکل اور نرجس خالہ کے بڑے بیٹے احمر کی فیملی کے ساتھ ساتھ شہران اور فرزان بھی شامل تھے۔ نرجس خالہ کا ارادہ صبورہ آپی کو رخصت کروا کر ہی جانے کا تھا۔

کراچی میں ان کا سسرال تھا، اب بھی وہ وہیں ٹھہری ہوئی تھیں۔ سو رہائش کا تو نرجس خالہ کو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ آتیں، تو زیادہ تر سسرال میں ہی ان کا قیام ہوتا تھا۔ دونوں طرف شادی کی تیاریاں زور و شور پر تھیں۔ سارا دن ڈھیر سارے کام کرنے کے بعد بھی اسے رات کو نیند خوب تنگ کر کے آتی تھی اور پھر وہ خواب ... جو منتوں سے بلائی گئی نیند کو لمحوں میں رفو چکر کر دیتے تھے۔

آج بھی بمشکل تین بجے اس کی آنکھ لگی تھی اور پونے چار بجے دوبارہ اس خواب کی مہربانی سے اسے جاگنا پڑا۔

اس کا رزلٹ کب کا آچکا تھا۔ سجیلہ نے تو جاب بھی شروع کروی تھی اور وہ پتا نہیں، کن چکروں میں پھنسی ہوئی تھی۔

امی کے سامنے ایک ہی بار جاب کرنے کی خواہش زبان پر لائی تھی تو وہ کچھ سننے کو ملا کہ یہ خیال ہی دل سے نکال دیا تھا۔

چند روز قبل اس کا سکون امی اور تائی امی کی باتوں

نے مزید غارت کر دیا تھا۔ وہ تو حیران ہی رہ گئی تھی کہ امی نے اس کے لیے شہران کا انتخاب کیا تھا۔ وہ اس سے اتنا بے زار تھیں کہ اسے اتنی دور بھیجنا چاہتی تھیں۔ اپنی اکلوتی بیٹی کو۔

چلو لاڈلی نہ سہی مگر اکلوتی تو تھی ناں اور امی... امی کے سامنے وہ کسی قسم کی صدائے احتجاج بلند کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مگر وہ خود کو اس رشتے کے لیے خود کو آمادہ نہیں پا رہی تھی۔ صبورہ آپی کی شادی کی تیاری میں اس کی دلچسپی صفر رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

صبورہ آپی کا شرارہ سل کر آ گیا تھا مگر قمیص خاصی ڈھیلی تھی ـــ حالانکہ خالہ نے شہر کے بڑے بوتیک سے آرڈر پر بنوایا تھا۔ خالہ یہ غصے میں آ گئیں

"منہ مانگے پیسے لیتے ہیں یہ لوگ اور پھر بھی کام خراب کر دیتے ہیں، تم قمیص بھجواؤ مجھے میں اسی سے ٹھیک کرواؤں گی۔ اتنی لوز قمیص رکھی ہے۔"

"کوئی بات نہیں خالہ! تائی امی کہہ رہی تھیں کہ ہم اپنے ٹیلر سے ٹھیک کروالیں گے۔" یامنہ خالہ کو بتا کر ہی پچھتائی تھی۔ اب امی سے ڈانٹ پڑنے کا پورا امکان تھا۔ امی اور تائی امی دونوں نے ہی منع کیا تھا کہ خالہ کو یہ بات نہیں بتائی جائے۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکی کے سسرال سے آئی چیزوں میں مین میخ نہیں نکالنا چاہیے۔ مگر وہ خالہ کے پوچھنے پر اپنی بے ساختگی میں بتا چکی تھی۔

اور پھر وہ ہی ہوا، جس کا ڈر تھا۔ اس نے اس وقت تو خالہ کو ٹال دیا تھا مگر جب خالہ نے دوبارہ فون کیا تو باتوں باتوں میں اس بات کا بھی ذکر کر دیا، پھر حسب معمول امی سے اچھی خاصی عزت افزائی بھی ہو گئی تھی جس کے بغیر اس کا آج تک کوئی دن نہیں گزرا تھا۔

"کیا ہوا امی! خیریت۔" ثامن کی آمد بھی ہمیشہ کی طرح لازمی تھی۔ ایسے موقعوں پر پتا نہیں کیسے وہ موجود ہوتا تھا۔ اسے ثامن کی موجودگی سے شدید ہتک کا احساس ہوتا تھا۔ وہ امی کی ڈانٹ سے زیادہ ثامن کی ہمدردی سے خائف ہوتی تھی۔

"ارے میں تو اس لڑکی سے تنگ آ گئی ہوں۔" امی نے اسے بری طرح گھور کر کہا تھا۔

"تم جاؤ..." ثامن نے اس کی جان بخشی کرائی۔ امی غصے میں ہوتیں تو اس میں اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اپنے بارے میں کوئی وضاحت یا صفائی ہی دے دیتے یا پھر ایسے موقع پر ان کے سامنے سے ہٹ جائے اور اس کی خاموشی سے ان کا غصہ مزید بڑھ جاتا تھا۔ وہ خاموشی سے کچن میں آ گئی، جہاں عائلہ نے اسے ہمدردی سے دیکھا تھا۔

"تم رہنے دو، میں کرلوں گی۔" عائلہ کا انداز اسے مزید شرمندہ کر گیا تھا۔

"نہیں میں کرلوں گی اپنا کام۔" وہ کہہ نہیں سکی تھی کہ تم سے اپنا کام کروا کر مجھے مزید اپنی شامت نہیں بلوانی۔

☆ ☆ ☆

امی نے کچن کا کچھ سامان منگوانا تھا جس کے لیے انہوں نے اسے ثامن کے ساتھ بازار بھیج دیا تھا۔ ثامن کے ساتھ کہیں بھی آنا جانا ہمیشہ گراں گزرتا تھا، خاص طور سے بازار وغیرہ۔ لوگ اور خصوصاً "لڑکیاں" ثامن کو پہچان کر گھیر لیتی تھیں۔ آٹو گراف... طرح طرح کے سوالات... اور پھر جو بھی اس کے ساتھ ہوتا اسے زبردست قسم کی نظر اندازی برداشت کرنا پڑتی تھی اور یہ کام یامنہ سے نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود اگر آسیہ بیگم کہتیں تو اسے ثامن کے ساتھ جانا ہی پڑتا تھا کہ امی کے حکم سے سرتابی کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

ابھی وہ کار سے اترے ہی تھے کہ تین چار لڑکیاں ثامن کو دیکھ کر خوشی سے چیخی تھیں اور وہ وہیں گاڑی کے پاس کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ لڑکیاں ثامن کو گھیرے اس کی تعریفیں اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کر رہی تھیں،

آٹو گراف لیتے ہوئے ایک لڑکی نے ثامن سے اس کا پرسنل نمبر بھی مانگا تھا اس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اس کی بے نیازی اس وقت عروج پر تھی۔

"اوکے گرلز! اب اجازت ہے؟" ان سب کو آٹو گراف دے کر وہ بولا۔

"آپ ہمارے ساتھ ایک کپ چائے پی سکتے ہیں؟" ان میں سے ایک لڑکی چہک کر بولی۔

"سوری فی الحال تو ہمیں کچھ شاپنگ کرنی ہے۔" ثامن نے پلٹ کر یامنہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"واؤ! بہت خوب صورت ہیں یہ کون ہیں؟" ثامن کے دیکھنے پر وہ لڑکیاں بھی اس کی جانب متوجہ ہوئی تھیں اور ان پٹاخہ سی لڑکیوں کی بات پر وہ نروس ہو گئی تھی۔

"شی از مائی کزن۔" ثامن نے رسان سے جواب دیا تھا۔ وہ اپنے پرستاروں کے ساتھ خاصا با مروت تھا۔ شہرت کا نشہ ابھی اس کے دماغ پر چڑھا نہیں تھا شاید یا پھر یہ اس کا اسٹائل تھا... یامنہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

☆ ☆ ☆
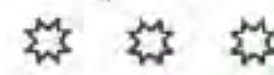
عائلہ صبورہ آپی کی برات میں پہننے کے لیے اپنا سوٹ خود تیار کر رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ لاؤنج میں سب کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی، مگر ساری توجہ اپنی قمیص پر تھی۔ وہ انتہائی نفاست سے کڑھائی کر رہی تھی۔ تایا ابو اور پاپا بزنس کا کوئی مسئلہ ڈسکس کر رہے تھے۔ تائی امی اور امی اپنی باتوں میں مگن تھیں۔ صبورہ آپی آج کل کام سے آزاد تھیں، سو اطمینان سے بیٹھی اپنے لمبے ناخنوں سے چلغوزے چھیل کر کھانے کا شغل فرما رہی تھیں۔

ثامن اور امان اسپورٹس چینل لگا کر بیٹھے ہوئے تھے اور وہ ایک فیشن میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی، جس میں ثامن کے بے حد نزدیک کھڑی ایک انتہائی بے باک سی لڑکی نے اس کا حلق تک کڑوا کر دیا تھا۔

"کس قدر واہیات ہے۔" اس نے میگزین بند کر کے پٹخا تھا اور تب ہی ثامن کی نظر عائلہ پر پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بڑی نفاست تھی اور ثامن اسے سراہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"ماشاء اللہ! عائلہ تو سلائی کڑھائی میں بے حد ماہر ہے۔ صبورہ کی شادی کے لیے اپنے تمام کپڑے اس نے خود تیار کیے ہیں۔" آسیہ بیگم نے ثامن کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"اچھا! یہ تو بڑی اچھی بات ہے اور یامنہ! تم نے شاپنگ کرلی امی۔" ثامن کا دھیان دفعتاً یامنہ کی طرف گیا۔ وہ گھر کے ہر فرد کے معاملات میں دلچسپی لیتا تھا مگر یامنہ کو یہ دلچسپی دخل اندازی لگتی تھی۔

"اس لڑکی کو جب تک کہو نہیں، خود سے خیال کہاں آتا ہے، اور پھر سارے ریڈی میڈ کپڑے تو لینے ہوتے ہیں اسے... اتنا کہا ہے سلائی کڑھائی سیکھ لو مگر مجال ہے جو کبھی ہاتھ میں سوئی بھی پکڑی ہو۔" انہیں پھر ڈانٹنے کا بہانہ مل گیا تھا۔

کبھی کبھی اسے لگتا کہ امی نے ثامن کو نہیں بلکہ اس کو کسی سے گود لیا ہے۔ اسے ثامن پر شدید غصہ آیا تھا۔

"امی! آج کل اچھے سے اچھے ڈریس بوتیکس سے مل جاتے ہیں تو پھر کیا ضرورت ہے اتنی مغز ماری کی۔" ثامن نے حسب معمول حمایت کی۔ آگ لگا کر پانی ڈالنے کی عادت بھی۔

"مگر پھر بھی لڑکیوں کو سینا پرونا تو آنا ہی چاہیے۔"

"چھوڑیں امی! آج کل وہ زمانہ نہیں رہا۔" وہ لاپروائی سے بولا جبکہ باقی سب کی خاموشی انہیں امی کا حامی ظاہر کر رہی تھی اور ثامن تو تھا ہی فساد کی جڑ۔

"یامنہ! تم اپنی شاپنگ کرلو، پھر مہمان آجائیں گے تو ٹائم نہیں ملے گا اور یوں بھی جلدی جلدی میں اچھی شاپنگ نہیں ہو پائے گی۔" اس نے یامنہ کے جھکے سر کو دیکھ کر کہا۔

"مجھے نہیں کرنی کوئی شاپنگ۔" اس نے آج پہلی بار سب کے سامنے ثامن کو ٹکا سا جواب دیا۔ آسیہ

بیگم اس کے انداز پر حیران رہ گئی تھیں۔۔۔ وہ جواب دے کر پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

"دیکھ لو اس لڑکی کی زبان اور انداز۔۔۔ اور کرو اس کی فیور۔" امی کو اس پر شدید غصہ آیا تھا۔

امان فوراً "یامنہ" کے پیچھے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ وہ لاکھ اسے تنگ کرتا تھا، مگر اس کی آنکھ میں آنسو نہیں برداشت کر سکتا تھا۔ امی کی بے جا روک ٹوک بھی اسے پسند نہیں تھی۔۔۔ مگر جب امی اس معاملے میں بابا کی اور امان کی نہیں سنتی تھیں تو اس کی شنوائی کیا ہوتی، بس یہ ہی سوچ کر وہ خاموش رہ جاتا تھا۔

"امی! آپ اتنا کیوں ڈانٹتی ہیں اسے۔۔۔ اب رو رہی ہوگی وہ اندر۔" ثامن کو افسوس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼
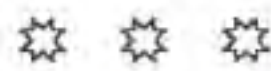
"یامنہ! مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اتنے چھوٹے دل کی ہو۔۔۔ چلو بس اب بند کرو یہ رونا۔ امی تمہارے بھلے کے لیے ہی کہتی ہیں سب۔" امان اسے پیار سے سمجھا رہا تھا، مگر وہ مسلسل رو رہی تھی۔

"امان تم جاؤ یہاں سے۔" آنسوؤں کے درمیان اس نے اپنے کندھے کے گرد پھیلا امان کا بازو جھٹکا۔

"ایسے کیسے چلا جاؤں، تمہیں پتا ہے مجھ سے اور ثامن بھائی سے تمہارے آنسو برداشت نہیں ہوتے۔ تم ایک ہی تو ہماری بہن ہو۔ اب بھی ثامن بھائی، امی سے تمہاری فیور کر رہے ہوں گے۔" اس نے یامنہ کے رخساروں پر بہتے آنسو صاف کیے۔

"ونہہ! ثامن۔۔۔ اسے تو خوشی ہوتی ہے۔۔۔ وہ جان بوجھ کر ایسی باتیں کرتا ہے تاکہ مجھے امی سے ڈانٹ پڑے۔" وہ آج پھٹ پڑی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے یامنہ! ثامن بھائی بھلا ایسا کیوں کریں گے۔۔۔ انہیں تو ہمیشہ تمہاری فکر رہی ہے۔ امی، بابا سے بھی زیادہ تمہارا خیال رکھتے ہیں۔" امان حیران ہو رہا تھا۔

"وہ کیوں رکھے گا میرا خیال۔ میرے حصے کی محبت اور توجہ پر تو وہ خود قبضہ کر کے بیٹھا ہوا ہے۔ جہاں مجھے ہونا چاہیے، وہاں وہ ہے۔ امی بابا کو میں کہاں نظر آؤں گی، انہیں تو ہر طرف ثامن نظر آتا ہے اور تھوڑی بہت محبت جو ثامن سے بچ جاتی، وہ امی تم پر لٹا دیتی ہیں۔ میں تو بلاوجہ آگئی ہوں اس گھر میں بغیر مانگے۔" وہ گھٹنوں پر سر رکھے بولتی جا رہی تھی۔

"یامنہ! کیا ہو گیا ہے تمہیں، ثامن بھائی ہمارے بھائی ہیں، وہ۔۔۔"

"نہیں ہے وہ میرا بھائی، میرے بھائی صرف تم ہو سمجھے؟ نہیں مانتی اس زبردستی کے رشتے کو۔۔۔ مگر میری فکر ہے کسے۔۔۔ وہ مجھے خود سے دور بھیجنا چاہتی ہیں۔۔۔ میں بوجھ ہوں ان پر۔۔۔ اور وہ ثامن۔۔۔ بھیجنا اسے چاہیے مگر۔۔۔ صرف ثامن ہے جس کی وجہ سے مجھے امی کی محبت نہیں مل سکی۔ ہمیشہ ترسی ہوں میں امی کی محبت کے لیے۔۔۔ اور شاید ہمیشہ ترستی رہوں گی۔" وہ بولنے پر آئی تو پھر بولتی چلی گئی اور ثامن کب سے دروازے پر کھڑا اس کا ایک ایک لفظ سن چکا تھا۔ امان کو معلوم تھا۔ مگر ثامن نے اشارے سے منع کر دیا تھا۔

وہ کب سے اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا تلاش کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کا رویہ خود ثامن کے لیے بھی پریشانی کا باعث تھا اور آج ثامن کو اس کی خاموشی، بے زاری اور ناراضی کی وجہ معلوم ہو گئی تھی، جو ثامن نے ہمیشہ اس کے چہرے پر اپنے لیے دیکھی تھی۔۔۔ ثامن خاموشی سے پلٹ گیا۔۔۔ امان ثامن کے پیچھے باہر آیا تھا۔۔۔ اسے اب ثامن کی فکر ہو رہی تھی کہ جانے وہ کیا سوچ رہا ہو گا۔

"ثامن بھائی! پتا نہیں یامنہ کو کیا ہو گیا ہے۔۔۔ آپ پلیز برا مت مانیے گا، میں اس کی طرف سے۔۔۔"

"کیا ہو گیا ہے امان۔۔۔ یامنہ کوئی غیر نہیں ہے۔۔۔ اور تم میری فکر نہ کرو۔ اس کی کوئی بات بری نہیں لگی بلکہ اچھا ہوا جو آج اس نے اپنے دل کا غبار نکال دیا۔" وہ عام انداز میں بول رہا تھا۔

"مگر ثامن بھائی! اگر اس نے ایسا کچھ امی یا کسی اور کے سامنے کہا تو۔"

"ہاں اس کا سدباب کرنا پڑے گا۔" مگر تم بے فکر

رہو' مجھے پتا ہے کہ کیا کرنا ہے۔۔۔ ثامن نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

☼ ☼ ☼

"یہ بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا سوجھی ہے۔ پہلے تو کبھی تم نے اس طرح کی بات نہیں کی۔" سارا گھر اس کے فیصلے پر حیران و پریشان تھا۔ وہ اپنے ددھیال میں جاکر رہنا چاہ رہا تھا اور اس کے بعد اس کا دبئی جانے کا ارادہ تھا۔

"امی! میں آتا رہوں گا' میں اسی شہر میں ہوں۔" فی الحال وہ یامنہ کے لیے یہ ہی کر سکتا تھا کہ منظر سے ہٹ جاتا۔

"ایسے کیسے جا سکتے ہو تم۔۔۔ تمہیں پتا ہے میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

آسیہ بیگم کو بمشکل ثامن نے اپنی قسمیں دے دے کر رونے سے روکا تھا' ورنہ انہوں نے اپنا برا حال کرلینا تھا۔۔۔ اور پھر وہ چلا گیا تھا۔۔۔ گھر میں ہولناک خاموشی چھا گئی تھی۔۔۔ یامنہ حیران تھی' صرف حیران یا پھر خوش۔۔۔ وہ خود اپنی کیفیت سے انجان تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ آج پھر اس کے ہمراہ تھا۔ شاید وہ زمین پر تھے یا پھر یہ کوئی اور سیارہ تھا شاید چاند۔۔۔ ڈھیر ساری روشنیاں' زمین اور آسمان سے پھوٹ رہی تھیں۔۔۔ اور وہ ان روشنیوں پر اس کے ہمراہ' اس کا ہاتھ تھامے چل رہی تھی مگر یہ کیا۔۔۔ دفعتاً" وہ اس سے ہاتھ چھڑا کر کہیں چلا گیا تھا اور وہ اس ویران اور انجان جگہ پر تنہا کھڑی تھی۔

اسے اپنے حلق میں آنسوؤں کا گولہ سا اٹکتا محسوس ہوا تھا' پھر ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھ کھل گئی۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

ثامن کو گئے ہوئے دو دن ہو گئے تھے اور ان دو دنوں میں امی کی کیفیت دیکھ کر اسے خود بھی دکھ ہونے لگا تھا۔ ایک بے نام سی خلش تھی۔

رات کو سرمد بھائی اپنی فیملی کے ہمراہ آئے تو کچھ رونق ہو گئی تھی۔ دیر تک جاگنے کی وجہ سے سب فجر کی نماز ادا کرکے دوبارہ سو گئے تھے۔ اور وہ ہمیشہ کی طرح بے چین ہو گئی تھی۔ نماز پڑھ کر وہ یونہی لیٹی ہوئی تھی۔ اب دوبارہ نیند کہاں آنی تھی؟

چائے کی طلب اسے کچن میں کھینچ لائی تھی۔ کتنی ہی راتیں اور صبحیں اسے یاد تھیں' جب وہ اسی طرح کچن میں موجود ہوتی تھی اور ثامن غیر متوقع طور پر چلا آتا تھا۔ مگر اب۔۔۔ وہ غیر ارادی طور پر سوچے جا رہی تھی۔

"مجھے پکا یقین تھا کہ پورا گھر سو رہا ہو گا اور تم اکیلی جاگ رہی ہو گی۔" اپنے پیچھے ثامن کی آواز سن کر وہ چونک کر پلٹی۔

"تم یہاں' اس وقت؟" وہ اسے دیکھ کر حیرت سے بولی تھی یا خوشی سے۔ ثامن کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"میرا گھر ہے۔۔۔ جس وقت چاہے' آسکتا ہوں۔ کوئی پابندی ہے؟" وہ اطمینان سے اس کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے اس کے تاثرات سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"جہاں تک مجھے علم ہے' تم دو دن پہلے یہ گھر چھوڑ کر جا چکے تھے۔" وہ مروت کو سرے سے لپیٹ کر طاق پر رکھ چکی تھی۔

"آپ کی اطلاع کے لیے بتا دوں کہ میں گیا ضرور تھا' مگر اس گھر کو یعنی اپنے گھر کو میرا چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور ویسے بھی گھر چھوڑ کر لڑکے نہیں لڑکیاں جاتی ہیں۔۔۔ ویسے یامنہ! جتنی شکایتیں تمہیں مجھ سے ہیں' میرے گھر چھوڑ کر جانے پر تم تو یقیناً" بہت خوش ہوئی' اطمینان ہو گیا ہو گا تمہیں کہ اب امی پر سے میرا قبضہ ہٹ جائے گا' پھر تم خوب اپنے ناز نخرے اٹھواؤ گی امی سے۔" اس کی آنکھوں سے چھلکتی شرارت اور چڑانے والا انداز تو اسے پہلے ہی زچ کر رہا تھا مگر ساتھ ہی وہ بری طرح ٹھٹکی بھی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا اس بکواس سے۔" وہ ثامن کی بغیر لگی لپٹی کی گئی باتوں پر ہر لحاظ بھول کر تنتنے ساتھ بولی تھی۔

"وہی مطلب ہے' جو تم اس روز امان سے کہہ رہی تھیں کہ میں نے امی پر قبضہ جمایا ہوا ہے اور وغیرہ وغیرہ۔۔۔" وہ خاصا جتا کر بولا تھا۔

"تو تمہیں امان نے بتایا ہے۔"

"جی نہیں' میں نے خود اپنے انتہائی نیک کانوں سے سنا ہے۔" وہ اپنی تعریف کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

"اوہ! جب ہی میں کہوں کہ اچانک اتنے عقل مند کیسے ہو گئے تم۔ ظاہر ہے' اتنی عزت افزائی کے بعد تو تمہیں عقل آنی ہی تھی' یہ بات تو سمجھ آگئی ہو گی تمہیں کہ یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔" وہ آج بدلحاظی کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑنے پر کمربستہ تھی۔ پہلے تو صرف نگاہوں اور چہرے سے ہی ناپسندیدگی ظاہر ہوتی تھی' آج تو اس کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ تلخ ترین تھا۔

"خیر! میرا گھر تو یہ ہی ہے۔ یہ سمجھنے کی ضرورت تو تمہیں ہے کہ دراصل تمہیں یہ گھر چھوڑ کر کسی اور گھر جانا ہے۔ اچھا چلو چھوڑو یہ فضول بحث' اتنی دیر سے آیا ہوا ہوں اور تم نے مجھے ناشتے تک کے لیے نہیں پوچھا۔"

وہ اس کی ڈھٹائی پر حیران تھی۔ اتنا کچھ سن کر بھی وہ مسکرا رہا تھا۔ ماتھے پر کوئی شکن تک نہیں آئی تھی۔ دو دن پہلے جب وہ گیا تھا تو اسے لگ رہا تھا اب وہ یہاں کا کبھی رخ نہیں کرے گا۔ اور اب یامنہ کو لگ رہا تھا' وہ جیسے اس سے کوئی بدلہ لینے آیا ہے۔ یامنہ اس کے تیور دیکھ کر اندر ہی اندر گھبرائی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو۔ میں ناشتا کیے بغیر ٹلنے والا نہیں ہوں۔۔۔ بلکہ اب تو سرمد بھائی سے مل کر ہی جاؤں گا۔"

"میرے پاس فالتو ٹائم نہیں ہے۔" وہ بے خوفی سے بولی۔

"ناشتا تو میں کرکے ہی جاؤں گا۔۔۔ اب شرافت سے بناؤ' ورنہ امی سے کہہ کر بنواؤں گا۔"

اس کی کلائی تھام کر کوکنگ رینج کے سامنے کھڑا کرتے ہوئے ثامن نے جس انداز میں کہا تھا' اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ اس نے کبھی یامنہ سے سخت انداز میں بات نہیں کی تھی اور اب اس کا لہجہ اور انداز دونوں یامنہ کے لیے نئے تھے۔

"تو پھر کہہ دو امی سے۔ پہلے بھی تمہاری وجہ سے بہت کچھ سنا ہے' اب بھی سن لوں گی۔" اس کی سرکشی آج اس کے ہر انداز و الفاظ سے عیاں تھی۔۔۔ ثامن خاموش سا ایک ٹک اسے دیکھے گیا۔

"چھوڑو میرا ہاتھ۔۔۔ یہ تمہارے ڈرامے کا کوئی سین نہیں ہے۔" ثامن کی خاموشی پر وہ جھنجلا کر بولی تھی۔ ثامن کی نظریں اسے بری طرح مضطرب کر گئی تھیں۔ اس نے خاموشی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور وہ فوراً" کچن سے نکل گئی۔

اس روز ثامن رات تک وہیں رہا تھا اور یامنہ اس کے اس جانے والے ڈرامے کو سوچ سوچ کر کھولتی رہی تھی۔ اسے واپس آنا ہی تھا تو یہ فضول ڈرامہ کیوں کیا تھا۔ صرف یہ جتانے کے لیے کہ وہ کتنا اہم ہے؟ امی اس سے کتنی محبت کرتی ہیں؟ اور اس گھر میں اس کی کیا حیثیت ہے؟ یہ سب تو وہ پہلے ہی جانتی تھی۔

امی اس کے نخرے اس طرح اٹھا رہی تھیں' جیسے وہ سالوں بعد آیا ہو۔ ڈھیر ساری مصروفیت کے باوجود اس کا دھیان ثامن کی طرف سے نہیں ہٹا تھا۔ وہ رات گئے گیا تھا اور امی اس کے جانے پر یوں آبدیدہ ہو رہی تھیں' جیسے وہ سات سمندر پار جا رہا ہو حالانکہ اسے شوٹنگ پر جانا تھا۔

اور پھر ثامن نے جیسے اسے تنگ کرنے کی ٹھان لی تھی' وہ اسے زچ کرنے کا کوئی موقع خالی نہیں جانے دے رہا تھا۔ سب کی موجودگی میں اگر وہ کچھ کہتا تو سوائے ۔۔۔۔ برداشت کے اس کے پاس کچھ نہیں بچتا تھا۔ نرجس خالہ کی باقی فیملی بھی آچکی تھی۔۔۔ وقت کو جیسے پر لگ گئے تھے اور وہ دن بھی آپہنچا تھا جس کا سب کو شدت سے انتظار تھا یعنی صبورہ آپی اور دانش بھائی کا نکاح ہر طرف افراتفری کا عالم تھا اور اس افراتفری میں بہت سی حیرتیں بھی یامنہ کی منتظر تھیں۔

☼ ☼ ☼

حیرت کا پہلا شدید جھٹکا اسے تب لگا تھا۔ جب شام کو نرجس خالہ نے عائلہ کے ہاتھ میں شہران کے نام کی انگوٹھی ڈالی۔

"بھئی ایسی پیاری اور سلیقہ شعار لڑکیاں کسی اور کے گھر جائیں' یہ مجھے گوارا نہیں ہے۔ پھر اللہ نے مجھے بیٹے بھی دیے ہیں اور میرے بیٹے ہیں بھی بہت فرماں بردار۔" نرجس خالہ نے شرارت سے مسکرا کر امی کی طرف دیکھا تھا۔

"فرماں بردار تو میرا بیٹا بھی ہے' اور میں نے بھی اپنے بیٹے کی کوئی خواہش رد نہیں کی ہے۔ میں تو بس اس کی زندگی خوشیوں سے بھرنا چاہتی ہوں۔ ہمیشہ اسے ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتی ہوں۔"

امی نے پیار سے اپنے لاڈلے کو دیکھا' جو اس وقت بھی امان کے ساتھ مل کر شہران کا ریکارڈ لگا رہا تھا اور شہران کب اکیلا تھا۔ ان کی پشت پر ان کے بھائی تھے' ان کا ساتھ دینے کے لیے' مگر پھر بھی ثامن اور امان سے جیتنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

اس تمام ہنگامے میں ایک وہی حیران پریشان تھی۔ اس نے خود سنا تھا امی اور تائی امی اس کے اور شہران کے متعلق بات کر رہی تھیں۔۔۔ اور آج صبح بھی امی اس کا نام لے کر کسی رسم کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ پھر آج کی تقریب میں پہننے کے لیے امی نے اسے جو سوٹ دیا تھا' وہ بھی خاصا کامدار تھا۔ آتشی گلابی لمبی قمیص اور پاجامے پر بھاری دوپٹہ اور ہم رنگ جیولری کے ساتھ ہلکا پھلکا میک ماہر بیوٹیشن کے ہاتھوں کا کمال تھا۔ وہ ہمیشہ سے خاصی مختلف لگ رہی تھی۔ مگر تعجب یہ تھا کہ اتنی تیاری رائیگاں گئی تھی اور خالہ نے اس کے بجائے عائلہ کے ہاتھ میں انگوٹھی پہنا دی تھی۔

عائلہ کی منگنی کی رسم کے بعد وہ امی کی ہدایت پر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ یہاں وہ ثامن کے جملوں سے محفوظ تھی۔ ورنہ اس کی اتنی تیاری پر ثامن کے جملوں نے اس کا اچھا خاصا خون جلایا تھا۔

اسے کل کا واقعہ اب بھی اچھی طرح یاد تھا۔ امی کی ہدایت پر وہ صبورہ آپی اور عائلہ کے ہمراہ پالر گئی تھی۔ جہاں مختلف ٹریٹمنٹس کے بعد ان تینوں کے ہاتھوں پر مہندی بھی لگائی گئی تھی۔

واپسی پر انہیں امان کے بجائے ثامن لینے آگیا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ لحہ بھر کو اپنی جگہ پر رک گئی تھی اور یہی رکنا اس کے لیے مشکل کھڑی کر گیا تھا۔ صبورہ آپی اور عائلہ دونوں آرام سے کار کی پچھلی نشستوں پر براجمان ہو چکی تھیں' جبکہ اس کے لیے ثامن نے فرنٹ اگلا دروازہ کھول دیا تھا۔

"میں بھی پیچھے بیٹھ جاؤں گی۔"

"کیوں' پہلی بار میرے ساتھ سفر کر رہی ہو؟"

ثامن کی بات نے اسے جز بز کر دیا تھا' مگر پھر بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی تھی۔

"اب بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارا شوفر نہیں ہوں جو دروازہ کھول کر میڈم کے بیٹھنے کا انتظار کرتا رہوں گا۔" اسے اپنی جگہ کھڑے دیکھ کر ثامن سنجیدگی سے بولا تھا۔

"یہ ہی سمجھ لو۔ مگر میں تمہارے ساتھ آگے نہیں بیٹھوں گی۔" وہ بھی ہٹ دھرمی سے بولی تھی۔

"ایکسکیوز می! میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہوں جو الٹا سیدھا سوچوں اور سمجھوں۔۔۔ نہ ہی میرے پاس فالتو ٹائم ہے۔" ثامن نے کہنے کے ساتھ اس کا مہندی والا ہاتھ پکڑ کر اسے فرنٹ سیٹ پر دھکیلا تھا۔ اس کے ہاتھ پر لگی مہندی کے خوب صورت نقش و نگار ہاتھ پکڑنے کی وجہ سے پھیل گئے تھے' مہندی ابھی گیلی تھی۔

ثامن گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھا۔ پہلے ٹشو نکال کر اپنا ہاتھ صاف کیا۔ پھر منرل واٹر کی بوتل سے ہاتھ دھویا۔ اس ساری کارروائی کے دوران وہ بمشکل اپنا غصہ ضبط کر کے بیٹھی رہی۔ اور جوں ہی ثامن نے گاڑی اسٹارٹ کی' اس نے ٹشو پیپر بکس سے ٹشو نکال کر اپنے دونوں ہاتھوں سے مہندی پونچھ ڈالی۔ پہلے ثامن کی حرکت' پھر یا منہ کا رد عمل۔۔۔ صبورہ آپی اور عائلہ دونوں بے چاری حیرت سے کچھ بول ہی نہیں

پائی تھیں۔

گھر آکر امی سے حسب سابق سخت سست سننے کو ملی تھی، پھر سب کے کہنے کے باوجود اس نے دوبارہ مہندی نہیں لگوائی تھی۔ ویسے اس مہندی نے اتنی دیر میں ہی اس کے ہاتھوں پر گہرا رنگ چھوڑ دیا تھا۔ نقش و نگار تو گڈمڈ ہو گئے تھے، مگر اس کے دونوں ہاتھ گہرے سرخ ہو گئے تھے۔ اپنے ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کر اسے ثامن پر مسلسل غصہ آرہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ اس کے سامنے نہ آئے ورنہ دونوں کا معرکہ یقینی تھا۔

☼ ☼ ☼

"یامنہ بیٹا! قاضی اور گواہان آرہے ہیں، آپ یہاں بیٹھ جائیں۔"

وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے لان میں موجود مہمانوں کی چہل پہل دیکھ رہی تھی۔ صرف قریبی عزیزوں کو ہی نکاح میں مدعو کیا گیا تھا مگر پھر بھی کافی رونق ہو گئی تھی۔ تب ہی تائی امی نے آکر اسے ہدایت کی تھی۔ امی بھی ساتھ ہی تھیں اس لیے انہوں نے جو کہا وہ اس کے سر سے گزر گیا تھا۔

اس کے ناسمجھی سے دیکھنے پر تائی امی نے اسے خود تھام کر بیڈ پر لاکر بٹھا دیا تھا۔ ابھی وہ کچھ پوچھنا چاہ ہی رہی تھی کہ پاپا، تایا ابو، سرمد بھائی وغیرہ اندر آگئے۔ اس کے اٹھے ہوئے سر پر تایا ابو نے ہاتھ رکھ دیا۔ قاضی صاحب نے اس کی رضامندی مانگی تھی۔۔۔ امی نے صرف ایک بار کہا "یامنہ بیٹا! ہاں بولو۔" اور اس نے کب امی کی حکم عدولی کی تھی جواب کرتی؟ اس نے سر ہلا کر اقرار کرنے کے بعد نکاح نامے پر کانپتے ہاتھوں سے دستخط کر دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

رات کے کھانے پر نرجس خالہ کو اور ان کی فیملی کو بھی انوائٹ کیا گیا تھا۔

گھر میں خوب ہی رونق لگی ہوئی تھی۔ وہ کچن کے ضروری کام نبٹا کر تھوڑی دیر قبل ہی اپنے کمرے میں آئی تھی۔ نرجس خالہ کی آمد کے ساتھ ہی اماں اس کے بلاوے کا پیغام لیے چلا آیا۔ اور وہ سدا کی لاپروا اسی حلیے میں نرجس خالہ سے ملنے چلی آئی۔ امی کا اسے اس رف سے حلیے میں دیکھ کر پارہ ہائی ہو گیا۔

"یامنہ! کم از کم چینج تو کر کے آتیں۔" امی نے اسے گھور کے احساس دلایا تھا۔

"وہ۔۔۔ امی! میں کچن میں کام کر رہی تھی۔" وہ آہستہ سے منمنائی تھی۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں اسے اپنے حلیے پر واقعی سخت شرمندگی ہوئی تھی۔

"کام تو عائلہ بھی کر رہی تھی، مگر دیکھو لگ رہا ہے کہیں سے۔۔۔ کتنی سلیقہ مند لڑکی ہے یہ، کچھ سیکھو اس سے۔" امی نے اسے آڑے ہاتھوں لے لیا۔ "اس نے دیکھا، واقعی عائلہ نک سک سے تیار ہو چکی تھی۔ جبکہ وہ سفید سوٹ میں بغیر کسی سنگھار کے کھڑی تھی۔ حالانکہ کل ہی تو اس کا نکاح ہوا تھا۔

"بس کرو آسیہ! کیوں ہر وقت بچی کو ڈانٹتی رہتی ہو۔ ادھر آؤ یامنہ! میرے پاس۔" خالہ نے اسے بلا کر پیار کیا۔

"خبردار! جو اب میری بیٹی کو کچھ کہا ہو تو۔۔۔ بہت بری طرح پیش آؤں گی میں ہاں! اور اگر اس پر زیادہ سختی کرو گی، تو اپنے ساتھ لے جاؤں گی میں اپنی بیٹی کو۔" نرجس خالہ کی اتنی محبت پر اس کی آنکھیں جھلملا گئی تھیں، وہ ہمیشہ ہی اس سے اتنی محبت کا اظہار کرتی تھیں۔۔۔ مگر آج اسے ان کے لیے اپنے دل میں خاصا گداز محسوس ہوا تھا۔ وہ تو ثامن کی وجہ سے ان سے بھی نالاں ہی رہا کرتی تھی۔

"خالہ! میری امی ذرا سی سخت ضرور ہیں، مگر ان کا دل بے حد نرم ہے اور آپ اپنی بیٹی کو سمجھا دیں کہ اگر اس نے میری امی کی ہدایات پر عمل نہیں کیا تو میری امی اس کی اچھی طرح کلاس لیں گی۔"

ثامن نے درمیان میں ٹانگ اڑائی تھی۔

"اچھا بیٹا! بہت اپنی ماں کی سائیڈ لے رہے ہو، مگر اپنی ماں کو بھی سمجھا دو کہ اگر اس نے ظالم ساس بننے کی کوشش کی تو میں واقعی اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

"واہ نرجس آپا! آپ تو پہلے ہی ہماری دو بیٹیاں لے کر جا رہی ہیں۔" ان کا اشارہ صبورہ اور عائلہ کی طرف تھا۔ "اور اب آپ کی یامنہ پر بھی نظر ہے؟ دو لخت جگر آپ کو دے رہے ہیں۔ اس کے بارے میں تو سوچنے گا بھی مت۔ اسے تو خود سے دور کرنے کے تصور سے ہی میری روح کانپ جاتی تھی۔ اس کی ناسمجھی اور سادگی کو دیکھ دیکھ کر میرا دل ہولتا تھا کہ جانے کون ہو گا جو اس سے اتنی محبت کرے گا، جتنی ہم کرتے ہیں۔ یہ تو میری ڈانٹ سے ہی رو پڑتی ہے۔ سسرال والے تو جانے کیا کچھ سنا دیتے ہیں۔ اس سے اتنی محبت کے باوجود میں نے کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا۔ کہ کہیں لوگ یہ نہ کہیں کہ میں خود غرض ہوں۔ ورنہ کون نہیں چاہتا کہ اس کی اولاد اس کے سامنے رہے۔ آپ کے ہزار اصرار کے بعد بھی میرا دل نہیں مانتا تھا کہ میں اس طرح سوچوں۔۔۔ بس یہ ہی خیال تھا کہ ثامن کے دل میں یہ احساس نہ پیدا ہو جائے کہ ہم نے اسے اپنا بیٹا نہیں سمجھا مگر۔۔۔"

"مگر کیا خالہ! آپ کو بھی یہ جان کر یقیناً" صدمہ ہو گا کہ ثامن نے بھی کبھی خود کو آپ کا بیٹا نہیں سمجھا۔ تب ہی تو یامنہ سے شادی کی ضد کی اس نے۔" فرزان نے گوہر افشانی کی تھی۔ ثامن نے صرف ایک سال بڑے بھائی کو بری طرح گھورا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اپنے امی، پاپا کا بیٹا ہوں۔" ثامن نے اپنے برابر صوفے پر براجمان آسیہ کے کندھوں کے گرد اپنا مضبوط بازو پھیلایا تھا۔

"ہاں، ثامن میرا بہت پیارا بیٹا ہے۔ اس کے وجود سے ہی اس گھر میں ساری خوشیاں ہیں، میرے بیٹے کی محبت پر مجھے ذرہ برابر بھی شک نہیں ہو سکتا۔" انہوں نے مسکرا کر فخر سے ثامن کو دیکھا تھا۔ اور ثامن نے ایک شریر مسکراہٹ کے ساتھ فرزان کو اترا کر دیکھا۔

یامنہ حیران تھی۔ امی کی نم ہوتی آنکھیں۔۔۔ وہ اب بھی مسکرا کر پیار بھرے انداز میں یامنہ کو دیکھ رہی تھیں اور یامنہ کا بے چین دل پرسکون ہو کر دھڑک رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

تیز بارش میں اچانک دھوپ نکل آئی تھی۔ قوس قزح کے رنگ آسمان سے زمین تک پھیل گئے تھے۔ اس نے نم ہتھیلیوں کو پھیلا کر جیسے ان رنگوں کو مٹھی میں قید کرنا چاہا تھا اور جوں ہی اس نے ان رنگوں کو چھونے کی غرض سے ان کی جانب ہاتھ بڑھایا، اس کا ہاتھ اس کے بالکل قریب کھڑے شخص نے تھام لیا تھا۔ لمس کے ایک مانوس احساس نے اس کی گلابی ہتھیلیاں بھگو دی تھیں۔ اپنی ہی تیز دھڑکنوں کے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

"اف یہ خواب۔۔۔ اب تو پیچھا چھوڑ دیں میرا۔" وہ اٹھ بیٹھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے سوئی تھی وہ، تھکن سے ویسے ہی برا حال تھا۔

اس نے موبائل اٹھا کر ٹائم دیکھا، ابھی صرف ڈھائی بجے تھے۔ یعنی اسے سوئے ہوئے بمشکل پون گھنٹہ ہی گزرا تھا اور آنکھ کھل گئی تھی۔ اب دوبارہ سونے کی کوشش کرنا بے سود تھا۔

"کیسے گزرے گی پوری رات۔" وہ رو نکھی ہوئی تھی۔ "سب کتنے سکون سے سو رہے ہوں گے۔ وہ بھی، جس کے خوابوں نے میرا دماغ خراب کیا ہوا ہے۔ اور ایک میں ہوں کہ جاگ رہی ہوں۔"

وہ کچھ دیر یوں ہی بیٹھی رہی، پھر اپنے لیے چائے بنانے کی غرض سے کچن کا رخ کیا۔ ٹھیک سے نیند نہ آنے کی وجہ سے اب سر میں درد بھی محسوس ہو رہا تھا۔

کچن کے دروازے پر ہی اس ٹھٹک کر رکنا پڑا تھا۔ وہ کچن میں موجود تھا اور اس سے پہلے کہ وہ واپسی کے لیے مڑتی، اس نے پانی کی بوتل فریج میں رکھتے ہوئے اسے دیکھا۔

"واپس کیوں جا رہی ہو؟ کب سے انتظار کر رہا تھا تمہارا۔" اس کی بات پر وہ نہ صرف رک گئی تھی، بلکہ حیران بھی ہوئی تھی۔ غالباً" اسے اس پر کسی اور کا گمان ہوا تھا۔

"میں یامنہ ہوں۔۔۔ شاید تم کسی اور کا انتظار

کررہے تھے۔" وہ عادت کے مطابق بگڑے تاثرات کے ساتھ بولی تھی۔

"ہاں تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم مس یونیورس ہو۔ میری نظر اتنی کمزور بھی نہیں ہے۔ میں تمہارا ہی انتظار کررہا تھا۔ پتا تھا کہ ہمیشہ کی طرح تم کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح مجھ سے ملنے ضرور آؤ گی۔"

"تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا ہے۔ میں کیوں آؤں گی تم سے ملنے؟" وہ کچن کے اندر آکر دبی دبی آواز میں چیخی تھی۔

"یہ تو تمہیں ہی پتا ہوگا۔ مگر ہوتا تو یوں ہی آیا ہے۔ اب اگر تم اسے اتفاق کہو گی تو میں ہرگز یقین نہیں کروں گا۔ کیونکہ اتفاقات روزانہ نہیں ہوتے۔ ویسے اگر یہ اتفاق ہے بھی تو اس حسین اتفاق نے میرے دل کا چین، میرا سکون اور میری نیند سب کچھ چھین لیا ہے۔" وہ پٹڑی سے اتر رہا تھا۔ اور اس کی باتوں نے یامنہ کو بری طرح بوکھلا دیا تھا۔

"مائنڈ اٹ! میں نہیں تم آتے ہو ہمیشہ کچن میں میرے بعد۔ مجھے کبھی تم سے ملاقات کا کوئی شوق نہیں رہا ہے۔ ہر وقت سر پر سوار رہنا تمہاری عادت ہے، میری نہیں۔" وہ اسے کھری کھری سنا کر جانے کے لیے مڑی تھی، مگر ثامن نے اس کے سامنے آتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر جانے کا راستہ روک لیا۔

"ایسے نہیں، پہلے میری حکایت دل سنو گی، پھر جانے دوں گا۔"

"ثامن! پاگل ہوگئے ہو۔" ثامن کی نگاہیں اس کا انداز منٹوں میں اس کی زبان کی طراری گل کر گئے تھے۔

"یہ ہی سمجھ لو۔" وہ اس کی گھبرائی صورت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔

"ثامن پلیز! اتنے مہمان گھر پر ہیں، اگر کوئی آگیا۔۔۔ اور تم۔۔۔" وہ بری طرح اس کی نظروں سے گھبرا رہی تھی۔

"کیا میں۔۔۔ پہلے تو تم کبھی اس طرح پزل نہیں ہوئیں۔" وہ شرارت سے گویا ہوا تھا۔

"پہلے کی بات اور تھی۔"

"کیا تھی پہلے کی بات۔" اس کو مزا آنے لگا تھا۔

"پہلے۔۔۔ پہلے تم اتنے فضول نہیں تھے۔" وہ بھی شرم و حیا کو ایک طرف رکھ کر بولی تھی۔

"ارے، پہلے تو تمہیں مجھ سے بہت سی شکایتیں تھیں، اور تم کہہ رہی ہو کہ میں پہلے اتنا فضول نہیں تھا۔" وہ واقعتاً" حیران ہوا تھا۔

"ہاں تم جو میری امی پر قبضہ جما کر بیٹھے تھے۔" وہ دوبدو بولی تھی۔

"اب تو پہلے سے بھی زیادہ قبضہ ہوگیا ہے میرا اور اب تو تمہیں پتا چل گیا ہوگا کہ امی واقعی مجھے تم سب سے زیادہ چاہتی ہیں۔ مگر اس کا مطلب نہیں ہے کہ وہ تم سے اور امان سے محبت نہیں کرتیں، تم دونوں بھی انہیں اتنے ہی عزیز ہو۔" وہ سنجیدگی سے گویا ہوا تھا۔

"یہ سب باتیں میری سمجھ میں آچکی ہیں۔ غلط میں بھی نہیں تھی۔ تم واقعی امی، پاپا کی محبت کا زیادہ فائدہ اٹھاتے ہو۔ اب یہ ہی دیکھ لو، ہمارے خاندان میں شوبز میں جانے کا کوئی تصور تک نہیں کرسکتا تھا۔ مگر امی، پاپا نے تمہیں نہ صرف اجازت دی بلکہ کھلی چھوٹ بھی دی ہوئی ہے، کبھی کسی معاملے پر کوئی بازپرس نہیں کی۔ کسی اسکینڈل پر کوئی سوال و جواب تمہیں کیے کبھی۔" اس نے صاف گوئی سے ثامن کے سامنے اپنے ذہن میں کب سے موجود خیالات کا اظہار کیا تھا۔

"اس لیے کہ انہیں مجھ پر اور اپنی تربیت پر پورا اعتماد ہے اور اب ایسا ہی اعتماد تمہیں بھی مجھ پر کرنا پڑے گا۔"

"اونہہ! مجھے کیا ضرورت ہے اعتماد کرنے۔" وہ فوراً" ہی رخ موڑ کر چائے بنانے کے لیے کیبنٹ سے کیتلی نکالنے لگی تھی۔

"کیونکہ تمہارے اعتماد کی مجھے ضرورت ہے۔ تمہارے اعتماد کی بھی اور تمہاری محبت کی بھی۔" اپنی پشت پر اس نے ثامن کی نرم محبت سے پر آواز سنی تھی، مگر وہ پلٹی نہیں ثامن نے اسے کندھوں سے تھام کر اپنی طرف اس کا رخ کیا۔

"یامنہ! اگر میں کہوں کہ میں نے کبھی تمہارے علاوہ کسی کے بارے میں نہیں سوچا تو پلیز مجھے غلط مت سمجھنا۔ یہ بالکل سچ ہے کہ میں تمہارے معاملے میں بے بس رہا ہوں، میں نے تمہیں صرف اپنی کزن سمجھا۔۔۔ یامنہ! کچھ جذبے ایسے ہوتے ہیں جن کے آگے انسان بے بس ہوجاتا ہے اور محبت بھی ایک ایسا ہی جذبہ ہے اور جب۔۔۔ جب مجھے اس محبت کا ادراک ہوا تو یقین کرو، کتنے ہی دن میں خود کو لعنت ملامت کرتا رہا تھا۔ مگر جلد ہی مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس بھی ہوگیا تھا۔ تم بہرحال میری کزن تھیں اور بس۔۔۔ مگر اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد بھی مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں اپنی خواہش کا اظہار امی کے سامنے کرتا، جنہیں ہمیشہ میں نے اپنے دل کی ہر بات بتائی تھی۔

میں امی تو کیا، تمہارے سامنے بھی اس محبت کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔ یامنہ! صرف یہ ہی سوچتا تھا کہ پتا نہیں سب میرے بارے میں کیا سوچیں گے اور اگر تم اس روز غصے میں امان کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار نہ کرتیں اور میں سن نہ لیتا تو شاید آج یہ سب نہیں ہوتا۔ لیکن شکر ہے اس روز میں نے وہ سب سن لیا اور سکون کا سانس لیا۔ تمہارے خیالات میرے بارے میں چاہے جیسے بھی تھے مگر مجھے یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی کہ تم بھی مجھے صرف کزن ہی سمجھتی ہو۔ پھر میں نے امی سے بات کی اور یہ جان کر مجھے بھی حیرت ہوئی تھی کہ خالہ پہلے ہی امی سے اس سلسلے میں بات کرچکی تھیں۔

اور میری تو ہر خواہش امی پاپا نے پوری کی ہے، تو کیا میری یہ خواہش پوری کرکے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی نہ دیتے۔ وہ محبت جسے میں اپنے دل میں خود سے بھی چھپا کر رکھتا آیا تھا۔ وہ سب پر آشکار ہوگئی۔ مگر تم اب تک انجان بنی ہوئی ہو۔

اگر امی کو میری شادی ساری رسموں رواجوں کے ساتھ کرنے کا شوق نہ ہوتا تو یقین کرو یہ سب میں تمہیں شادی کے بعد ہی بتاتا، مگر اب مزید چار ماہ صبر نہیں کرسکتا۔ اس نے ایک جذب سے اپنا دل اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔ اور وہ سر جھکائے صرف سن رہی تھی۔ اس وقت اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھ لیتی۔

"یامنہ! کچھ تو کہو۔۔۔" اس کی خاموشی پر وہ بے چینی

سے بولا تھا۔ ”کم از کم اتنا ہی کہہ دو کہ تم مجھ سے محبت کرنے کی کوشش کرو گی۔“

وہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کی طرف ذرا سا جھکتا ہوا بولا تھا اور اس کے انداز پر یامنہ کی روح فنا ہو گئی تھی۔

”کرتی تو ہیں محبت تم سے ہزاروں لڑکیاں... اور وہ تمہاری ماہم، ثوبیہ اور جانے کون کون، جو تمہارے ساتھ تمہارے ڈراموں میں کام کرتی ہیں۔“ پھر نخوت سے بولی۔

”یامنہ! بری بات ہے یار... !تم جانتی ہو میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں اور اب تمہاری محبت میں اگر شوبز کو بھی چھوڑنا پڑے گا تو میں دے دوں گا اپنے شوق کی قربانی۔ اوکے! اب تو بولو کرو گی ناں مجھ سے محبت؟“ وہ اسے محبت کرنے کے لیے قائل کر رہا تھا۔

اور وہ اس کے پاگل پن پر اندر ہی اندر سرپیٹ کر رہ گئی۔

”کوئی آجائے گا۔ پلیز!“ وہ نروس ہو کر بولی تھی۔

”تو آنے دو میں ڈرتا ہوں کسی سے' اپنے گھر میں اپنی بیوی کے ساتھ کھڑا ہوں...“

”اوکے ہم مجھے جانے دو... میرا تم سے وعدہ ہے ضرور محبت کروں گی تم سے اب جانے دو پلیز۔“ وہ زچ آکر غصے سے بولی تھی۔

”کیا کرو گی جا کر سوؤ گی اور یقیناً“ میرے ہی خواب دیکھو گی' تو خواب کے بجائے حقیقت میں دیکھ لو...“ اس نے یونہی کہا تھا مگر وہ پوری آنکھیں کھولے حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

پھر چند قدم آگے بڑھ کر رک گئی' پھر پلٹ کر اس کی جانب دیکھا وہ کیبنٹ کے ساتھ ٹیک لگائے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ثامن! کیا تم نے کبھی مجھے خواب میں دیکھا ہے؟“ عجیب سوال تھا۔

”ہاں بہت دفعہ... کبھی بند آنکھوں سے' کبھی کھلی آنکھوں سے' صرف تمہارے ہی خواب دیکھے ہیں۔“ وہ ترنگ میں بولا تھا۔

سگمنٹ فرائیڈ کہتا ہے ”خواب ذہن کی پیداوار ہیں' خواب تسکین خواہشات یا تکمیل آرزو کے لیے بھیس بدلی ہوئی کوششیں ہیں۔“ مگر سچ بتاؤں میں نے ہمیشہ اپنے خوابوں میں صرف تمہیں ہی دیکھا ہے۔ اور دیکھ لو میرے وہ سارے خواب تعبیر بھی پا چکے ہیں شاید وہ خواب میری سوچوں کا عکس ہوں یا پھر اللہ کی طرف سے کوئی اشارہ... ویسے تم نے دیکھا ہے کبھی مجھے اپنے خواب میں۔“ وہ اب اس سے سوال کر رہا تھا۔

”تمہارے خوابوں نے میرا جینا محال کیا ہوا ہے۔“ وہ اسے اپنے دل کی خبر نہیں دینا چاہتی تھی روانی میں بول کر پچھتانے لگی۔

ثامن کی آنکھوں کی چمک میں حیرت اور خوشی کے رنگ نمایاں ہونے لگے۔

”یامنہ تم... !“ اس سے پہلے کہ وہ سب کچھ سمجھ کر درمیانی فاصلہ عبور کرکے اس کے قریب آتا۔ وہ مسکراتی کچن سے بھاگ گئی۔

ثامن نے ایک انوکھی بے پایاں خوشی اپنے اندر پھیلتی محسوس کی تھی اور یامنہ... اسے آج اپنے تمام خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی۔ ثامن کی محبت بھی اس کے لیے ایک ایسی حقیقت تھی' جسے تسلیم کرتے ہوئے وہ ہمیشہ مختلف سوچوں اور خدشوں کا شکار ہو جاتی تھی۔ اس محبت کو تو وہ خود سے بھی چھپا کر اپنے دل میں رکھتی آئی تھی مگر۔ خود کو اس کے خواب دیکھنے سے روک نہیں پائی تھی۔ وہ ان خوابوں پر چاہ کر بھی پابندی لگا پائی تھی۔

وہ بھی یہی سوچ رہی تھی کہ یہ خواب اس کی سوچوں کا عکس تھے یا اللہ کی طرف سے کوئی اشارہ... جو بھی کچھ تھا اتنا تو اسے یقین ہو چکا تھا کہ ثامن اور اس کا ساتھ اوپر آسمانوں پر طے تھا۔

وہ وضو کرکے اپنے رب کے حضور سربسجود ہو گئی تھی۔ خواب کے اس سفر میں اب وہ تنہا نہیں تھی۔ ثامن بھی اس کے ہمراہ تھا' اور اب تاعمر دونوں کو ساتھ ہی رہنا تھا۔

☆

درد کا سلسلہ مسلسل ہے
ضبط کا حوصلہ مسلسل ہے

زندگی بے ثبات لگتی ہے
وقت ٹھہرا ہوا مسلسل ہے

وہ مجھے چھوڑ گیا ہے لیکن
دعا کا رابطہ مسلسل ہے

پاس اتنا کہ مثل رگ جاں ہے
دور اتنا کہ ایک فاصلہ مسلسل ہے

سامنے ہے مگر نگاہ پیاسی
دل میں اک کربلا مسلسل ہے

قلم دل سے صفحہ یاد پر
لفظ اک ہی لکھا مسلسل ہے

لوٹ آئے گا سر شام کبھی
دل کو اک آسرا مسلسل ہے

اُمِ ثمامہ

حسن ناراض کو مشورہ

محبت لوٹ سکتی ہے
اگر ہم ایک دوجے کو انہی معصوم نظروں سے پکاریں
جن سے پہلی بار دیکھا تھا
اگر مل بیٹھ کر دونوں
غلط فہمی کی کالی رات سے باہر نکل آئیں
تو گویا دن نکل آئے
ہم اب بھی خوبصورت ہیں
ہمارے زرد چہروں
دکھ بھری آنکھوں میں اب بھی حسن بستا ہے
جو ہم رخصت کریں ان تلخ باتوں کو
تو وہ شیریں بیانی خود بخود آئے گی
جو پہلے پہل دونوں کے لہجوں میں
محبت بن کے آتی تھی
ادھر دیکھو! یہ رستہ اب بھی پیارا ہے
نئے وعدوں کی انگلی تھام کر پھر چل پڑیں
چلتے چلے جائیں...
محبت راستہ ہے
اس میں پھولوں، تتلیوں اور جگنوؤں کے قافلے
اب تک ہمارے منتظر ہیں
اب بھلا ڈالو گلے مل کر گلے
شکووں سے دامن جھاڑ لو
پہلے قدم پر ہی محبت لوٹ آئے گی!

شہزاد نیر

شگفتہ جاہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جب کوئی عورت اپنے گھر کے کھانے میں سے کچھ خیرات کرے بشرطیکہ خرابی کرنے کی نیت نہ ہو تو عورت کو بھی خیرات کرنے کا ثواب ملے گا۔ جیسے خاوند کو اس مال کے کمانے کی وجہ سے اور خزانچی کو بھی اتنا ہی۔ اور کسی کا ثواب دوسرے کے ثواب کو کم نہیں کرے گا۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا،

، تم دوست سے ایسا رویہ اپناؤ جیسے کہ تم اس کے غلام ہو لیکن یاد رکھنا یہ رویہ اس سے رکھو جو اس کے لائق ہے۔
، جو شخص کسی کی مدد کرنے سے اپنا ہاتھ روک لیتا ہے تو اس کی اپنی مدد کے لیے بڑھنے والے ستر ہاتھ رک جاتے ہیں۔
، زندگی کے ہر موڑ پر صلح کرنا سیکھو کیونکہ جھکتا وہی ہے جس میں جان ہو اکڑنا تو مردے کی پہچان ہے۔

مشورہ،

ایک اشاعتی ادارے کے مالک کو ایک عورت نے خط لکھا۔
"میری شادی کو دس سال ہو گئے ہیں اور میرے سات بچے ہیں۔ میں بچوں کی پیدائش کے بارے میں ایک کتاب لکھنا چاہتی ہوں۔"
پبلشر نے جواب میں لکھا۔ "میرا مشورہ ہے کہ آپ اس موضوع پر کچھ لکھنے کے بجائے کچھ پڑھیں۔"

نمرہ، اقراء۔ کراچی

اقوال زریں،

※ ہر ناکامی کے دامن میں کامیابی کے پھول ہوا کرتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ہم کانٹوں میں الجھ کر نہ رہ جائیں۔
(سقراط)
※ برا آدمی اچھائی میں بھی برائی تلاش کرتا ہے۔ جیسے مکھی سارے جسم کو چھوڑ کر زخم پر ہی آ کے بیٹھتی ہے۔
(افلاطون)
※ خاموش انسان، خاموش پانی کی طرح گہرے ہوتے ہیں۔ خاموشی خود ایک راز ہے اور ہر صاحب اسرار خاموش رہنا پسند کرتا ہے۔
(واصف علی واصف)
※ اگر کیفیت یا یکسوئی نہ بھی میسر ہو تو بھی نماز ادا کرنی چاہیے۔ نماز فرض ہے، کیفیت فرض نہیں۔
(واصف علی واصف)

صومیہ۔ ہری پور

جانوروں کی عمریں،

٭ ہاتھی کی عمر سو سال ہوتی ہے۔
٭ شیر کی عمر ستر سال۔
٭ ریچھ کی عمر پچاس سال
٭ اونٹ کی عمر پچاس سال
٭ بندر کی عمر بتیس سال
٭ مگرمچھ چار سو سال
٭ گھوڑے کی عمر سولہ سال
٭ کتے کی عمر آٹھ سال

پروین ولی محمد۔ حیدر آباد

دادِ تحسین،

ون ڈے کرکٹ میچ ختم ہونے کے بعد منیجر نے ایک کھلاڑی کو بلایا اور شاباشی دیتے ہوئے کہا۔
"تم بہت اچھا کھیلتے ہو۔"
کھلاڑی نے جھجکتے ہوئے کہا۔
"شکریہ سر! مگر میں تو سمجھ رہا تھا کہ خاصا خراب کھیلا ہوں۔"
منیجر نے دوبارہ شاباش دیتے ہوئے کہا۔
"نہیں نہیں... تم مخالف ٹیم کے حق میں بہت اچھا کھیلے ہو۔"

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

تکبر،

اگر انسان کو تکبر کے بارے میں اللہ کی ناراضی اور سزا کا علم ہو جائے تو وہ بندہ صرف فقیروں اور غریبوں سے ملے اور صرف مٹی پر بیٹھنا پسند کرے۔
(حضرت علیؓ)

پارسائی،

سیاسی لیڈر جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اپنے اخلاق اور اعلا کردار کے بارے میں بتا رہا تھا
"اس شہر میں فحاشی کے درجنوں اڈے ہیں۔ آپ میری شرافت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ میں نے ان میں سے ایک میں قدم نہیں رکھا۔"
"وہ ایک اڈہ آج صبح ہی کھلا ہو گا۔" مجمع میں سے آواز آئی۔

عائشہ۔ گوجرہ

خوش فہمی،

انسان صرف ایک پیدائشی غلط فہمی کا شکار ہے کہ ہمیں اس دنیا میں صرف خوش رہنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔
(شوپن ہار)

تہذیب کی بنیاد،

وہ شخص جس نے سب سے پہلے اپنے دشمن کی طرف کوئی ہتھیار پھینکنے کے بجائے دشنام طرازی کی، سب سے پہلا شخص تھا جس نے تہذیب کی بنیاد رکھی۔
(فرائیڈ)

کہانی پرانی دور نیا،

پرانی کہانی ہے کہ ایک دفعہ ٹوپیاں بیچنے والا ایک آدمی سستانے کے لیے ایک درخت کے نیچے لیٹا تو درخت کے اوپر موجود بندروں نے اس کی ساری ٹوپیاں اٹھا کر پہن لیں۔
آدمی کو معلوم تھا کہ بندر انسانوں کی نقل کرتے ہیں لہٰذا اس نے اپنے سر کی ٹوپی اتار کر زمین پر پھینک دی۔ حسب توقع بندروں نے بھی اپنی اپنی ٹوپی زمین پر پھینک دی۔
آدمی نے اپنی ٹوپیاں اکٹھی کیں اور مسکراتا ہوا چل پڑا۔ گھر پہنچ کر اس نے یہ قصہ اپنے پوتے کو سنایا۔
وقت گزرتا گیا۔ پھر یوں ہوا کہ پوتا بڑا ہو کر ٹوپیاں بیچنے لگا۔ ایک دفعہ وہ بھی اپنی ٹوپیاں رکھ کر درخت کے نیچے سستانے کو لیٹا تو اس درخت پر موجود بندر ٹوپیاں اٹھا کر درخت پر چڑھ گئے۔ لڑکے کو اپنے دادا کی کہانی یاد آ گئی۔ اس نے بھی اپنی ٹوپی زمین پر پھینک دی۔ مگر یہ کیا... ایک بندر درخت سے نیچے اترا لڑکے کی ٹوپی اٹھائی، درخت پر چڑھا اور لڑکے سے بولا۔
"تمہارا کیا خیال ہے، کیا ہمارے دادا ہمیں کہانی نہیں سناتے ہوں گے؟"

نمرہ، اقرا۔ کراچی

حضرت امام غزالیؒ

، لوگوں کی نیکیوں کو ظاہر کرنا چاہیے اور برائیوں سے چشم پوشی لازم ہے۔
، جو کچھ اللہ کریم نے حکم دیا ہے۔ اس کی تعمیل کرنے سے۔ جن کاموں سے اللہ کریم نے منع فرمایا ہے ان سے باز رہنا ہی تقویٰ ہے۔

و، تمسخر اکثر قطع دوستی، دل شکنی اور دشمنی کا باعث ہوتا ہے۔ اس سے دل میں حسد پیدا ہوتا ہے۔

و، بعض لوگ توکل کے معنی یہ لیتے ہیں کہ حصول معاش کی کوشش اور تدبیر نہ کریں مگر یہ خیال جاہلوں کا ہے۔ کیونکہ شریعت میں سراسر حرام ہے۔

و، رات سونے سے قبل سارے دن کے اعمال، افعال پر غور کرو۔

نوال افضل گھمن۔ گجرات

شیکسپیئر نے کہا،

"جب کبھی میں اپنے دوستوں کو یاد کرتا ہوں تو آسمان کی طرف دیکھتا ہوں۔ بے شک میں انہیں وہاں دیکھ نہیں سکتا مگر میں خوشی محسوس کرتا ہوں کہ "ہم" ایک ہی آسمان کے نیچے ہیں۔"

فریحہ شبیر۔ شاہ نکڈر

ماہرانہ رائے،

بین الاقوامی ٹورنامنٹ کے سلسلے میں اسکواش کا ایک میچ ہو رہا تھا۔ کمنٹیٹر کہہ رہا تھا۔

"ناظرین باوجود پانچ منٹ گزرنے کے دونوں کھلاڑی ابھی تک کوئی پوائنٹ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ آیئے اس کی وجہ ہم اپنے ماہر سے پوچھتے ہیں۔"

"صاحب! اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میچ اب تک شروع ہی نہیں ہوا۔ دونوں کھلاڑی پریکٹس کر رہے ہیں۔" ماہر نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

رضیہ طاہر۔ گوجرانوالہ

روشن حرف،

- کبھی آپ دوسروں کے لیے دل سے دعا مانگ کر دیکھیں آپ کو کبھی اپنے لیے مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔
- لفظوں کے دانت نہیں ہوتے لیکن یہ کاٹ لیتے ہیں اور اگر یہ کاٹ لیں تو پھر ان کے زخم زندگی بھر نہیں بھرتے۔
- صبر ایسی سواری ہے جو اپنے سوار کو کبھی گرنے نہیں دیتی نہ اپنے قدموں سے اور نہ کسی کی نظروں سے۔
- جب کسی انسان کے آگے روشنی ہوتی ہے تو اس کا سایہ پیچھے آتا ہے اور روشنی پیچھے ہوتی ہے تو اس کا سایہ آگے آتا ہے۔ دین روشنی ہے اور دنیا سایہ دین کو آگے رکھو گے تو دنیا خود پیچھے آئے گی اور دین کو پیچھے رکھو گے تو دنیا آپ سے آگے بھاگے گی۔

رضوانہ شکیل لڈو۔ لودھراں

احتیاط،

امریکی فوج کا ایک نیا کمانڈر کیمپ کی واٹر سپلائی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے متعلقہ سارجنٹ سے پوچھا۔

"پانی کو آلودگی اور جراثیم سے محفوظ رکھنے کے لیے آپ کیا کرتے ہیں؟"

"جناب!" سارجنٹ نے جواب دیا۔ "ہم سب سے پہلے پانی خوب ابال لیتے ہیں۔"

"بہت خوب۔" کمانڈر نے تعریفی انداز میں کہا۔

"پھر ہم اس پانی کو نتھار لیتے ہیں۔" سارجنٹ نے مزید تفصیل بتائی۔

کمانڈر نے مزید اطمینان کے اظہار میں گردن ہلائی۔

"مگر پھر بھی۔" سارجنٹ نے بالآخر کہا۔ "ہم سب احتیاطاً اس پانی کے بجائے بیئر ہی پیتے ہیں۔"

ندا، فضہ۔ کراچی

بکھرے موتی،

- اگر راستہ خوبصورت ہے تو پتا کرو کہ کس منزل کو جاتا ہے لیکن اگر منزل خوبصورت ہے تو راستے کی پروا مت کرو۔
- دوستی کے بعد محبت ہو سکتی ہے مگر محبت کے بعد دوستی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ دوا موت سے پہلے ہی اثر رکھتی ہے۔ موت کے بعد نہیں۔

فریحہ شبیر، شاہ نکڈر

خالدہ جیلانی

آسیہ جاوید ــــــــ علی پور چٹھہ

خود کلامی عجیب ہوتی ہے
خود سے باتیں اور آپ کی باتیں

رضیہ طاہر ــــــــ کراچی

یہ بھی اک خواب کا جاگا ہوا منظر ہی نہ ہو
تیرے ہاتھوں میں میرا ہاتھ کہاں ممکن ہے

صدف محمود ــــــــ سرگودھا

پھر اسی راہگزر پر شاید
ہم کبھی مل سکیں مگر شاید
جن کے ہم منتظر رہے ان کو
مل گئے اور ہم سفر شاید

فائقہ خالد ــــــــ گوجرانوالہ

تمام عمر تم کو ہی چاہا ہم نے
تم نے ہم کو بھی پارسا رکھا

صبا چاندنی ــــــــ بہاول پور

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

گڑیا شاہ ــــــــ کہروڑ پکا

سحر سے پوچھ لو محسن
کہ ہم سویا نہیں کرتے

ریحانہ اچکزئی ــــــــ ڈی آئی خان

اس دل میں ذرا تم بیٹھو تو کچھ حال ہمارا پوچھو تو
ہم سادہ دل ہیں اشک مگر ہر بات پرانی کہہ دیں گے

سعدیہ ریاض ــــــــ کراچی

دل کے رشتے بھی عجیب ہوتے ہیں
سانس لینے سے ٹوٹ جاتے ہیں

ملیحہ طاہر ــــــــ نامعلوم شہر

حساب عمر کا بس اتنا سا گوشوارہ ہے
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارہ ہے

بشریٰ ذوالفقار ــــــــ فیصل آباد

بھولا تو نہ ہو گا تجھے سقراط کا انجام
ہاتھوں میں تیرے ساغرِ سم ہے تو مجھے کیا
میں سرمد و منصور بنا ہوں تیری خاطر
یہ بھی تیری امید سے کم ہے تو مجھے کیا

اُم عمیرہ ــــــــ کراچی

سانجھ کی چھاؤں میں تیری چھایا
ڈھونڈتی جائے داسی
بھرے ماگھ میں کھوجے تجھ کو
تن درشن کی پیاسی

سائرہ حزب الرحمان ــــــــ صوابی

ناصر یہ وفا نہیں جنوں ہے
اپنا بھی نہ خیر خواہ رہنا

نجمہ فاروق ــــــــ رجانہ

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

نوال افضل گھمن ــــــــ گجرات

تمام عمر اسی کے خیال میں گزری فراز
میرا خیال جسے عمر بھر نہیں آیا

آمنہ اُجالا ــــــــ ڈہرکی

اتنی آباد مگر پھر بھی ہے سنسان قتیل
جانے کس چیز سے محروم رہی ہے دنیا

صدف نازش ــــــــ معظم آباد

وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا، بتاؤ کیسا لگا؟
پرانے زخموں کو چھوڑو، یہ گھاؤ کیسا لگا؟
عجب سوال کیا آندھیوں نے پتوں سے
شجر سے ٹوٹ کے گرنا، بتاؤ کیسا لگا؟

بشریٰ باجوہ ——— اوکاڑہ

زندگی شاید اسی کا نام ہے
دُوریاں، مجبوریاں، تنہائیاں

پرحہ احمد ——— بدین

کمال کا پیمبر ہے عشق
چھوڑ دیتا ہے مرید کر کے

شمع مسکان ——— جام پور

وہ یوں ملا جیسے کبھی ملا ہی نہ تھا
ہماری ذات پہ جس کی عنایتیں تھیں بہت
ہمیں خود اپنے ہی یاروں نے کر دیا رسوا
کہ بات کچھ بھی نہ تھی اور وضاحتیں تھیں بہت

حنا سلیم اعوان ——— آخون بانڈی

ہم بھی خزاں کی شام کا آنگن ہیں بے چراغ
بیلیں ہیں جس کی زرد وہ دالان تم بھی ہو

رضوانہ شکیل راؤ ——— لودھراں

مجھے حیرت ہے میرے پاس کچھ بھی نہیں بچتا
میں اپنی ذات سے جب بھی تمہیں تفریق کرتا ہوں

اقصیٰ نصرت ننگاہ ——— گوجرانوالہ

قیامت خیز منظر گو ہزاروں ہم نے دیکھے ہیں
جو دل پر ٹوٹتی ہے وہ قیامت اور ہوتی ہے

ایمن فاطمہ ——— گوجرانوالہ

اپنی تقدیر میں تو کچھ ایسے ہی سلسلے ہیں فراز
کسی نے بھول کر دوستی کر لی تو کوئی دوستی کر کے بھول گیا

مسرت الطاف احمد ——— کراچی

سب وا ہیں دریچے تو ہوا کیوں نہیں آتی
چپ کیوں ہے پرندوں کی صدا کیوں نہیں آتی
گل کھلنے کا موسم ہے تو پھر کیوں نہیں کھلتے
خاموش ہیں کیوں پیڑ، صبا کیوں نہیں آتی

صبا طارق ——— گوجرانوالہ

زندگی جس کے دم سے ہے ناصر
یاد اُس کی عذابِ جاں بھی ہے

مہوش ڈوگر ——— گوجرانوالہ

زمانے بھر میں رسوا ہوں مگر اے ولئے نادانی
سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

حنا کنول ——— حویلی لکھا

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے، دل کو سودا ہے جستجو کا

آمنہ اُجالا ——— ڈہرکی

انسان کی پرکھ میں ہے، سو بھول کا اندیشہ
اپنوں کو عجلت میں اپنا نہ کہا جائے
دیتی ہے قتیل اکثر چہروں کی چمک دھوکا
ہر کانچ کے ٹکڑے کو ہیرا نہ کہا جائے

صائمہ جبیں ——— کراچی

سکون کی اک سانس کی فرصت نہیں ملتی
اس شہر میں جینے کی اجازت نہیں ملتی
کتنے بے مہر مزاج کے مالک ہیں یہاں لوگ
اپنی تو کسی سے بھی طبیعت نہیں ملتی

نمرہ، اقرا ——— کراچی

دل بھی کیا چیز ہے اب پا کے اسے سوچتا ہے
کیا اسی واسطے چھانے تھے بیاباں بہت
اس کو بھی لگ ہی گئی ہے شہرِ محبت کی ہوا
وہ بھی امجد ہے کئی دن سے پریشان بہت

حرمت ردا اکرم ——— ڈلوال

خاک اڑتی ہے رات بھر مجھ میں
کون پھرتا ہے دربدر مجھ میں
مجھ کو مجھ میں جگہ نہیں ملتی
وہ ہے موجود اس قدر مجھ میں

فارحہ اقبال ——— کراچی

دشت میں سفر ٹھہرا پھر میرے سفینے کا
میں نے خواب دیکھا تھا برف کے پگھلنے کا
دھوپ کی تمازت تھی موم کے مکانوں پر
اور تم بھی لے آئے سائباں شیشے کا

فوزیہ سعید ——— کراچی

تفصیل سے کیسے سنائیں یہ قصہ محبت کا
کہ تم مصروف ہو اب تک ہمیں برباد کرنے میں

● نمرہ، اقرا ● کی ڈائری سے

محسن نقوی کی یہ نظم نیند کی پیاسی ان آنکھوں کے نام جو انجانے میں رت جگوں کا انتخاب کر بیٹھیں۔

اب سو جاؤ... کیوں رات کی ریت پر بکھرے ہوئے
تاروں کے کنکر چنتی ہو
کیوں سناٹے کی سلوٹ میں لپٹی آوازیں سنتی ہو
کیوں اپنی پیاسی پلکوں کی جھالر میں
خواب پروتی ہو
کیوں روتی ہو
اب کون تمہاری آنکھوں میں
صدیوں کی نیند انڈیلے گا؟ اب کون تمہاری چاہت کی
ہریالی میں کھل کھیلے گا

اب کون تمہاری تنہائی کا ان دیکھا دکھ جھیلے گا
اب ایسا ہے...!
یہ رات مسلط ہے جب تک، یہ شمعیں جب تک جلتی
ہیں
یہ سانسیں جب تک چلتی ہیں، تم اپنی سوچوں کے جنگل
میں رہ بھٹکو
اور پھر کھو جاؤ... اب سو جاؤ...!

● نوشین اقبال نوشی ● کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ نظم جو مجھے بہت پسند ہے، آپ سب قارئین کی نذر۔

کہو وہ چاند کیسا تھا؟
جدھر سب کچھ لٹا آئے
جدھر آنکھیں گنوا آئے
کیا سیلاب جیسا تھا
بہت چاہا بچ نکلیں
مگر سب کچھ بہا آئے
کہو وہ، ہجر کیسا تھا؟
کبھی چھو کر اسے دیکھا
تو تم نے کیا پایا بھلا؟
کہا بس آگ جیسا
اسے چھو کر تو اپنی روح
یہ تن من جلا آئے
کہو وہ چاند کیسا تھا؟
فلک سے جو اتر آیا
تمہاری آنکھوں میں بسنے
کیا وہ خواب جیسا تھا
نہیں تعبیر تھی اس کی
اسے اک شب سلا آئے
کہو وہ عشق کیسا تھا؟
بنا سوچے بنا سمجھے، بنا پرکھے، کیا تم نے
کہا تتلی کے رنگ جیسا
بہت کچا انوکھا سا
جبھی اس کو بھلا آئے
کہو وہ نام کیسا تھا
جسے صحراؤں اور چنچل ہواؤں پر
لکھا تم نے
کہا بس موسموں جیسا
نجانے کس گھڑی کس پل
کس رو میں مٹا آئے...!

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

عائشہ ندیم شیخ..... پیر محل

سب سے پہلے سرورق دیکھا واہ واہ سبحان اللہ۔ "فرخندہ انجم" کے خط کے جواب میں رسپانس بہت اچھا لگا میں بھی حنا زین۔ (واہ کینٹ) سے متفق ہوں اور ہم نئی نسل سے مجھے یقین ہے %95 لڑکیاں یہی جواب دیں گی۔ فواد خان سے ملاقات کا مزہ آگیا۔ سائرہ یوسف کی سمائل سب سے الگ سی ہے۔

اب تحریروں پہ بات چیت ہو جائے "کوہ گراں" ہمیشہ کی طرح پرفیکٹ سعد اور سارہ کی کیمسٹری ہی اچھی ہے۔ ماہ نور اور سعد اچھا کپل لگا۔ فلزا ظہور البتہ نیا معمہ ہے۔ "فرحین اظفر" نیا اضافہ ہیں کیا؟ بہار کی دستک اچھا لگا۔ "مریم ساجد" ہاہاہا آنگن میں اترے چاند وہ بھی "سات سات" واہ جی۔ فائزہ' عائزہ نے خوب ہنسایا۔ فہد صاحب کی اس قدر خود فراموشیاں.....؟ یا اللہ کوئی اپنی اکلوتی بیوی کو بھی بھول سکتا ہے؟ عید گفٹ تھا مریم جی شکریہ! نگہت عبداللہ نجانے اب کیا کرنے والی ہیں سارہ اور اریبہ کے ساتھ۔ ایک بات یاد آئی اپیا جولائی میں ہمارے ساتھ ہاتھ ہو گیا مطلب منتوں مرادوں کے ساتھ ملنے والا خواتین ڈائجسٹ جب "ساری بھول" تک پہنچے تو پہلے چار صفحوں کے علاوہ باقی تحریر غائب "کوہ گراں" دو دفعہ پڑھنے کو ملا (افسوس)۔ ہمارے ہاتھ 2005ء اور 2004ء کے خواتین لگے تو جناب راحت جبیں کو "ان روز و شب" میں پڑھا۔ بہت اچھا تھا ان کا طرز تحریر۔ وہی موسموں کی چھب' وہی بہاروں کی ترنگ میں اڑنے والی خوب صورت اور حساس سی راحت۔ جس نے بتایا کہ وہ خواب بھی دیکھتی ہے اور حقیقت میں بھی رہتی ہے۔ (اپیا پھر سے یہ سلسلہ شروع کریں ناں..... پلیز) "ساری بھول ہماری تھی" کے لیے خراج۔

مانی نہ میری ایک بھی ' خود سر ہے تو اے دل
اب خود ہی بھگت ' میں تو تیرا کچھ نہیں لگتا

فرحت کے ناول میں مجھے نہیں لگتا زین باپ کا اتنی جلدی اعتبار کرے گا۔ نفرت کا ایک طویل دور طے کیا ہے۔ اس نے "لال چادر" عجیب سا لگا۔ اور "چاند میرے دریچے میں" "عید گفٹ دوسرے نمبر پر تھا۔ شرمین کی شرارتیں مزہ دے گئیں۔ بیچ میں آسیہ جی تسی بوت چنگا لکھیا۔ "نائلہ صدف" نے لکھا کہ "واپسی کے مطالبے کے ساتھ" "مگر میں تو یہ بھی کہتی ہوں کہ حفاظت کرنا' مجھے میرے ڈائجسٹ بہت عزیز ہیں۔ بہت پرانے ڈائجسٹ آج بھی میرے پاس اصلی حالت میں محفوظ ہیں۔ مگر اب محفوظ نہیں رہتے۔ آپ کہہ دیں ناں پلیز.....! اقراء شفقت وفا کی شاعری اچھی تھی۔ سورٹھ ساند کے انتخاب کو مس کرتے ہیں ہم انیسہ سلیم کہاں ہیں آپ؟ ثمرہ بخاری! جوادی اور شیلی بھی غائب ہیں؟ ماہا ملک' عالم شاہ جیسا کوئی کردار نہیں ملا دوبارہ؟ مجموعی طور پر اگست کا شمارہ پرفیکٹ تھا۔

ج پیاری عائشہ! آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔ ہمیں افسوس ہے جولائی کا شمارہ آپ نہ پڑھ سکیں اگر ہمیں پرچا دی پی کر دیتیں۔ تو ہم آپ کو وہ شمارہ بھجوا دیتے۔

نوشین فاطمہ..... کراچی

خواتین ڈائجسٹ سے میرا ناتا تقریباً" بیس برس پرانا ہے جب میں خود نوعمر تھی لیکن آج بھی جب ڈائجسٹ آتا ہے تو میں دنیا و مافیہا سے بے خبر آدھی رات تک ڈائجسٹ میں گم رہتی ہوں۔ میری آٹھ سالہ بیٹی بختاور پوچھتی ہے' مما! آخر ان ڈائجسٹوں میں ہے کیا جو آپ اتنے شوق سے پڑھتی ہیں؟ اب میں اسے کیا بتاؤں کہ میں نے ان ڈائجسٹوں سے زندگی برتنے کے کتنے ڈھنگ سیکھے ہیں۔ وہ کچھ سیکھا کہ جن کو سکھانے کے لیے ایک زندگی کے محدود تجربے ناکافی ہوتے ہیں۔ میں شروع سے ہی کراچی میں پلی بڑھی اور کبھی کسی گاؤں جانے کا اتفاق نہ ہوا مگر آپ کی کہانیوں سے میں نے دیہات کی زندگی اور رہن سہن کا مطالعہ کیا۔

اب آتے ہیں تبصرے کی جانب ٹائٹل میں ماڈل کی جیولری اچھی لگی۔ فواد خان اور سائرہ یوسف جو آج کل اسکرین پر چھائے ہوئے ہیں ان کا انٹرویو اچھا لگا۔ فرحت اشتیاق کا تو نام ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ بشریٰ جی کی "کہانی ایک گھر کی" "نہیں بلکہ ہر دوسرے گھر کی کہانی ہے۔ ہلکا پھلکا کامیڈی ٹچ لیے ہوئے "آنگن میں اترے چاند" بھی اچھا تھا۔ عنیقہ کا افسانہ "لال چادر" گو کہ ایک عام سا موضوع تھا لیکن انداز متاثر کن لگا۔ موسم کے پکوان میں گلاب جامن کی ترکیب دے کر تو آپ نے میری دیرینہ آرزو پوری کر دی۔ مہندی کے ڈیزائن بالکل معیاری نہیں تھے۔

ج پیاری نوشین! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ام ثمامہ..... جھڈو سندھ

آج سات ماہ بعد قلم اٹھایا ہے تو سوچتی ہوں کہ کیا لکھوں! موت کے ہاتھوں زندگی کے ہار جانے کا دکھ' کسی بہت اپنے بہت پیارے کے بچھڑ جانے کا دکھ' آنسوؤں اور انتظار سے لبریز آنکھیں چوکھٹ پر رکھ دینے کا دکھ' غلط فہمیوں' بدگمانیوں اور دوریوں کا دکھ' یا پھر ریت کی طرح مٹھیوں سے پھسل جانے والی خوشیوں کا دکھ.....

چودہ فروری کو محبت کے عالمی دن مجھے وہ شخص چھوڑ گیا جس سے میں عشق کرتی ہوں۔ میں بیس سال بعد ایک بار پھر یتیم ہو گئی۔ آج سے بیس سال پہلے جب میرے والد کا انتقال ہوا تھا تو بھائی نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا کہ آج سے میں تمہارا باپ ہوں اور پھر انہوں نے اس رشتے کو اس خوبی سے نبھایا کہ میں آج پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ دنیا میں میرے بھائی سے اچھا کوئی بھائی نہیں ہو گا۔

آفتاب لودھی مرحوم ہم تین بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے' صرف اڑتیس سال کی عمر میں وہ موٹر سائیکل ایکسڈنٹ میں انتقال کر گئے ان دا سپاٹ ان کی ڈیتھ ہو گئی انہوں نے ہمیں دعا مانگنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ خود وہ صرف سولہ سال کے تھے جب یتیم ہوئے اور اب اپنے دونوں بیٹوں ایان لودھی اور ارسلان جن کی عمریں صرف بارہ اور نو سال ہے کو بھی یہ دکھ دے گئے ہیں۔

میرا شہزادوں سی آن بان والا بھائی بہت کم بولا کرتا تھا۔ مگر اس کی دو چمکتی براؤن آنکھیں ہر دکھ سکھ' شوخی' شرارت بیان کر دیا کرتی تھیں میں اپنے اور ان کے تعلق کو لفظوں میں بیان کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر پاؤں گی امی اور بھابی کی آنکھوں میں گزشتہ چھ ماہ سے آنسوؤں کی جھڑی ہے جو رکنے کا نام نہیں لیتی ہے۔ ہم سب نے بہت اچھا وقت ایک ساتھ گزارا مگر اب ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ ہاتھوں سے ریت کی مانند پھسل گیا ہے اور خالی ہاتھوں میں صرف یادیں' دعائیں' آنسو اور روح چھوڑ رہ گیا ہے۔

دل کچھ پڑھنے اور لکھنے پر کسی طور آمادہ نہیں تھا مگر پھر خیال آیا کہ یہ سب پڑھ کر اگر کوئی صدق دل سے میرے بھائی کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے تو یہ خسارے کا سودا نہیں ہو گا۔

آپ لوگوں سے التماس ہے کہ میرے مرحوم بھائی آفتاب خان لودھی کے لیے سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص پڑھ کر ایصال ثواب کر دیں دعائے خیر بھی کہ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ ہم سب کے لیے صبر کی دعا اور بالخصوص میرے دونوں بھتیجوں کی لمبی عمر صحت سلامتی کامیابی اور نیکی کے لیے دعا کیجیے گا۔

ج پیاری ام ثمامہ! ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے بھائی کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اور آپ کے بھتیجوں کو کامیابی اور خوشیاں عطا کرے آمین۔

بشریٰ باجوہ۔۔۔۔ اوکاڑہ

خواتین 8 اگست کو ملا۔ ٹائٹل گرل کا لباس نیلے رنگ میں خوب سج رہا تھا لیکن آپ کوشش کیا کریں ہلکے پھلکے لباس میں لائٹ میک اپ اور جیولری ہو تو گرمیوں میں زیادہ اچھا لگتا ہے۔ سب سے پہلے راحت جبیں کا ناول پڑھا۔ بہت خوب صورت اور عمدہ اینڈ کیا راحت نے۔ اس کے بعد عنیزہ سید کی تحریر پڑھی واہ عنیزہ جی کیا تعریف کریں آپ کی۔ سعد' ماہ نور میرے فیورٹ کریکٹر ہیں۔ سائرہ یوسف سے ملاقات اچھی لگی۔ آنگن میں اترے چاند ہلکا پھلکا اور دل کو خوشی دینے والا ناول لگا۔ نگہت عبداللہ کے ناول میں اکثر بہنوں کی خواہش پوری ہو رہی ہے مطلب شمشیر کی ہیروئین اریبہ ہو۔ لال چادر سب افسانوں میں بازی لے گیا۔ آسیہ مقصود شاید نئی رائٹر ہیں' ناولٹ دلچسپ لگا' بشریٰ احمد کا افسانہ سبق آموز تھا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہم آنے والی بہو کو بھی پیار محبت اور تحفظ کا احساس دلائیں' فرحین اظفر اور نسرین خالد نے بھی اچھا لکھا۔ مجموعی طور پر سارا ڈائجسٹ ہی اچھا لگا۔

ج: پیاری بشریٰ! آپ کے اندازے صحیح ثابت ہوئے۔ مبارک باد' آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

مہوش ڈوگر۔۔۔۔ گوجرانوالہ

ٹائٹل سے لے کر عید کی تیاری تک شمارہ بہترین رہا۔ اس دفعہ انٹرویوز میں نئے نام نظر آئے۔ فواد خان اور سائرہ یوسف سے ملاقات اچھی رہی۔

"لال چادر" پڑھ کر بے اختیار جھرجھری لی۔ تنگ دل اور تنگ ذہن بانو کو اپنی کرنی کی بدترین سزا ملی۔ محبت زندگی ہے میں تمکین کا فیصلہ وقت کی ضرورت تھا۔

"کہانی ایک گھر کی" بس ٹھیک تھا۔ "بہار کی دستک" بے شک اللہ جب کوئی چیز واپس لیتا ہے تو اس سے زیادہ بہترین عطا کرتا ہے۔

"چاند میرے دریچے میں" اچھی تحریر تھی۔ ثانیہ اور شرمین کا بے دھڑک رشتے سے انکار کے لیے چلے جانا کچھ آکورڈ سا لگا اور پھر ان ہی محترم سے شرمین کی منگنی۔۔۔۔ حقیقت سے کچھ دور لگا۔ مگر بہرحال سچویشنز کو انجوائے کیا۔

مریم ساجد کا "آنگن میں اترے چاند" آؤٹ کلاس تحریر۔ مزا آگیا۔ قصر لائلہ کے سات عدد نمونوں کی کری ایٹ کردہ سچویشنز نے ہنسنے پر مجبور کردیا۔ رمضان اور عید کی تیاریاں' فہد کا الٹی کی چٹنی ریکارڈ کروانے کا طریقہ' چاند رات کو شہریار کا پکڑے جانا۔ آفاق کی شادی کا سن کر کرسیوں پر کھڑے ہو کر ڈانس کرنا۔ ہنسا ہنسا کر برا حال کر دیا۔ ٹوئنز کا بے وقوف بننا بھی مزا دے گیا۔

ایک بات نوٹ کی صبا قصر لائلہ ایک مرتبہ پہلے بھی آ چکی تھی اور اپنا آئی ڈی کارڈ وغیرہ وہاں بھول گئی تھی تو اس طرح تو بڑی آسانی سے فہد کو ڈھونڈ سکتی تھی اور جب وہ ماہ رخ کے ساتھ قصر لائلہ آئی تب بھی اسے کچھ یاد نہ آیا۔

آپی ہماری بہت سی رائٹرز غائب ہیں انہیں ڈھونڈ لائیں۔ فاخرہ جبیں' سعدیہ حمید چوہدری' نبیلہ ابر راجہ' راشدہ رفعت ان سے کچھ لکھوائیں کافی عرصے سے ان کی کوئی تحریر نہیں دیکھی۔

ج: پیاری مہوش! ایک سیلز گرل بہت سے گھروں میں جاتی ہے۔ اسے اتنے گھروں میں کہاں یاد رہ سکتا ہے کہ وہ کس گھر میں گئی تھی۔ جبکہ عموماً" اچھے علاقوں میں بنگلوں میں اتنی مماثلت ہوتی ہے کہ پتا یاد نہ ہو تو شناخت مشکل ہوتی ہے۔ آپ کی تعریف و تنقید ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

زوباش خان آفریدی۔۔۔۔ کراچی

اس ماہ کا شمارہ زبردست تھا۔ ٹائٹل بھی اچھا تھا۔ کہانیاں بھی سب اچھی تھیں البتہ جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو بہت اچھی تھی' راحت جبیں کا ساری بھول ہماری تھی بھی اچھا رہا مگر اینڈ میں تھوڑے بہت ڈائیلاگ اور رکھنے چاہیے تھے۔ عائشہ' مریم' عریشہ سب کے رول بہت اچھے تھے میری ایک ریکویسٹ ہے کہ ماہرہ خان کا انٹرویو شائع کریں اور ڈاکٹر قدیر خان کا بھی۔

ج: پیاری زوباش! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی فرمائشیں نوٹ کرلی ہیں' جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

صبا طارق۔۔۔۔ گوجرانوالہ

اس ماہ کا ٹائٹل بہترین تھا بہت اچھی لگ رہی تھی ماڈل۔ فواد خان سے ملاقات اچھی رہی۔ عنیزہ سید اور نگہت عبداللہ بہت اچھے طریقے سے ناول آگے بڑھا رہی ہیں اور فرحت اشتیاق کے ناول کے تو کیا ہی کہنے۔ اس دفعہ جو کہانی رسالے کی جان تھی۔ وہ تھی مریم ساجد کی "آنگن میں اترے چاند" اتنی اچھی کہانی لکھنے پر مریم جی کو مبارک باد۔ "ساری بھول ہماری تھی" کا بھی راحت جبیں نے اچھا اینڈ کیا اور افسانوں میں "لال چادر" پڑھ کے تو رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ جو کسی کا برا سوچتا ہے اس کے اپنے ساتھ ہی برا ہوتا ہے۔

ج: پیاری صبا! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ مریم ساجد کی ہلکی پھلکی شگفتہ تحریر کو ہماری قارئین کی اکثریت نے بے حد پسند کیا ہے دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

سیدہ نازیہ حسین۔۔۔۔ تاندلیانوالہ فیصل آباد

ٹائٹل بہت ہی خوب صورت تھا۔ تمام سلسلے وار ناولز بہت اچھے جارہے ہیں۔ راحت جبیں صاحبہ نے بہت خوب صورت اختتام کیا ناولٹ کا۔ میں نے پچھلے ماہ خط میں جوبات کی تھی یا سوال سمجھ لیں میرا خیال تھا اس کا جواب کوئی مستقل قاری بہن دے گی۔ ام مریم صاحبہ جواب ویں گی۔ یہ نہیں سوچا تھا۔ میری یہ بات صرف آپ رائٹرز کی تعریف تھی۔

نایاب جیلانی کو ایک پیغام کہ آپ کے نام کے ساتھ سیدوں خانوں اور مضبوط بیک گراؤنڈ کے لوگوں کی کہانیاں بہت بجتی ہیں۔ ان پہ ہی زیادہ لکھا کریں۔ آپ کے بھائی کا بہت افسوس ہوا تھا پھر اس کے بعد آپ نے بتایا نہیں کہ داد شاہ رہا ہوا یا نہیں۔

آپ سے ایک سوال ہے کہ کوئی ناول کتابی شکل میں منگوانے یا ڈائجسٹ کا خریدار بننے کے لیے منی آرڈر فارم کے ساتھ خط بھی لکھنا ہوگا۔

ج: پیاری نازیہ! منی آرڈر کے ساتھ خط لکھنا ضروری نہیں لیکن منی آرڈر فارم پر جو کتاب منگوانا چاہتی ہیں اس کا نام اور مصنف کا نام ضرور لکھیں اور اپنا صحیح ایڈریس بھی صاف صاف لکھیں تاکہ آپ کو کتاب بھجوائی جاسکے۔ نایاب جیلانی کے بھائی کے لیے ہم دعاگو ہیں آپ لوگ بھی ان کے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ نایاب کو خوشیاں عطا فرمائے۔ ان کی پریشانیاں دور کرے۔ آمین

صالحہ ام قصیٰ۔۔۔۔ میرپور آزاد کشمیر

ٹائٹل اچھا تھا اور بلیک بیک گراؤنڈ نے تو ٹائٹل کی خوب صورتی کو مزید دوبالا کردیا لیکن اگر کبھی کبھی قدرتی مناظر کی جھلک بھی واضح کی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ عنیزہ سید کے ناول کی یہ قسط بھی شان دار رہی۔ سعد نے آخر کار ماہ نور کے تجسس کو ختم کر ہی دیا۔ نگہت آپی کہانی کو بڑی خوب صورتی سے آگے کی طرف بڑھا رہی ہیں۔ شمشیر اریبہ کے باپ کو جو سزا دینا چاہتا تھا' وہ تو اسے مل گئی۔ لیکن اریبہ کے پیپر مس نہیں ہونے چاہئیں ورنہ اس کے اتنے سالوں کی محنت ضائع ہو جائے گی۔ ہمیں تو پہلے ہی لگتا تھا کہ اریبہ شمشیر کی دلہن بنے گی۔ راحت آپی کے ناولٹ کا بھی اینڈ اچھا ہو گیا۔ انہوں نے پوری کہانی میں ہر کردار کے تسلسل کو برقرار رکھا۔ ثوبان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ سفال گر اور اس کے بعد راحت آپی کے ناول نے ذرا بھی بوریت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ فرحت آپی کے ناول کی یہ قسط بھی اچھی رہی۔ مریم ساجد کے ناول نے ہمیں بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کردیا عمیر اور عزیر کی شرارتوں کا فائزہ اور عائزہ نے خوب اچھی طرح بدلہ لیا۔ ان کی چال

اعتذار

اس ماہ بہن فرحت اشتیاق کا ناول "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" موصول نہیں ہوا' اس لیے اس ماہ شامل اشاعت نہیں ہے۔

ان پر ہی الٹ دی اور اوپر سے فہد کی بھلکڑپن کی عادت نے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ پورا ناول ہی اچھا تھا آج کل کے دور میں دوسروں کو ہنسانا بھی نیکی کے زمرے میں آتا ہے۔ فرحین اظفر کا ناولٹ بھی اچھا تھا۔ آسیہ مقصود کا ناولٹ بھی پسند آیا۔ شرمین جیسی صاف گولڑکی کو ہر کوئی برا ہی سمجھے گا لیکن اس کے اندر کے اچھے انسان کو کوئی کوئی ہی سمجھتا ہے افسانوں میں سب سے اچھا عنیقہ محمد بیگ کا افسانہ لال چادر' سب سے اچھا رہا۔ کہانی ایک گھر کی نصیحت آمیز تھی۔ نسرین خالد کا افسانہ کچھ خاص متاثر نہیں کرسکا۔

ج صالحہ اور اقصیٰ! خواتین آپ کو پسند آیا۔ بہت شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں۔

بیناشاہ۔۔۔ ٹوپی(صوابی)

خواتین اور شعاع بہت ہی اچھے شمارے ہیں۔ اس لیے اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ "پڑھنے بیٹھوں تو ابھر آتی ہے ہر صفحہ پر بات کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی تصویر کوئی" ٹائٹل اس دفعہ بہت زبردست تھا۔ سب سے پہلے بڑھے "کرن کرن روشنی" کی طرف۔ ہمیشہ کی طرح دلوں کو منور کرنے والی احادیث مبارکہ..... راحت باجی آپ کا تو جواب نہیں "ساری بھول ہماری" کی اتنی زبردست اینڈنگ کی ہے کہ بس..... ہر کردار کو اپنی جگہ پر اتنے اچھے طریقے سے سمیٹ کیا۔ جیسے بکھرے مالا کے موتی پوری دل جمعی سے پروئے جاتے ہیں۔ یہ تحریر قارئین کو بہت عرصے تک یاد رہے گی۔ میرا فیورٹ ناول "جو بچے ہیں" اس دفعہ کافی تیز رفتاری سے محو سفر رہا۔ شہریار خان جو چار سالوں میں حقیقت سے باخبر ہے۔ وہ جدائی، دکھ غم اور سب سے زیادہ پچھتاووں کی آگ میں جل رہا ہے۔ پتا نہیں اسے معافی مل سکے گی یا نہیں؟ ام مریم اتنی بدکردار ہوگی، اس کا ہمیں اندازہ نہیں تھا۔ یہ سائیکی کیس لگتی ہے۔ "کہانی ایک گھر کی" بشریٰ احمد کی بہت اچھی تحریر تھی۔ اب آتے ہیں عنیزہ سید کے "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" اب کافی واضح ہوگیا ہے۔ میرے خیال میں ماہ نور اور سعد بہت قریبی رشتہ دار ہوں گے اور گانے والی شہناز نامی عورت سعد کی ماں ہوگی۔ رہی بات سارہ کی تو آج پتا چلا کہ سرکس میں کرتب دکھانے والے لوگ دوسروں کو خوش کرنے کے لیے چند سکوں کے عوض کتنی اذیت سے گزرتے ہیں۔ ان کی زندگی اور موت صرف ایک لمحے کی بھول پر منحصر ہوتی ہے جیسے کہ سارہ کے دل میں ایک لمحے کے لیے باپ کے کشادہ سینے پر سر رکھنے کی حسرت ابھر آئی تھی اور اسی ایک لمحے کی چاہ نے اسے معذور کردیا تھا۔ عنیقہ بیگ کا افسانہ "لال چادر" ایک سبق آموز افسانہ تھا۔ نگہت عبداللہ ہمیشہ کی طرح "میرے خواب لوٹا دو" میں اپنے قلم کا جادو جگا رہی ہیں۔ شمشیر نے اریبہ کو توصیف احمد سے انتقام لینے کے لیے کڈنیپ کیا ہے۔ دیکھتے ہیں اگلی قسط میں نگہت کیا دھماکہ کرتی ہیں اور اب آتے ہیں۔ اس شمارے کے دل وجان، جان جگر مکمل ناول "دو آنگن میں چاند" مریم ساجد ویل ڈن۔ بہت عرصے بعد مزاح اور شرارتوں سے بھرپور تحریر پڑھنے کو ملی۔ دل خوش کردیا آپ نے بھائیوں میں اتنا پیار اور دوستانہ انداز..... ڈاکٹر، انجینئر، بزنس مین سبزی بنا رہے ہیں۔ جھاڑو پوچھا لگا رہے ہیں۔ سحری بنا رہے ہیں۔ واہ کیا بات ہے آپ کی عمیر اور عزیر کے لیے تو فائزہ اور عائزہ ہی پرفیکٹ تھیں۔ ورنہ تو..... فواد خان کا انٹرویو پڑھا تو دل دکھ سے بھر گیا کہ وہ بھی اس موذی مرض میں مبتلا ہے۔ شوگر جیسا مرض میری بہن کو بھی محض 23 سال کی عمر میں لگا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر کسی کو اس خطرناک مرض سے اپنے حفظ وامان میں رکھیں..... آمین

ج پیاری بینا! خواتین ڈائجسٹ پر آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔
آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

زینب۔۔۔ سیالکوٹ

بہت زبردست ٹائٹل تھا۔ بلو کلر میرا فیورٹ ہے۔ سب سے پہلے عنیزہ سید کو پڑھا۔ کیا کمال لکھتی ہیں اور واہ جی عنیقہ محمد بیگ نے بھی خوب کمال کا لکھا۔ عنیقہ کی تحریروں میں ہمیشہ منفرد رنگ نظر آتے ہیں۔ عنیقہ جی ناولٹ بھی لکھیے۔ باقی افسانے نارمل لگے۔ فرحت اشتیاق نے بہت خوش کردیا۔ کہانی پانی کی طرح بہتی جارہی ہے۔ نگہت عبداللہ کا ناول کچھ متاثر نہیں کررہا۔ پلیز نگہت جی مائنڈ مت کیجیے گا۔ آپ میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ اور میں آپ سے کچھ زیادہ ہی امید کررہی ہوں۔ کنیز نبوی اور رخسانہ نگار کی تحریروں کو بھی جلد از جلد شامل کریں۔

ج پیاری زینب! نگہت عبداللہ کا ناول ہماری قارئین بہت پسند کررہی ہیں، آپ کو متاثر نہیں کرپارہا ہے۔ اس کی وجہ بھی آپ نے خود ہی بتادی کہ آپ نے زیادہ توقعات وابستہ کرلی ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک مصنف جب بہت اچھا لکھتا ہے تو ہم خود بخود یہ طے کرلیتے ہیں کہ وہ آئندہ اس سے بڑھ کر لکھے گا۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

حرارشید خان۔۔۔ کورنگی کراچی

میں سب سے پہلے اپنے پسندیدہ ناول "میرے خواب مجھے لوٹا دو" کی تعریف کروں گی۔ بہت زبردست چل رہا ہے پڑھ کر ہمارا سارا دن مسکراتا ہوا گزرتا ہے۔ فرحت اشتیاق کے ناول کے تو کیا کہنے! ان کے ہر ناول کو اتنی پذیرائی ملتی ہے۔ یہ ان کا حق ہے۔ آخر میں چھوٹی سی ریکویسٹ جیو کی نیوز کاسٹر ثنا مرزا کا انٹرویو شائع کریں۔

ج پیاری حرا! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ، آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

فاطمہ قیصر۔۔۔ ڈسکہ

ٹائٹل بہت پیارا لگا۔ سب سے پہلے جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو پڑھا۔ راحت جبیں کے ناول کا اختتام بہت زبردست لگا۔ نگہت عبداللہ جی "دل پھولوں کی بستی" کے بعد "میرے خواب لوٹا دو" بہت کمال کا لکھ رہی ہیں۔ نگہت جی ناول کے ساتھ ساتھ کوئی افسانہ بھی لکھ دیا کریں۔ آپ کے افسانے بہت کمال کے ہوتے ہیں۔ واہ جی عنیقہ محمد بیگ آپ کا نام دیکھ کر ہی یقین ہوتا ہے نیا پلاٹ ـــــ لے کر آپ آئی ہیں "لال چادر" بہت ہی زبردست افسانہ تھا۔ باقی افسانے سو سو تھے کہانی گھر کی کا پلاٹ پرانا لگا۔

ج پیاری فاطمہ! ٹائٹل کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

انیلا شفیع خواجہ۔۔۔ تحصیل سمندری

یہ ڈائجسٹ میں تب سے پڑھ رہی ہوں جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ پہلے چھپ کر پڑھتے تھے اور اب سرعام پڑھتے ہیں۔
شمارے کے بارے میں میں کیا لکھوں؟ اس کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ بہت ہی کم ہیں فرحت اشتیاق کا مکمل ناول "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" اس کو پڑھ کر بے اختیار دل سے نکلتا ہے واہ بہت اعلا فرحت نے روم کی سیر کروا دی۔
میرا دل کرتا ہے کہ آپ کے ناولوں کے کردار سے ملوں خصوصاً "ام کلثوم سے اور جہاں تک بات اس کی بہن ام مریم کی تو دل کرتا ہے اس کا تو حشر برا کردوں۔
مجھے شمارہ کا سالانہ خریدار بننے کے لیے رقم کیسے بھیجنی ہے اس کا طریقہ بتادیں۔

ج انیلا! آپ سالانہ خریدار بننے کے لیے 600 روپے کی رقم منی آرڈر کریں یا ڈرافٹ بنوا کر بھجوائیں۔ منی آرڈر اس پتے پر روانہ کریں۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37 اردو بازار، کراچی۔

خبریں وغیرہ

تبصید نشاط

قبول ہے

ہمارے ہاں "قبول ہے" کے الفاظ وہ اہم الفاظ ہیں کہ جو کسی بھی شخص کی زندگی کو یکسر تبدیل کردیتے ہیں۔ وینا ملک نے یہ الفاظ کسی کے لیے ادا نہیں کیے ہیں اور نہ ہی کسی نے ان کے لیے اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کیے ہیں۔ ہاں! اپنے عمل سے ضرور ثابت کیا ہے کہ وینا ملک انہیں دل وجان سے قبول ہیں۔

پڑوسی دیار سے خبر آئی ہے کہ وینا ملک کو وہاں کی مذہبی تنظیموں نے کھلے دل سے قبول کرلیا ہے۔ (ہاں بھئی! وینا نے ان کے لیے اور پاکستان کی بدنامی کے لیے دل کھول کر کام جو کیا ہے۔) یہ وہی تنظیمیں ہیں جو ہماری کرکٹ ٹیم کو بلکہ شکیل تیلی تک کو بھی برداشت نہیں کرتیں جو انہیں وہاں ہنسانے گئے تھے' مگر ان کے ناروا سلوک کے باعث خود روتے ہوئے واپس آئے تھے۔ (بھارتی سمجھے ہوں گے، شکیل تیلی انہیں تیلی دکھانے آئے ہیں۔)

بھارت کی ایک مذہبی تنظیم شیو سینا نے وینا ملک کو اپنی ایک مذہبی تقریب میں بطور مہمان خصوصی مدعو کیا۔ (شیو سینا... وینا... دونوں نام ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے وہ وینا کو اپنی کوئی بچھڑی ہوئی بہن سمجھے ہوں گے۔) انہوں نے تقریب میں وینا سے چراغ بھی جلوائے۔ (وہ چراغوں کو پاکستانیوں کے دل سمجھے ہوں شاید!) تقریب میں اعلان ہوا کہ وینا ایک فلم میں رادھا کا کردار ادا کریں گی۔ وینا نے کہا ہے کہ وہ یہ مقدس رول ادا کرکے بہت خوش ہوں گی۔ (ہم بھی بہت خوش ہیں کہ ہمارے ہاں کی ایک قابل اعتراض شخصیت وہاں ایک مقدس دیوی کا کردار ادا کررہی ہے۔ گویا ہماری ایک بدنام زمانہ اداکارہ کو وہاں کی مذہبی جماعتوں نے اپنی مقدس دیوی کے طور پر قبول کرلیا ہے۔)

ایک اور شادی

پرانے زمانے کی بڑی بوڑھیاں بھی کس قدر سادہ مزاج ہوا کرتی تھیں۔ کسی ان بیاہی لڑکی کے بالوں میں ذرا جو چاندی کا پہلا تار چمکا' وہ فوراً" صدمے کا شکار ہوجاتی تھیں کہ "ہئے ہئے! لڑکی کی تو شادی کی عمر ہی نکل گئی۔"

اکثر سیانے اس بات پر متفق ہیں کہ پڑھنے لکھنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ تاہم شادی بیاہ ایک ایسا کام ہے کہ جس میں زیادہ تر سیانے عمر کی حد لگاتے ہیں۔ مگر جناب! دنیا بھر کے اکثر فلمی ستارے (اور ہمارے ہاں کے سیاست دان بھی) اس حد کو نہیں مانتے' سو قبر کے دہانے تک شادیاں کرتے رہتے ہیں۔ (شاید اس لیے

کہ فلمی ستاروں کی اکثریت کو پڑھنے لکھنے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تو بس وہ سیانوں کے آدھے مقولے پر ہی عمل کرتے ہیں۔) یوں ان میں کئی کئی شادیاں کرنے کی وبا عام ہے۔

ہماری فلموں میں کبھی ماضی میں ایک ممتاز اداکارہ کام کرتی تھیں' جو صرف کام کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ نام کی بھی ممتاز ہی تھیں۔ وہی اپنی ممتاز جنہوں نے فلم "محبت زندگی ہے" میں ناہید اختر کے گانے "تت تروت تروت تارہ تارہ" پر جب اداکاری کی تھی تو ان کے ساتھ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے بھی تارے ناچ اٹھے تھے۔

ماضی کی ان ہی اداکارہ ممتاز کی حال ہی میں خبر آئی ہے کہ وہ ایک اور شادی کررہی ہیں۔ ممتاز کی عمر اس وقت ساٹھ سال سے اوپر ہے اور وہ خیر سے جوان بچوں کی ماں بھی ہیں۔ یہ ممتاز کی تیسری شادی ہے۔ (یہ خبر پڑھ کر ہماری وہ اداکارائیں حوصلہ پکڑیں جو ساٹھ سال کی ہونے کو آئی ہیں' مگر ابھی تک ان کی شادی نہیں ہوئی ہے۔)

بے ایمانی

معروف اداکارہ ایمان علی نے شعیب منصور کی ہدایات میں پہلی مرتبہ جب "عشق' محبت' اپنا پن" کا مظاہرہ کیا تو وہ انہیں کچھ ایسی بھائیں کہ وہ ان کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے۔ اپنے پن کے اس مظاہرے کے بعد اگرچہ ایمان علی چپ نہ رہی تھیں' تاہم پھر بھی شعیب نے ان سے کہا کہ "بول!" پھر تو وہ ایسا بولیں کہ ان کے چرچے بھارت تک جا پہنچے اور وہ وہاں کے ڈائریکٹر کو بھی بھا گئیں۔

جی نہیں۔ ایمان وہاں کی کسی فلم میں کام نہیں کر رہیں' بلکہ انہوں نے وہاں کے ڈائریکٹر امتیاز علی کو اپنا اسیر کرکے انہیں اپنی بیگم سے بے ایمانی پر مجبور کردیا ہے۔ اس میں امتیاز علی کا اتنا قصور ہے بھی نہیں کہ ہماری ایمان علی ہیں ہی اتنی پیاری کہ "جب ہی میٹ" ایمان علی سے تو پھر "یہ عشق ہائے بیٹھے بٹھائے" ہو ہی گیا دونوں طرف سے اس بارے میں ابھی خاموشی

اختیار کی گئی ہے۔ مگر وہ جو پرانے زمانے کی مثل مشہور ہے ناکہ "عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے" تو پھر یہ توسائنسی ترقی کا جدید دور ہے کہ اب نگاہوں سے کچھ بھی اوجھل رہنا ناممکن نہیں رہا۔ (اور کیا! اوبامہ امریکا میں بیٹھے بیٹھے ہمارے ایبٹ آباد میں آپریشن کرالیتے ہیں۔) سو دیکھنے والوں نے انہیں دہلی کی مشہور درگارہ نظام الدین پر منت مانتے ہوئے دیکھا اور ساری کہانی سمجھ گئے۔

(ہمارے شعیب ملک اور بھارت کی ثانیہ مرزا کی شادی کو تقریباً" دو سال ہونے کو آئے ہیں مگر لگتا ہے کہ بھارتیوں کے دلوں پر اس وقت لگنے والے چرکوں کے زخم ابھی تک تازہ ہی ہیں کہ ہم ایک بھارتی ناری کیسے لے اڑے' سو اب وہ اس کا بدلہ تو نہیں لینا چاہتے؟! ایمان جی! ذرا دیکھ کے۔)

مہران اسپائس اور فوڈ انڈسٹریز نے حال ہی میں اپنے پہلے مہران وننگ آفر لکی ڈرا کی تقریب مقامی ہوٹل میں منعقد کی۔ اس تقریب کو بہت سی نامور شخصیات نے اٹینڈ کیا' جن میں سینیٹر گل محمد لاٹ (چیئرمین مہران اسپائس اور فوڈ انڈسٹریز) سینیٹر شاہی سید' شہلا رضا (ڈپٹی اسپیکر سندھ اسمبلی) سینیٹر حسیب خان' شرمیلا فاروقی (ایڈوائزر چیف منسٹر) ایس ایم منیر (پیٹرن K.A.T.I اور وائس چیئرمین MCB) میاں زاہد حسین (پریذیڈنٹ کراچی ہول سیل اینڈ گروسرز ایسوسی ایشن) رحیم جانو (پریذیڈنٹ ساؤتھ زون REAP) ابرار (ناہید سپر اسٹور) حاجی مسعود پاریکھ (صائمہ بلڈرز) یحییٰ پولانی (پولانی ٹریولز' پریذیڈنٹ ٹریولنگ ایسوسی ایشن) شکیل ڈھینگو (V.T.F.P.C.C.I) اور محمد شاہد (ڈسٹری بیوٹر) شامل تھے۔

کچھ اِدھر اُدھر سے

بڑھاپے اور زندہ دلی کے حوالے سے مرحوم احمد ندیم قاسمی ایک بہت دلچسپ واقعہ سنایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنی ایک بزرگ عزیزہ جنہیں وہ بی اماں کہا کرتے تھے' سے پوچھا کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے دنوں میں آپ کی عمر کیا ہوگی اس پر وہ مسکرا کر بولیں۔

"ندیم بیٹا! کچھ ٹھیک سے تو یاد نہیں مگر اتنا یاد ہے' تمہارے افسانے بہت شوق سے پڑھا کرتی تھی۔"

(امجد اسلام امجد۔ چشم تماشا)

☆ اسلام کی مخالف حکومتوں میں پہلی پابندی اذان پر لگائی جاتی ہے۔ میں نے روس کی مقبوضہ وسطی ایشیا کی کئی ریاستوں میں مسجدوں کو تو موجود دیکھا مگر غیر آباد۔ وہاں کوئی ایسا نہ مل سکا جسے اذان آتی ہو یا نماز۔ وہاں زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ تو مولود بچے کو ماں گود میں اٹھا کر کسی مسجد میں لے جاتی ہے اور اس کے جسم کو مسجد کی دیوار کے ساتھ لگا کر برکت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

(عبدالقادر حسن۔ غیر سیاسی باتیں)

خواتین اور باورچی خانے کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ باورچی خانے میں رونق ہو تو گھر کے افراد خوش نظر آتے ہیں۔ ایک صاف ستھرا کچن، خاتونِ خانہ کی خوش سلیقگی کا مظہر ہے۔
خواتین ڈائجسٹ میں قارئین کی شرکت کے لیے ہم اس ماہ کے کچن کے حوالے سے ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں، سوالات یہ ہیں۔

1۔ کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ "پسند ناپسند، غذائیت، گھر والوں کی صحت"۔
2۔ گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں، کھانے کا وقت ہے۔ کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کرکے تواضع کر سکیں۔
3۔ کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے، آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟
4۔ صبح کا ناشتہ ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟ ایسی خصوصی چیز کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہیں۔
5۔ گھر سے باہر کھانا کھانا فیشن بنتا جا رہا ہے، آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟ (1) جب کوئی لے جائے (2) کسی کی سالگرہ پر (3) یا کسی خوشی کے موقع پر۔
6۔ کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟
7۔ اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟
8۔ کچن کی کوئی ٹپ، جو دینا چاہیں؟

ان سوالات کے جواب بھجوا کر آپ بھی اس سلسلہ میں شرکت کر سکتی ہیں، ساتھ ایک عدد تصویر بھی بھجوائیں۔

آپ کا باورچی خانہ

تہنیت احمد

اپنی پڑھائی سے فارغ ہونے اور بڑی بہنوں کی شادیاں ہونے کے بعد کچن کی زیادہ تر ذمہ داری میرے اوپر ہے، سو "آپ کا باورچی خانہ" میں میری شرکت لازمی ہے۔ (ہے ناں.....)
تو آتے ہیں آپ کے سوالوں کی طرف۔

1 ہمارے ہاں کھانے میں پسند سے زیادہ غذائیت کا خیال رکھا جاتا ہے، کیونکہ ہمارے امی، ابو نے ہم سب بہن بھائیوں کی عادت ڈالی ہے، جو پک جائے، آرام سے کھا لینا چاہیے۔ رزق میں اعتراض یا نقص نہیں نکالنے۔ اس لیے جو پک جائے، سب آرام سے کھا لیتے ہیں۔

2 ہمارے ہاں جو بھی مہمان آئیں، جو گھر میں پکا ہو وہ سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ اکثر میں، شامی کباب بنا کر فریز کر دیتی ہوں۔ کھانے کے ساتھ فرائی کرکے رکھ دیتی ہوں۔ ہمارے ہاں کھانے سادہ ہوتے ہیں اور اسی سادگی سے پیش بھی کیے جاتے ہیں۔ اچانک آنے والے مہمانوں کے لیے زیادہ تردد نہیں کیا جاتا۔ زیادہ سے زیادہ سویٹ ڈش بنا لیتی ہوں جو فٹافٹ تیار ہو جاتی ہے اور بہت مزے دار ہوتی ہے۔ اس کی ترکیب پیش خدمت ہے۔

سوجی کی فیرنی

اجزا :

سوجی	آدھا پاؤ
دودھ	ڈیڑھ کلو
چینی	ڈیڑھ پاؤ یا حسب ذائقہ
الائچی	چار عدد
خشک میوہ جات	جو آپ ڈالنا چاہیں

ترکیب :

دودھ کو چولہے پر چڑھا دیں۔ جب ابلنے لگے تو چمچ ہلاتے رہیں۔ ابلنے کے بعد پانچ یا دس منٹ دودھ کو گاڑھا ہونے دیں۔ اس میں الائچی بھی شامل کر دیں۔ سوجی کو ٹھنڈے دودھ میں بھگو کر ابلتے دودھ میں ڈالتے جائیں اور چمچ ہلاتے جائیں کہ گٹھلیاں نہ بننے پائیں۔

کچھ دیر سوجی کو پکاتے رہیں۔ چینی بھی شامل کر دیں۔ گاڑھی ہو جائے تو اتار لیں۔ ڈونگے میں نکال کر ٹھنڈا کر لیں۔ جو میوہ ڈالنا ہو، اوپر چھڑک دیں۔ مزے دار فیرنی تیار ہے۔ ٹرائی ضرور کیجئے گا۔

3 کھانا پکانے کے بعد میں کچن صاف کرکے کچن سے نکلتی ہوں اور ہفتہ میں ایک بار تفصیلی صفائی کرتی ہوں۔

4 ناشتے میں زیادہ تر گھی والے پراٹھے کے ساتھ سالن اور چائے ہوتی ہے۔ کبھی کبھی آلو یا بچے ہوئے سالن کے پراٹھے بناتی ہوں۔

5 باہر کھانا کھانے کا پروگرام بہت کم بنتا ہے، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

6 موسم کے حساب سے کھانے کا جو لطف ہے، وہ بغیر موسم کے نہیں آتا۔ بارش میں پکوڑے کھانے کا جو لطف ہے، وہ سخت گرمی میں تو نہیں آتا ناں.....!
ہم بارش میں پکوڑے اور گڑ والے چاول پکاتے ہیں، جو کہ سب ہی شوق سے کھاتے ہیں۔

7 اچھا کھانا پکانے کے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ دھیمی آنچ پر پکایا جائے اور کھانا خوش رنگ ہو۔ میں کھانا پکاتے ہوئے جلد بازی نہیں کرتی۔ پورا وقت دیتی ہوں۔

8 کھانا پکاتے وقت اگر درود شریف پڑھتے رہیں یا اللہ کا ذکر کرتے رہیں تو کھانے میں برکت ہوتی ہے۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

دیگی چرغا

اجزا :

سالم مرغ	ایک عدد
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
پسی سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
سفید مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	آدھا کپ
ثابت دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
چاٹ مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	چار کھانے کے چمچے

ترکیب :

مرغ کو اچھی طرح صاف کرکے دھو کر خشک کرلیں۔ ایک پیالے میں لیموں کا رس ڈال کر چاٹ مسالے کے علاوہ تیل سمیت تمام اجزا (زیرہ اور ثابت دھنیا کوٹ کر) شامل کرلیں اور اسے مرغ پر اچھی طرح لگا کر تقریباً" تین گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ تیز چھری سے مرغ پر کٹ لگالیں تاکہ مسالا اندر تک جذب ہوجائے۔ گہرے پیندے کی پتیلی میں مسالا لگا ہوا مرغ رکھ کر ہلکی آنچ پر چالیس منٹ تک پکائیں۔ نکال کر بڑی ڈش میں رکھیں اور اوپر سے چاٹ مسالا چھڑک دیں۔ ابلے ہوئے انڈوں کے سلائس کاٹ کر اور فرنچ فرائز کے ساتھ اس کی سجاوٹ کریں۔ چپاتی یا نان اور رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

خیبر بالٹی گوشت

اجزا :

گوشت	ایک کلو
پیاز	چھ عدد
لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
دہی	ایک کپ
یخنی	ایک کپ
کڑاہی گوشت مسالا	چار کھانے کے چمچے
پسا گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
دار چینی	ایک بڑا ٹکڑا
چھوٹی الائچی	چار عدد
لونگ	چار عدد
ہرا دھنیا	تھوڑا سا
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

گوشت کو نمک اور ایک کھانے کا چمچہ لہسن پیسٹ کے ساتھ ابال لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کرکے الائچی، لونگ، دار چینی ڈال کر کڑکڑائیں، پیاز باریک کاٹ کر شامل کریں۔ جب براؤن ہوجائے تو لہسن اور ادرک پیسٹ ڈال کر بھونیں۔ ساتھ ہی گوشت بھی ڈال دیں۔ کڑاہی گوشت مسالا اور یخنی ڈال کر تیز آنچ پر بھون کر آنچ ہلکی کردیں اور دس منٹ تک پکنے دیں پھر دہی ڈال کر بھونیں۔ رنگ تبدیل ہوجائے اور گوشت تیل چھوڑ دے تو گرم مسالا اور کترا ہوا دھنیا چھڑک کر پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔

انڈین بنگمشوار

اجزا :

تازہ ناریل	ایک عدد
کھویا	ڈیڑھ پاؤ
سوجی	دو کھانے کے چمچے
میدہ	چھ کھانے کے چمچے
دیسی گھی	چار کھانے کے چمچے
دودھ	ایک کپ
چینی	تین پاؤ
چھوٹی الائچی	چار عدد

ترکیب :

آدھی چینی میں ایک کپ پانی ملا کر پکائیں اور تین تار کا شیرہ بنالیں۔ ایک کڑاہی میں گھی گرم کرکے سوجی کو سنہرا کرلیں۔ پھر کش کیا ہوا ناریل اور بقیہ چینی ڈال کر مکس کریں۔ پانچ منٹ بعد کھویا ڈال دیں۔ مسلسل چمچہ چلاتے رہیں۔ جب گھی اوپر آجائے تو الائچی پیس کر ڈال دیں اور اتار کر اتنا ٹھنڈا کرلیں کہ انڈے کی شکل میں بالز بنا سکیں۔ ہاتھ گیلا کرکے بالز کو قدرے چپٹا کرلیں۔

میدے کو دودھ میں مکس کرکے گاڑھا سا آمیزہ بنالیں۔ بالز کو اس آمیزے میں ڈبو کر گرم گھی میں تل کر سنہرا کرلیں، پھر شیرے میں پانچ منٹ تک ڈبو کر نکال لیں۔ ٹھنڈا ہوجائے تو پیش کریں۔

پانچ باغ

سیلا چاول	ایک کلو
چینی	تین پاؤ
لونگ	آٹھ عدد
چھوٹی الائچی	آٹھ عدد
بادام پستے	آدھا کپ
اشرفی	آدھا کپ
چھوٹے گلاب جامن	سو گرام
چھوٹی چم چم	سو گرام
قلاقند	سو گرام
عرق گلاب	دو کھانے کے چمچے
فوڈ کلرز	ایک ایک چٹکی
گھی	دو کپ

چاول کو تھوڑی سی لونگ اور الائچی ڈال کر ابال لیں۔ الگ دیگچی میں باقی چھوٹی الائچی اور لونگ کڑکڑانے کے بعد چینی ڈال دیں۔ چینی گھلنے لگے تو اس میں ابلے ہوئے چاول ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ اب بادام، پستے، اشرفیاں اور عرق گلاب ڈال کر ہلکے ہاتھ سے مکس کریں اور دم پر لگادیں۔

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

''ایک انسان وہی کچھ ہے جو وہ تمام دن سوچتا ہے۔''
ایک فلسفی کا قول ہے۔
''ہماری زندگی ہمارے خیالات سے بنتی ہے۔''
اگر ہم خوشی اور مسرت کے خیالات ذہن میں لائیں گے تو ہم خوش اور مسرور ہوں گے۔ اگر ہمارے خیالات افسردہ اور پژمردہ ہیں تو ہم پر بھی افسردگی اور پژمردگی طاری ہوجائے گی۔ بزدلانہ خیالات ہمیں بزدل اور کمزور بنا دیں گے۔ اگر ہم ناکامی کے متعلق سوچیں گے تو ناکام رہیں گے۔ اگر ہم اپنے آپ پر ترس کھاتے رہیں گے تو لوگ ہم سے گریز کریں گے' دور بھاگیں گے۔
کسی کا قول ہے کہ
''آپ وہ نہیں جو آپ سمجھتے ہیں' بلکہ وہ ہیں جو آپ سوچتے ہیں۔''
ہمیں اپنے مسائل پر دھیان تو ضرور دینا چاہیے' لیکن پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ پریشانی اور دھیان میں فرق ہے۔
غلط خیالات کا اثر ہمارے چہرے پر پڑتا ہے۔
یہ بات آپ کے مشاہدے میں بھی آئی ہوگی کہ ایسی عورتیں جو دوسروں سے حسد اور نفرت کرتی ہیں' ان کے چہروں پر نفرت کی وجہ سے جھریاں پڑ گئی ہیں اور چہروں پر نرمی کے بجائے سختی آگئی ہے۔ ان کے چہروں پر نفرت کی سیاہی ہوتی ہے۔ غصے نے ان کی صورتیں بگاڑ دی ہیں اور کوئی علاج' کوئی کریم' کوئی میک اپ ان جھریوں اور سختی کو پورے طور پر نہیں چھپا سکتا۔ لیکن درگزر کرنے والے نرمی اور محبت سے پیش آنے والے' نیکی کی راہ پر چلنے والے لوگوں کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ ان کے چہرے مطمئن اور ملائم رہتے ہیں' ان کے چہرے روشن ہوتے ہیں۔ دوسروں سے نفرت کرنے والوں کی نیند میں کمی آجاتی ہے۔ یا سرے سے نیند غائب ہوجاتی ہے۔ بھوک کم ہوجاتی ہے۔ خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ یہ ہماری خوشی اور صحت پر حملہ آور ہونے لگتی ہے۔
اگر ہمارے دشمنوں کو صرف اتنا معلوم ہوجائے کہ ہم ان کی وجہ سے کس قدر پریشان ہیں اور ہمارے احساسات کس قدر مجروح ہو رہے ہیں اور ہماری برہمی کا سبب بن رہے ہیں تو ان کی خوشی دیکھنے والی ہوگی۔
کسی کا قول ہے
''جب تم بدلہ اور انتقام لینے کے درپے ہوتے ہو تو کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کے بجائے خود کو زیادہ نقصان پہنچاتے ہو۔''

ز' گل۔ گجرات

منگنی میری پسند سے ہوئی ہے اپنی ذات میں لیکن والدین میری اس منگنی سے مطمئن نہیں' میری منگنی جس لڑکے سے ہوئی ہے' وہ میری امی کا پھوپھی زاد...... ہے اور میرے باپ کا خالہ زاد۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میری زندگی شادی کے بعد کامیاب رہے گی' میرے سسرال والے خوش حال ہیں۔ لڑکا بھی اچھے پیسے کما لیتا ہے۔ میرے سسرال کا کنبہ چودہ افراد پر مشتمل ہے' میرے ابا جان کو مجھ سے بڑا پیار ہے اس لیے وہ میری کوئی بات نہیں ٹالتے بلکہ انہوں نے تو یہ بھی کہہ دیا ہے کہ تم اپنی مرضی سے شادی کرلو۔ امی اس لیے خوش نہیں کہ افراد بہت ہیں اور وہ اپنے خالہ زاد بیٹے سے کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن مجھے اپنی ماں کے خالہ زاد بیٹے پسند نہیں' اب مجھے آپ مشورہ دیں کہ مجھے اپنی سسرال میں کیسا رہنا چاہیے اور کس طرح پیش آنا چاہیے۔ سسرال میں میری سات نندیں اور چار دیور ہیں کیا میری ساس کا سلوک مجھ سے اچھا رہے گا۔ میرے ارادے یہ ہیں کہ میں اچھی بہو بن کر دکھاؤں اور سب مجھ سے اچھا سلوک کریں۔ آپ صرف یہ بتا دیں کہ میرا مستقبل اچھا رہے گا اور پریشانیاں تو نہیں اٹھانی پڑیں گی اور شادی ہوجائے گی کہ نہیں' میری عمر سترہ سال ہے اور لڑکے کی عمر اٹھارہ یا انیس سال ہے۔

ج : بہن زلیخا! مستقبل کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ شادی کی کامیابی کے لیے سب سے ضروری بات دو فریقوں کا مخلص ہونا ہے۔ اگر آپ کا رویہ اپنی سسرال والوں سے اچھا رہا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ آپ سے پیار نہ کریں۔ میرے علم میں ایسے بہت سے گھرانے ہیں جہاں نندیں اور دیور خاصی تعداد میں ہیں۔ لیکن لڑکی خوش و خرم رہ رہی ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ افراد زیادہ ہیں۔ اگر لڑکا شریف ہے۔ برسر روزگار ہے۔ صحت مند ہے تو میرے خیال میں شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

ن حسین...... راولپنڈی

اچھی بہن! اپنی تکلیف کی وجہ آپ نے خود لکھ دی ہے۔ مسلسل ذہنی دباؤ کی وجہ سے آپ کی یہ کیفیت ہوئی۔ اب پانچ سال سے آپ ڈاکٹروں کی دوائیں استعمال کر رہی ہیں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا' الٹا دواؤں کے اثرات کی وجہ سے آپ کو مزید تکلیفیں پیدا ہوگئی ہیں۔
اپنی والدہ کی امیدوں پر پورا اترنے کی کوشش نے آپ کے ذہن پر اس قدر دباؤ ڈالا کہ آپ نے خیالی دنیا میں پناہ لے لی۔ اس دوران آپ نے پڑھائی بھی چھوڑ دی۔ اس کی وجہ سے آپ صرف گھر تک ہی محدود ہو گئیں۔
سب سے پہلے تو آپ اپنے ذہن سے یہ نکال دیں کہ آپ بیمار ہیں یا یہ کوئی بیماری ہے۔ یہ آپ کی حد سے بڑھی ہوئی حساسیت ہے کہ آپ کے ذہن پر کوئی بات اس حد تک سوار ہوجاتی ہے کہ وہ ذہن سے نکلتی ہی نہیں۔
دوسری ضروری بات یہ ہے کہ آپ کوئی مشغلہ ضرور اپنائیں۔ اگر سلائی کڑھائی سے دلچسپی ہے تو وہ سیکھنا شروع کردیں۔ پڑھائی کا شوق ہے تو دوبارہ پڑھائی شروع کی جاسکتی ہے۔ گھر سے اجازت نہ ملنے کی صورت میں آپ پرائیویٹ امتحان دے سکتی ہیں۔ کوئی بھی مشغلہ اپنائیں گی تو آپ کا ذہن اس طرف مرکوز رہے گا۔
تیسری اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ دن میں کم از کم بارہ گلاس پانی پئیں۔ اور قبض نہ ہونے دیں۔ فجر کی نماز پابندی سے پڑھیں۔ فجر کی نماز کے بعد کھلی ہوا میں گہرا سانس لیں۔ تھوڑی دیر روکیں پھر سانس باہر نکال دیں۔ تازہ ہوا آپ کے ذہن پر خوش گوار اثرات مرتب کرے گی۔ آدھے گھنٹہ روزانہ یہ عمل کریں صرف چند دنوں میں نمایاں فرق محسوس کریں گی۔

امت الصبور

بیوٹی بکس

رضوانہ ناز..... سیالکوٹ

س : باجی میرے چہرے پر پچھلے چار سال سے بہت دانے تھے جن کا میں نے بہت علاج کروایا لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں نے فروری 2002ء کے شمارے میں آپ کا پھٹکری والا نسخہ پڑھا۔

تو میں نے سوچا کہ جہاں اتنا کچھ آزمایا ہے وہاں یہ آزمانے میں کیا حرج ہے اور باجی یقین کریں کہ چار سال پرانے دانے صرف چار دن میں ختم ہوگئے ہیں۔ جن کے لیے میں آپ کی بے پناہ احسان مند ہوں۔

دانوں کی وجہ سے میرے چہرے کے مسام کھل گئے ہیں۔ ان کا کوئی حل بتائیں۔

باجی میرا وزن میری عمر کے حساب سے دس کلو زیادہ ہے۔ میں نے ــــ دودھ اور کیلے والا نسخہ استعمال کیا تھا لیکن باجی ایک ہفتہ یا دس دن تک یہ عمل کرنے کے بعد جب ہم پھر سے اپنی معمول کی خوراک کھانے لگیں تو کیا وزن پھر سے بڑھ نہیں جائے گا؟

ج : رضوانہ بہن! چہرے کے مسام بند کرنے اور جلد کی خشکی دور کرنے کے لیے آپ لیموں کے رس میں شہد ملا کر لگائیں۔ شہد بہترین موئسچرائزر ہے۔

دن میں دو دفعہ چہرے پر برف کا مساج کریں۔ اگر ممکن ہو تو روزانہ ایک گلاس کینو کا جوس پئیں۔

وزن کم کرنے کے لیے آپ ایک گلاس نیم گرم پانی میں دو چمچے شہد ملا کر نہار منہ پئیں۔ ایک ماہ میں نمایاں فرق محسوس کریں گی۔

کیلے دودھ کے نسخے پر عمل کرنے کے بعد آپ اگر کھانے پینے میں احتیاط رکھیں تو وزن نہیں بڑھے گا۔

عائشہ جاوید..... ساہیوال

س : میرے چہرے پر کہیں کہیں سیاہ دھبے سے نمودار ہو رہے ہیں۔ چہرے کا رنگ صاف ہے لیکن چہرے کی جلد مرجھائی ہوئی ہے۔ منہ دھونے کے بعد بھی چہرہ میلا میلا لگتا ہے۔ جبکہ میں دن میں تین بار صابن سے منہ دھوتی ہوں۔ اچھا صابن استعمال کرتی ہوں۔ میں سبزیاں پھل بھی کھاتی ہوں۔ کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ میری جلد شفاف چمکدار نظر آئے۔

ج : بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ متوازن غذا کے باوجود کوئی وٹامن جزوبدن نہیں ہوپاتا۔ اس کی کمی کی وجہ سے چہرے اور جسم میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ وٹامن سی کی کمی کی وجہ سے چہرے پر چھائیاں نمودار ہو جاتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وٹامن سی آپ کا جزوبدن نہیں بن پا رہی ہے۔ اب کینو کا موسم آرہا ہے۔ ممکن ہو تو روزانہ کینو کھائیں۔ ایک گلاس پانی میں ایک لیموں کا رس اور ایک چمچہ شہد ملا کر پینے سے بھی چھائیاں دور ہو جاتی ہیں۔ چہرے کی جلد صاف شفاف رکھنے اور چھائیاں دور کرنے میں "جوہر ہاضم" بھی بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ ایک چمچہ روزانہ استعمال کرنے سے غذا اچھی طرح ہضم ہو کر جزوبدن ہو جاتی ہے۔

درج ذیل نسخہ استعمال کرنے سے بھی چھائیاں دور ہو جاتی ہیں۔

ایک چمچہ ناریل کا تیل
ایک چمچہ بادام کا تیل
ایک لکویڈ وٹامن E کا کیپسول

ان سب کو ملائیں اور پھر اس مکسچر سے اپنے چہرے کی چھائیوں پر رات کو سونے سے پہلے مساج کریں۔ پھر چہرے کو صاف کپڑے یا ٹشو پیپر سے صاف کرلیں اور صبح کسی اچھے صابن سے منہ دھولیں۔ ایک ماہ تک یہ عمل کرنے سے نہ صرف چھائیاں ختم ہو جائیں گی۔ بلکہ آپ کا چہرہ بھی دمکنے لگے گا۔

وٹامن E کا کیپسول دستیاب نہ ہو تو ایک چمچہ بیسن میں ایک چمچہ دودھ اور ایک چمچہ شہد ملا کر پیسٹ بنالیں اور چہرے پر ہلکا سا لیپ کریں۔ ایک گھنٹے بعد چہرہ دھولیں۔ دو ماہ کے اس عمل سے چہرہ شفاف ہو جائے گا۔ داغ دھبے اور چھائیوں کے نشان دور ہو جائیں گے۔

☆